

WWW.PAKSOCIETY.COM
۶۸ برس بعد قومی زبان کی رہائی کا پہلا قدم مبارک ہو!
اُردو ڈائجسٹ
اگست 2015ء
آزادی نمبر
www.urdudigest.pk
چودھری احمد سعید
بالغ نظر اور صاف گو
انٹرویو
جن کے آباو اجداد نے پاکستان کی بدولت عروج پایا
اور انھوں نے وطن کی تعمیر میں قابل قدر حصہ لیا
WWW.PAKSOCIETY.COM
معصوم بچوں کے خطوط
۱۱۹
فیصل آباد کی پہلی خاتون عالم
۷۵
۵ پاکستانی ہیرو
ملک کا نام روشن کرنے والے ستارے
۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

نفس ٹھیک بنایا

اور نفس کو ٹھیک بنایا0 پھر اس کو برے کاموں اور پرہیزگاری کی سمجھ دی0 تحقیق جس نے اس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا0 اور جس نے اس کو خاک میں ملا دیا وہ نامراد ہوا0

(شمس ۹۱، آیت ۷-۱۰)

بلکہ انسان خود ہی اپنے حال پر پوری نگاہ رکھتا ہے اگرچہ کتنے ہی اپنی طرف سے بہانے کرے0 (یعنی وہ جانتا ہے کہ اچھے کام کر رہا ہے یا برے کام کر رہا ہوں)

(قیامہ ۷۵، آیت ۱۴-۱۵)

رسول ﷺ کا فرمان

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ سے مشرکین کی نابالغ اولاد کے بارے میں دریافت کیا گیا (کہ وہ جنت میں جائے گی یا دوزخ میں؟) تو آپؐ نے فرمایا! ''اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ بڑے ہو کر وہ کیا عمل کرنے والے تھے۔''

(بخاری کتاب ۲۳۔ باب ۹۳: مسلم کتاب القدر۔ باب ۶)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ سے مشرکین کی اولاد (جو نابالغ مر جائے) کے بارے میں دریافت کیا گیا (کہ وہ جنت میں جائے گی یا دوزخ میں؟) تو آپؐ نے فرمایا کہ ''انھیں چونکہ پیدا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس لیے وہی بہتر جانتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر کیا کرنے والی تھی۔''

(بخاری کتاب ۲۳۔ باب ۹۳: مسلم کتاب القدر۔ باب ۶)

اردو ڈائجسٹ

اگست 2015ء
شوال المکرم 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 8

urdudigest.com www.urdudigest.pk

مسند مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹرز: قاسم ...
سب ایڈیٹرز: محمد ... غلام سجاد
مجلس تحریر: حافظ افروز ... نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمپیوٹیکیشن: ... کامران قریشی
پروف خواں: خالد ... الرحمٰن
ڈیزائنر و کمپوزر: عبدالرحمٰن ...

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdu-digest.com
خریداری کے لیے رابطہ فون 92 42 37589957
21/19 ایکڑ سکیم، سمن آباد، لاہور
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
بیرون ملک 160 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-II جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ♦ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے

... الطاف حسن قریشی ... اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24 ... سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ



اردو......قومی شناخت

ایک ملک کا باسی جب بیرون ملک جائے، تو وہ پردیس میں دو طریقوں سے قومی تہذیب و ثقافت اور روایت کا سفیر بنتا ہے: اوّل لباس، دوم زبان۔ ان میں زبان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انسان اسی کے ذریعے دوسروں سے تال میل کرتا اور اپنا تشخص بناتا ہے۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے، مگر افسوس پچھلے ۶۸ برس میں ہماری سرکار اسے نہ اپنا سکی۔ چناں چہ کم و بیش تمام سرکاری اداروں میں غلامی کی نشانی...... انگریزی زبان رائج ہے۔ حالانکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں درج ہے، اگلے پندرہ برس میں اردو سرکاری زبان بن جائے گی۔ مگر انگریز آقاؤں کی پروردہ بیوروکریسی اردو کو اس کا جائز مقام دینے سے لیت و لعل سے کام لیتی رہی۔

حال ہی میں سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے اوائل جولائی ۲۰۱۵ء میں حکومت وقت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ جج صاحبان کی سعی رنگ لائی اور ۱۰ جولائی کو وزیراعظم پاکستان نے اردو کو بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کے لیے ایک منصوبہ منظور کر لیا۔ منصوبے کے مطابق درج ذیل ابتدائی اقدامات کیے جائیں گے:

☆ صدر اور وزیراعظم اندرون و بیرون ملک اردو میں تقاریر کریں گے۔

☆ اگلے تین ماہ میں تمام سرکاری محکمہ جات اپنی پالیسیوں کا اردو ترجمہ شائع کریں گے۔

☆ تمام سرکاری محکمہ جات کی ویب سائٹس بھی بتدریج اردو میں منتقل ہو جائیں گی۔

یہ خوشی و مسرت کی بات ہے کہ کارپردازانِ حکومت کو آخر قومی زبان کی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ امید ہے آنے والے دنوں میں ایک بدیسی زبان کو دیس نکالا مل جائے گا تاکہ اردو سرکاری ایوانوں میں اپنا حقیقی مقام پا سکے اور داغ کا یہ مصرع صائب ثابت ہو:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، بڑھ جائیے، بیچیے اور لطف اٹھائیے

اس شمارے میں

خصوصی انٹرویو

15



الطاف حسن قریشی، [illegible] قریشی

پاکستان کے دم قدم سے ہی ہمیں عزت اور احترام ملا

وطن کی محبت میں سرشار سروس انڈسٹریز کے

چودھری احمد سعید

حکمرانوں کے رازدار

انتہائی بالغ نظر اور صاف گو صنعتکار

کا دل چھو لینے والا انکشافات سے پُر انٹرویو

جن کے آباؤ اجداد نے پاکستان کی بدولت بڑا عروج پایا

اور انھوں نے وطن کی تعمیر میں قابلِ قدر حصہ لیا

کچھ اپنی زبان میں

اسلامیات

سچا واقعہ

روشن پاکستان





جرم و سزا

معاشرتی کہانی

تازہ افسانہ





آزادی نمبر



میں ناکام نہیں لوٹوں گا

حکیم محمد سعید دہلوی کی ایمان افروز جگ بیتی

ستار طاہر | 126



پاک فوج نے جب پاکستان کی لاج رکھی

سکندر خان بلوچ | 113



موت کا قافلہ

اداس نسلیں کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا ایک باب

عبداللہ حسین | 166



پانچ پاکستانی ہیرو

باصلاحیت پاکستانیوں کی سرگزشت

سید عاصم محمود | 69


پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
پروفیسر حافظ محمد سعید امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان کا
پیغام
0322
4442905
جماعۃ الدعوۃ لاہور
www.markazalqadsia.com

عدالتِ عظمیٰ نے ماضی میں نظریۂ ضرورت کے تحت بعض ایسے فیصلے دیے جنہوں نے ہماری آئینی اور جمہوری ارتقا پر منفی اثرات مرتب کیے اور ہم بار بار بحرانوں سے دوچار ہوتے رہے۔ مگر مقامِ شکر ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں میں چند ایسے عدالتی فیصلے سامنے آئے جو ہمیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آگے بڑھنے میں بے پایاں قوت اور عزیمت فراہم کر سکتے ہیں۔ پہلے فیصلے کا تعلق اردو کو آئینی طور پر قومی زبان کا درجہ دینے، دفتروں میں رائج کرنے، ذریعۂ تعلیم بنانے اور عالمی معیار کے مطابق ایک علمی اور سائنسی زبان میں ڈھالنے سے ہے۔ فاضل عدالت کے احترام اور اس کی تعمیل میں جناب وزیراعظم نے بعض فوری اقدامات کا اعلان کیا ہے جس کا عظیم اکثریت نے خیر مقدم کیا ہے، مگر ہمارے نزدیک وہ اقدامات ناکافی ہیں۔ کابینہ کو فی الفور اس امر پر غور و فکر کرنا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان کا مکمل احیا کس طرح ہو سکتا ہے اور اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں امیدواروں کو اردو زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی جلد سے جلد اجازت کس طرح دی جا سکتی ہے۔ ہمیں علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی پر بھی پوری توجہ دینا ہو گی اور انگریزی زبان سے فوائد حاصل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھنا ہو گا، مگر تخلیقی عمل کے فروغ اور جرأت مندانہ اظہار کے لیے اردو زبان کو بنیادی اہمیت دینا ہو گی۔

دوسرا فیصلہ عدالتِ عظمیٰ کے سہ رکنی عدالتی کمیشن کی طرف سے صادر ہوا ہے جس میں ۲۰۱۳ء کے انتخابات کو آئین اور قانون کے مطابق درست قرار دیا ہے جبکہ عمران خاں کی طرف سے منظم دھاندلی کے الزامات مسترد کر دیے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ انتخابات کی صحت کے بارے میں عدالتِ عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان نے بہت سارے پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے پاکستان الیکشن کمیشن کی انتہائی غیر معیاری کارکردگی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس بحث نے انتخابات سے متعلق سب سے اہم ادارے کی تشکیلِ نو اور انتخابی نظام کے اندر بنیادی اصلاحات کی ضرورت کا قوم کو شدت سے احساس دلایا ہے۔ ہم سالہا سال سے لکھتے آئے ہیں کہ عدالتِ عظمیٰ کے ریٹائرڈ اور انتظامی امور سے قطعی طور پر نابلد جج صاحبان اتنی بھاری ذمے داری اٹھانے کی استعداد نہیں رکھتے، اس لیے بھارت میں ہونے والے تجربات کی روشنی میں پاکستان کا الیکشن کمیشن اعلیٰ صلاحیتوں کے منتظمین پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ متناسب نمائندگی کے ایک موزوں ماڈل کی تیاری بھی از بس ضروری ہے۔ موجودہ نظامِ انتخابات میں حکومتیں اقلیتی ووٹوں سے وجود میں آتی ہیں اور الیکٹیبلز کے جال میں پھنسی رہتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے اربابِ فکر و دانش یومِ آزادی پر ان اہم عدالتی فیصلوں کی عملی تعبیر کا عہد کریں گے اور فضول اور لایعنی میں اضافہ کرنے والی تو تکرار سے مکمل اجتناب فرمائیں گے۔

الطاف حسن قریشی

خصوصی انٹرویو

سروس انڈسٹریز کے

جن کے آباؤ اجداد نے پاکستان کی بدولت بڑا عروج پایا اور انھوں نے وطن کی تعمیر میں قابل قدر حصہ لیا



انٹرویو پینل: الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی

۲۱/جولائی

صبح سویرے اٹھا تو ہوا میں شباب کی تازگی تھی۔ جنگلوں میں ساون کی آمد کا شور و مستی تھی۔ یہ سے
وجود پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ ساڑھے نو بجے برادرم طیب اعجاز آ گئے۔ بارہ بجے سروس انڈسٹری سے تعلق
رکھنے والے ایک نیک نام صنعت کار جناب چودھری احمد سعید سے انٹرویو طے تھا۔ جو بازاروں سے نکل کر ہم
نے ایک صوفی کا رخ کیا جہاں شفیق عباسی کی رہائش ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک صنعت کار ہیں اور انھوں نے کمال ذہانت و خوش
وضع داری سے بڑے بڑے صحافیوں، سرکاری افسروں اور احباب کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا ہے۔ ہم جونہی ایوان صنعت و تجارت سروس
انڈسٹری کے دفتر پہنچے تو چپڑاسی نے آ کر کہا کہ چودھری صاحب آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان مجھے لینے کے لیے آ گیا اور وہ مجھے لے کر چودھری صاحب کے کمرے تک
لے آیا۔ میں کسی قدر تشویش کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور السلام علیکم کہا تو چودھری صاحب کرسی سے اٹھے اور اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے
بچھڑے ہوئے دوست برسوں بعد ملے ہوں۔ پوچھنے لگے آپ کو یاد ہے کہ ہماری ملاقاتیں کہاں ہوتی رہی ہیں۔ میں جواب دینے
ہی لگا تھا کہ انھوں نے بتانا شروع کیا:

"ہماری ملاقاتیں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اقامت گاہ پر ہوتی رہی ہیں۔ وہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک درس قرآن دیتے رہے۔ میں
اور آپ اس میں شرکت کے لیے آتے اور بعد از عصر ملکی حالات پر گفتگو کرتے تھے۔ میں ان دنوں شاہ جمال رہائش پذیر تھا۔ میں جب
بیرونِ ملک سے واپس آیا تو ہماری کمپنی کے جنرل منیجر شفیق الاسلام فاروقی صاحب نے مجھے مذہب کی طرف راغب کیا تو میں
باقاعدگی سے اچھرہ جانے لگا۔ جماعت اسلامی کے ساتھ میرا تعلق اس قدر بڑھا کہ مولانا کوثر نیازی نے ۱۹۶۹ء میں میرا نکاح پڑھایا
اور جب تفہیم القرآن کی تکمیل ہوئی تو تقریب فلیٹیز ہوٹل میں منعقد ہوئی اور ایک بہت اونچی اسٹیج ترتیب دی گئی تو مولانا مودودی کے
ساتھ بیٹھنے والوں میں جناب اے کے بروہی اور زاہد ایوب کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ ویسے بھی میرے بزرگوں کی جماعت اسلامی
کے ساتھ بہت قربت رہی ہے۔"

اتنے میں جناب شفیق عباسی اور طیب اعجاز بھی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ میں ان سے یہ سوال کرنے ہی والا تھا کہ آپ جماعت



میں نے جنرل مشرف اور چودھری پرویز الٰہی کا رابطہ کرایا

اسلامی سے اپنے شعور کا سفر آغاز کرنے والے پیپلز پارٹی اور جنرل مشرف کی آغوش میں کیسے چلے گئے؟ تو انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

میں ایف سی کالج (لاہور) سے پڑھا ہوں۔ کالج کی تعلیم مکمل ہوئی، تو باہر چلا گیا۔ واپس آیا، تو درس سننے باقاعدگی سے اچھرہ جانے لگا۔ اس وقت مولانا کوثر نیازی جماعت اسلامی کے اہم رکن تھے۔

''اس کے بعد میری زندگی اونچ نیچ کا شکار ہوتی رہی۔ کبھی سیاست میں داخل ہوا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اپنی کمپنی ہی میں رہا۔ بعدازاں حکومت وقت نے مختلف سرکاری اداروں کا سربراہ بنایا۔ ۱۹۹۰ء میں ڈیڑھ سال کے لیے زرعی ترقیاتی بینک کا چیئرمین بھی رہا۔ یہ بینظیر بھٹو کا دور تھا۔ پھر ۲۰۰۱ تا ۲۰۰۵ء پی آئی اے کا چیئرمین رہا۔ جنرل پرویز مشرف نے مجھے اس عہدے پر تعینات کیا تھا۔ انہونی بات یہ تھی کہ تب نیب نے میرے چھوٹے بھائی چودھری احمد مختار کو پکڑ رکھا تھا۔ جنرل مشرف ایف سی کالج میں میرے ساتھ زیرتعلیم رہے تھے۔ مجھ سے ایک سال جونیئر تھے اس لیے زیادہ واقفیت نہیں ہو سکی۔ سابق بیوروکریٹ اور جنرل مشرف کے دست راست طارق عزیز میرے ہم جماعت تھے۔ دراصل یہ بریگیڈیئر نیاز احمد ہیں جنھوں نے جنرل مشرف سے میری ملاقات کرائی۔ یہ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔

ہمارے ذہن میں بریگیڈیئر نیاز احمد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ اس اظہار پر چودھری احمد سعید نے تفصیل سے بتایا: ''وہ بہت محترم شخصیت تھے۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لا حکومت کے خلاف عوامی احتجاج شروع ہوا جس کے دوران ہنگاموں میں انارکلی میں ایک شخص مارا گیا۔ تب مال روڈ پر بہت بڑا احتجاجی جلوس نکلا۔ حکومت کی طرف سے گولی چلانے کے احکامات آ گئے۔ اس علاقے میں موجود فوج کے انچارج بریگیڈیئر نیاز احمد تھے۔ انھوں نے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا اور بعدازاں استعفا دے کر گھر چلے آئے۔ ان کا کہنا تھا، میں دشمن سے لڑنے کے لیے فوج میں شامل ہوا تھا۔ اپنے لوگوں پر گولی کیسے چلا سکتا ہوں۔

''ان کا تعلق چکوال کے غریب گھرانے سے تھا۔ بہت ذہین اور قابل آدمی تھے۔ استعفا دینے کے بعد انھیں کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصے بعد فوج کی طرف سے ایک ٹھیکہ ملا تو مالی حالات بہتر ہوئے۔ بریگیڈیئر نیاز اور جنرل مشرف کی دوستی برج کے کھیل کی وجہ سے ہوئی۔ تب جنرل صاحب منگلا کے کور کمانڈر تھے۔ نیاز احمد برج کھیلنے کے ماہر تھے۔ میں بھی یہ کھیل کھیلنے ان کے گھر جاتا تھا۔ جب جنرل مشرف کو اس بات کا علم ہوا، تو وہ بھی برج کھیلنے بریگیڈیئر نیاز کے گھر آنے لگے۔ یہ ملاقاتیں جلد ہی گہری دوستی میں بدل گئیں۔ بریگیڈیئر نیاز احمد نے جنرل مشرف اور نواز شریف کے مابین مذاکرات کرانے میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ وہ پچھلے سال اگست ۲۰۱۴ء میں فوت ہوئے۔''

ہم پر تاریخ کا ایک بہت بڑا راز منکشف ہوا تو ہم نے مزید گہرائی میں جاتے ہوئے پوچھا:

''سابق وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی بھی تو ایف سی کالج میں زیرتعلیم رہے ہیں۔''

انھوں نے جواب دینے کے بعد ایک اور سربستہ راز کا انکشاف کیا:

''جی ہاں، مگر وہ ہمارے بعد آئے۔ ان کے جنرل مشرف یا طارق عزیز سے تعلقات نہیں تھے۔ میں نے چودھری پرویز الٰہی کا ان

شخصیات سے رابطہ کرایا۔ میں گجرات ۱۹۷۲ء میں گیا تھا پھر وہاں مسلسل بیس سال مقیم رہا اور اپنی فیکٹریاں چلاتا رہا چناں چہ چودھری خاندان سے تعلق رکھنے والے فضل الٰہی ظہور الٰہی پرویز الٰہی اور شجاعت حسین سے دعا سلام رہتی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے صدر مملکت چودھری فضل الٰہی کے کہنے پر مجھے بلایا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ۱۹۷۷ء میں پی پی پی کی طرف سے پنجاب میں صوبائی انتخابات میں حصہ لوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ میں صنعت کار ہوں جبکہ آپ کی جماعت میں خوش لباس لیڈر اکثریت رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مجھے قبول نہیں کریں گے۔

''بہرحال میں پی پی پی کی طرف سے صوبائی انتخاب لڑنے پر رضامند ہو گیا۔ اپنے حلقے سے جیت کر اسمبلی میں پہنچا۔ میں نے ہی صادق حسین قریشی کو بطور وزیراعلیٰ پنجاب تجویز کیا تھا لیکن تین مہینے بعد اسمبلی ہی ختم ہو گئی۔ چودھری صادق قریشی کچھ زیادہ سیاسی آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے پانچ چھے سیاسی شخصیات کا ایک حلقہ بنا رکھا تھا اور انھی پہ وہ تکیہ کیے ہوئے تھے۔ میں بھی اس حلقے کا ایک رکن تھا اور یوں میں پنجاب کی سیاست میں جانا پہچانا نام بن گیا۔ اس کے علاوہ بیوروکریسی میں میرے کئی دوست اور ہم جماعت موجود تھے۔ بعض ڈپٹی کمشنر تھے اور کچھ پولیس آفیسرز۔ اس زمانے میں یہ عہدے بڑی طاقت کے مالک تھے۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ ان کی وجہ سے بھی میرا سیاسی اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔

''میں یہاں سعید مہدی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ہم جماعت تھے۔ کافی عرصہ اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بعدازاں ان کے بیٹے سے میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ اب وہ میرے سمدھی ہیں۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد میں بینظیر بھٹو کے قریب آتا گیا۔ چناں چہ ۱۹۸۳ء میں جنرل ضیا حکومت کے خلاف ایم آر ڈی تحریک چلی، تو اس میں بھرپور حصہ لیا۔ میں نے تحریک کے کراچی دفتر میں شعبہ حسابات سنبھال رکھا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں قربت کی وجہ سے بینظیر بھٹو نے میرے گھر پی پی پی کی ایک میٹنگ بلائی جس میں یوسف رضا گیلانی، خواجہ احمد طارق رحیم اور دیگر ۴۰ نمایاں سیاست دانوں نے پی پی پی میں شمولیت کا اعلان کیا۔ میں



ز قریشی، چودھری احمد سعید، [illegible] حسن قریشی

میرے والد نے چودھری احمد مختار کو سیاست کرنے کی اجازت نہ دی

نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور اپنی جگہ ایک دوست کے بیٹے، علی ہارون شاہ کو ٹکٹ دلوا دیا۔ وہ الیکشن جیت گیا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد بینظیر بھٹو نے مجھے زرعی ترقیاتی بینک کا سربراہ بنا دیا۔ میں یہ عہدہ سنبھالنا نہیں چاہتا تھا' مگر انھوں نے کہا کہ حکومت میں اچھے لوگ آنے چاہئیں۔ جب ۱۹۹۰ء میں پی پی پی حکومت ختم ہوئی، تو میں نے فوراً استعفا دے دیا۔

''بینظیر صاحبہ کی خواہش تھی کہ میں اگلے انتخابات میں حصہ لوں' مگر میں دو سال زرعی بینک کا صدر رہ چکا تھا، لہٰذا انتخابات میں حصہ لینے کے لیے قانونی طور پر نااہل تھا۔ تب انھوں نے کہا کہ اپنے خاندان میں سے کسی کو ٹکٹ دلوا دیں' مگر میرے خاندان میں بھی کسی کو سیاست سے دلچسپی نہیں تھی' چناں چہ میں کراچی واپس آ گیا۔ اسی زمانے میں میرے چھوٹے بھائی، چودھری احمد مختار سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ میرے والد شروع میں انھیں اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے' مگر والد کے دوست، چودھری نذر محمد نے انھیں سیاست میں داخلے کی اجازت دلوا دی۔ مدعا یہ تھا کہ وہ مخالفین (چودھری ظہور الٰہی کے خاندان) کا مقابلہ کر سکیں۔ احمد مختار ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں دھاندلی کی وجہ سے جیت نہ سکے، البتہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ بینظیر بھٹو نے انھیں وزیر تجارت بنا دیا۔ دوسری طرف میں سیاست سے بدظن ہو کر اس سے کٹ گیا تھا۔''

چودھری صاحب نہایت دیانت داری سے راز افشا کرتے جا رہے تھے جن سے معلوم ہو رہا تھا کہ اقتدار کے ایوانوں میں فیصلے کس طرح ہوتے اور ذاتی روابط کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ وہ سیاسی فہم و فراست رکھنے کے باوجود سیاست سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر جواب دیا:

''میں جب زرعی ترقیاتی بینک کا سربراہ تھا تو مجھے سیاست دانوں کے طور طریق قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس کے باعث مجھے اصولوں اور اخلاق سے ناآشنا سیاست سے نفرت ہو گئی۔ میں نے پیپلز پارٹی کو ملک لوٹتے دیکھا' تو میری اذیت میں مزید اضافہ ہو گیا اور جب اپنے بھائی احمد مختار کے ''کارنامے'' دیکھے' تو مجھے شدید کرب نے آ لیا۔ ہمارے خاندان میں وہ واحد فرد ہے جسے بدنامی سے دوچار ہونا پڑا۔

''پی پی پی کے ساتھ میرا تجربہ اچھا نہیں رہا' مگر احمد مختار سیاست میں پھنس گیا۔ بدعنوانی کے معاملے پر اکثر میری احمد مختار سے گفتگو ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک میں کوئی رشوت خور پکڑا نہیں جا سکتا۔ اب تک تو ان کی بات خاصی حد تک ٹھیک ہی نظر آتی ہے۔

''میں یہ بتاتا چلوں کہ ہم دونوں بھائیوں کے مابین باپ بیٹے جیسا رشتہ ہے۔ اس رشتے میں ادب و احترام پایا جاتا ہے۔ بہرحال قومی معاملات پر ہمارے درمیان اکثر باتیں ہوتیں۔ مجھے یہ غم کھائے جاتا کہ میری آنکھوں کے سامنے بدعنوانی ہو رہی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

چودھری صاحب کا دکھ ہم بھی محسوس کر رہے تھے جس سے اُن کی وطن سے گہری محبت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تاریخی واقعات بیان کرنے میں بہت ٹھہرے اور محتاط تھے اور بڑی ذکاوت کے ساتھ قومی امراض کی نشان دہی بھی کرتے جا رہے تھے۔ اب وہ جنرل مشرف کے عہد میں داخل ہو رہے اور ہمیں بتا رہے تھے:

''۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف نے اقتدار سنبھال لیا۔ انھوں نے پیغام بھجوایا کہ پنجاب حکومت میں آ جاؤ۔ میں نے انکار کر دیا' تاہم انھوں نے میرے مشورے پر شاہد کاردار (خزانہ)، ڈاکٹر ایم اے چودھری (صحت) اور ملک اسلم آف شمس آباد کو وزارتیں دیں۔ کچھ

عرصے بعد یہ سننے میں آیا کہ مجھے چیئرمین واپڈا بنایا جا رہا ہے۔ اسی دوران پی آئی اے میں ہوا بازوں نے ہڑتال کر دی۔ یہ مسئلہ سلجھانے کی خاطر مجھے بطور منیجنگ ڈائریکٹر پی آئی اے بھجوایا گیا' حالانکہ مجھے بالکل علم نہ تھا کہ ایوی ایشن کا کام کیسے ہوتا ہے۔ میں زرعی ترقیاتی بینک کے طریق کار سے بھی واقف نہیں تھا۔"

میں نے ان سے پوچھا' آپ نے ان اداروں میں بہتری لانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے اور ان کے کیسے نتائج برآمد ہوئے؟ انھوں نے کسی بناوٹ کے بغیر جواب دیتے ہوئے کہا:

"میری کوشش یہ رہی کہ دونوں اداروں کو مضبوط اور توانا بنا دوں۔ میں نے صدر صاحب کو تجاویز دیں کہ پی آئی اے کی لیبر یونین پر پابندی لگائیں، کرائے کم کر دیں اور بیس ارب روپوں کی سرمایہ کاری کریں تاکہ ادارہ سنبھل سکے۔ میرے مطالبات پورے کر دیے گئے۔ پھر میں نے پی آئی اے کو بہتر بنانے کے لیے تیز رفتار اقدامات کیے۔ نئے جہاز خریدے اور پرانے فروخت کر دیے۔ جنرل مشرف تو چاہتے تھے کہ اخراجات کم کرنے کے لیے آٹھ نو ہزار ملازم فارغ کر دیے جائیں' مگر میں نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ پرانے جہازوں کے سبب ایندھن بھی زیادہ خرچ ہوتا تھا اور فاضل پرزہ جات بہت مہنگے تھے۔



"پی آئی اے کے معاملات وزیر خزانہ شوکت عزیز دیکھتے تھے۔ کئی معاملات پر ان سے میرا اختلاف رہتا۔ اسی لیے میں ان سے بہت کم بات کرتا تھا۔ شوکت عزیز اور دیگر بیورو کریٹس کی خواہش تھی کہ سیکنڈ ہینڈ جہاز خریدے اور ملازمین نکال دیے جائیں تاکہ ائیرلائن کا خسارہ کم ہو سکے۔ مگر اخراجات کم کرنے کا یہ طریقہ غلط تھا۔

"شوکت عزیز تیز و طرار آدمی تھے۔ وہ ہر شعبے سے متعلق بھرپور معلومات رکھتے تھے۔ مگر اپنے مفاد میں وہ دوسروں کو چکمہ دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ دوسروں پر اپنی حاکمیت جتانے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ ہمیں میٹنگ کے لیے بلاتے، تو خاصی دیر تک ان کی آمد کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس سے بہت کوفت ہوتی۔ رزاق داؤد صاحب (وزیر تجارت) نے بھی مجھے خاصا پریشان کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایئربس خریدی جائیں جبکہ میں بوئنگ ۷۷۷ خریدنے کے حق میں تھا۔ میں نے صدر مشرف سے ان کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اپنی وزارت کو دیکھیں، پی آئی اے کے معاملات ان کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔"

چودھری احمد سعید کے سینے میں بڑے بڑے راز دفن ہیں اور انھوں نے مختلف حکومتوں کے ادوار میں جو تجربات کیے' وہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ انھیں قومی قائد ہونے کا زعم ہے نہ انھیں ستائش کی تمنا ہے' لیکن انھوں نے ملکی حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور انھیں یہ ایقان حاصل ہے کہ ہمارا وجود پاکستان کے دم سے قائم ہے اور عوام کی خدمت کر کے ہی ہم اقوام عالم میں ایک معزز اور اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ عزیزی طیب اعجاز نے پوچھا "آپ ہمیں شالیمار اسپتال' لاہور کے بارے میں بتائیے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس میں آپ کی کاوشوں کا کتنا حصہ ہے۔ انھوں نے دلچسپ انداز میں واقعات بیان کرنا شروع کیے:

"یہ ہمارے بڑے اباجی، چودھری نذر محمد نے بنایا تھا جو ہماری کمپنی (سروس انڈسٹریز) میں ہمارے والد کے شراکت دار تھے۔ ہم انھیں اباجی کہتے۔ شروع میں علاج گاہ کا نام "بزنس مین ٹرسٹ اسپتال" تھا جو بعد میں شالیمار اسپتال رکھا گیا۔ اس اسپتال کے

میں نے پیپلز پارٹی کو ملک لوٹتے دیکھا، تو اذیت محسوس کی

قیام کا خیال ۱۹۷۲ء میں اُس وقت آیا جب بھٹو نے گورنر ہاؤس (لاہور) میں اشرافیہ کو گالیاں دیں کہ انھوں نے غریبوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ تب چودھری نذر محمد ایف پی سی سی آئی (فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز اینڈ کامرس) کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے اِن کی تحریک بنانے کا فیصلہ کیا اور چودھری نذر محمد، سید بابر علی، میاں شریف اور دیگر مخیر حضرات نے فیصلہ کیا کہ مزدوروں اور غریبوں کے لیے اسپتال بنایا جائے۔ یہ اسپتال ۱۹۷۸ء میں قائم ہوا۔ اسی زمانے میں چودھری نذر محمد اور میاں شریف کی گہری دوستی ہو گئی۔ میاں شریف جب تک لاہور میں رہے، وہ عید پر صرف چار شخصیات کے گھر جاتے تھے۔ پہلے ہمارے گھر آ کر چودھری نذر محمد سے عید ملتے، پھر مجید نظامی اور ذکی الدین پال سے۔ چوتھی شخصیت کا نام میں بھول رہا ہوں۔

"اس زمانے میں شریف برادران سیاست میں نہیں تھے۔ وہ اپنی مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے کہ بھٹو حکومت نے ان کے کارخانے قومیا لیے تھے۔ تاہم میاں شریف اور چودھری نذر محمد کے میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے مابین بھی تعلقات قائم ہو گئے۔ ہم کاروباری سرگرمیوں کے دوران ملتے رہے۔ میاں نواز شریف نے پھر یہ معمول بنایا کہ کبھی ملنا ہو، تو وہ میرے گھر آتے اور مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۱۳ء میں میاں نواز شریف نے مجھے اپنی رہائش گاہ پر بلوا لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں مسلم لیگ ن کی طرف سے گجرات کی نشست پر الیکشن لڑوں۔ یہ چودھری پرویز الٰہی والی نشست تھی، حلقہ نمبر ۱۰۵۔ میں نے انتخاب لڑنے سے انکار کر دیا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا ہم آپ کو اس حلقے سے انتخاب جتوا دیں گے۔ میں نے کہا، کوئی کسی کو الیکشن نہیں جتواتا، ایک ہارتا اور دوسرا جیت جاتا ہے۔ جب میں نے شریف برادران کو انکار کیا، تو وہ اصرار کرنے لگے کہ میں اپنے بیٹے، عارف سعید کو پرویز الٰہی کے مقابلے میں کھڑا کر دوں۔ تب وہ پنجاب انرجی بورڈ کے چیئرمین تھے۔ ہمارے لیے مسئلہ یہ تھا کہ احمد مختار بھی حلقہ ۱۰۵ سے کھڑے تھے لہٰذا ہم بھائی کیسے باہم مقابلے پر آ جاتے؟ اسی طرح چچا اور بھتیجا بھی تصادم کی راہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

"میں نے انتخاب لڑنے سے انکار کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں شریف برادران سے رخصت ہو کر ابھی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ ٹی وی پر خبر چل گئی کہ احمد سعید مسلم لیگ ن میں شامل ہو گئے ہیں اور احسن اقبال فرمانے لگے کہ وہ حلقہ ۱۰۵ سے الیکشن لڑیں گے۔ (یہ الیکشن چودھری احمد مختار ہی نے لڑا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ چودھری پرویز الٰہی فاتح رہے) میں نے بھی انتخابات کے وقت کاغذات جمع کرائے تھے مگر بعد میں واپس لے لیے۔ اس واقعے سے ہم بھائیوں کے مابین کچھ شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ تین ماہ پہلے وہ آ کر ملا۔ ہم گلے لگ کر بہت روئے۔ ہمارے مابین اختلاف نہیں بس سوچ کا فرق تھا۔ ہمارے خاندان میں احمد مختار واحد شخص ہے جس پر کرپشن کے الزامات لگے ہیں۔"

چودھری صاحب کی باتوں میں تجسّس تھا، کشش تھی اور واقعات کا بہاؤ اس قدر تند و تیز تھا کہ ہمیں سروس انڈسٹری جس کا پاکستان کی بڑی صنعتوں میں شمار ہوتا ہے، کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ یہ آزادی کی برکات اور ثمرات تھے کہ نچلے اور متوسط خاندانوں کو اپنے جوہر دکھانے کا ماحول میسر آیا۔ ہمارے سوال کے جواب میں انھوں نے حیرت انگیز حقیقتوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

"سروس لمیٹڈ کے نام سے ہمارے کاروبار کی ابتدا ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ اس کی بنیاد میرے والد، چودھری محمد حسین نے رکھی۔ کچھ عرصے بعد چودھری نذر محمد بھی کاروبار میں شریک ہو گئے۔ یہ میرے والد کے ہم جماعت تھے اور یہ دونوں بی اے تک اکٹھے پڑھتے

رہے۔ چودھری نذر محمد نے مال روڈ کی اسٹریٹ لائٹس کے نیچے بیٹھ کر پڑھا، ایل ایل بی کیا اور پورے ہندوستان میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔ وہ پھالیہ کے گاؤں، جگالیہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد امام مسجد تھے۔ میرے دادا ڈسٹرکٹ کورٹ میں ریڈر تھے۔ جب ان کی تقرری پھالیہ میں ہوئی، تب ہم بھی وسطی پنجاب کے اس علاقے میں پہنچ گئے۔ پھالیہ کے مڈل اسکول ہی میں میرے والد اور چودھری نذر محمد کی ملاقات ہوئی جو نہایت گہری دوستی میں بدل گئی۔ وہ دونوں پھر ساری زندگی اکٹھے رہے۔ چودھری نذر محمد جٹ تھے اور ہم کشمیری فاروقی۔ فاروقی قریشیوں کی ایک ذیلی ذات ہے۔ اسی لیے ہمارے تمام رشتے دار اپنے نام کے ساتھ قریشی لگاتے ہیں۔ جب ہمارے پاس چار پیسے آگئے اور ہمارا اثر بڑھ گیا تو ہم چودھری کہلانے لگے۔ جس طرح شریف برادران کا خاندان بٹ ہے مگر اب وہ میاں کہلاتے ہیں۔ دراصل آج بھی میاں اور چودھری کے ناموں سے عزت و احترام وابستہ ہے۔

"اب میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ والد نے میرا نام سعید احمد رکھا تھا۔ اتفاق سے میرے ایک ہم جماعت کا نام بھی سعید احمد تھا۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ ہمارے ماں باپ کے نام بھی ایک جیسے نکل آئے۔ چناںچہ اکثر ایسا ہوتا کہ اسکول والے میری تعلیمی رپورٹ اس کے گھر بھیج دیتے جبکہ اس کی رپورٹ میرے گھر پہنچ جاتی۔ میں ہونہار لڑکا تھا اور وہ نکما۔ جب مجھے مار پڑ چکی ہوتی، تب معلوم ہوتا کہ یہ میری رپورٹ نہیں۔ درست بچنے اور مغالطہ دور کرنے کی خاطر میں نے اپنا نام احمد سعید رکھ لیا۔



"بات سروس لمیٹڈ کی ہو رہی تھی۔ جب چودھری نذر محمد نے ایل ایل بی کر لیا تو وہ کچھ عرصے بعد میرے والد کے پاس آئے۔ کہنے لگے: میں وکالت کے بجائے کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل وہ بہت شریف آدمی تھے۔ جب ان کا واسطہ مجرموں اور غیر قانونی مقدمات سے پڑا تو گھبرا گئے۔ لہٰذا وہ بھی کاروبار میں شامل کر لیے گئے۔ جلد ہی ان کے ایک شاگرد، چودھری محمد سعید بھی ہمارے شراکت دار بن گئے۔ ان کا تعلق ضلع گوجرانوالہ سے تھا۔ میرے والد نے چودھری نذر محمد کو بتا دیا تھا کہ ہمارا کاروبار معمولی سا ہے اور سرمایہ بھی کم ہے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ اگر تم مجھے کاروبار میں شامل نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں مگر میں وکالت نہیں کروں گا۔ اس پر والد نے انھیں بخوشی شراکت دار بنا لیا۔ کاروبار میں تینوں شراکت داروں کا حصہ تینتیس تینتیس فیصد طے پایا..... حالانکہ سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔"

میں نے دل میں سوچا پرانے وقتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر مخلص اور پُروقار ہوتے کہ زندگیاں رفاقت میں گزار دیتے اور کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہ ہونے دیتے۔ ان رویوں میں ان کی تربیت اور خاندانی شرافت کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ ہم نے چودھری صاحب سے پوچھا کہ سروس انڈسٹری کی بنیاد رکھنے سے پہلے آپ کے والد کیا کام کرتے تھے۔ انھوں نے بلاتکلف بتایا:

"وہ کچھ عرصے انشورنس کا کام کرتے رہے مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی تو ٹھیکے داری کرنے لگے۔ ہولڈآل بنا کر فروخت کرتے تھے۔ مقامی ہنرمندوں سے ہولڈآل بنواتے اور پھر کلکتے لے جا کر بیچ دیتے۔ ان کی کمپنی کا پہلا نام حسین اینڈ کمپنی تھا لیکن ہندو تاجر مسلمانوں سے تعصب برتتے اور مال نہیں خریدتے تھے اس لیے والد نے کمپنی کا نام سروس اینڈ کمپنی رکھ دیا۔ اس کاروبار سے

شوکت عزیز اپنے مفاد میں دوسروں کو چکمہ دیتے رہے

جو کچھ کمایا، وہ ۱۹۴۷ء میں صفر ہو گیا کیونکہ ہماری مارکیٹ بھارت میں رہ گئی تھی۔ بہرحال ہم نے حوصلہ نہ ہارا اور پاکستان میں اس کاروبار کو نئے سرے سے لاہور سے شروع کیا گیا۔ تب وہ دیال سنگھ کالج کے سامنے ۲۵ نمبر کوٹھی میں مقیم تھے۔ اسی جگہ انھیں لاہور پولیس کو چپلیں فراہم کرنے کا ٹھیکہ ملا۔ چناںچہ انھوں نے مقامی ہنرمندوں سے چپلیں بنوائیں اور سپلائی شروع کر دی۔ بعدازاں پاک فوج سے بھی چپلوں کا چھوٹا سا ٹھیکہ مل گیا۔ کام بس لشٹم پشٹم چل رہا تھا۔

"۱۹۵۰ء میں والد صاحب نے کراچی کے سیٹھوں سے رقم لے کر لاہور میں چمڑا بنانے کا ایک چھوٹا کارخانہ لگا لیا۔ اسی دوران ان کی کمپنی کو پولیس اور فوج کی طرف سے جوتے بنانے کے آرڈر ملنے لگے۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ فوج کی ایک میٹنگ میں جوتے سپلائی کرنے والی سبھی کمپنیوں کے مالک شریک تھے۔ اس میٹنگ میں والد صاحب نے کہا کہ وہ فوج کا ہر بڑا آرڈر پورا کر سکتے ہیں۔ اس پر باٹا کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر، دولے زال کہنے لگا آپ کیا بات کرتے ہیں، آپ اپنے جوتے باہر سے منگواتے ہیں۔ ہمارا جوتوں کی مانگ کا آرڈر کیسے پورا کر سکیں گے۔ دولے زال چیکوسلواکیہ سے تعلق رکھنے والا قابل اور محنتی آدمی تھا۔ میرے والد نے اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جوتے بنانے کی بڑی فیکٹری لگانے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی سروس انڈسٹری چھوٹے پیمانے پر مارکیٹ میں جوتے فراہم کرنے لگی۔

"دولے زال نے ہمیں چت کرنے کی خاطر جوتوں کی قیمتیں گرا دیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ ہم مالی نقصان اٹھا کر اپنی فیکٹری بند کرنے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن باٹا کے مالکوں کو بھی اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ ان کا کہنا تھا کہ سروس والوں کی صرف دو دکانیں ہیں۔ انھیں مارتے ہوئے ہماری کمپنی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چناںچہ انھوں نے دولے زال کا تبادلہ کر دیا۔ محنت اور معیاری جوتے دینے کے باعث مارکیٹ میں ہمارے قدم جم گئے۔ ہماری دکانوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس کاروبار میں پھر نئی نسل بھی آ گئی۔ ہم نے ایمانداری سے کام کیا، تمام ٹیکس ادا کرتے رہے اور باری تعالیٰ نے بھی ہمارے کام میں برکت ڈال دی۔ گجرات میں جوتوں کا کارخانہ لگانے کے پیچھے یہ فلسفہ پوشیدہ تھا کہ وہاں لوگوں کو ملازمت نہیں ملتی تھی۔ چناںچہ فیکٹری لگانے سے تعلیم یافتہ اور ناخواندہ دونوں قسم کے بےروزگار نوجوانوں کو ملازمت میسر آ گئی۔ کئی سال بعد ہمارے بزرگوں نے مریدکے میں نئی فیکٹری لگائی۔ اس علاقے میں بھی بےروزگاری عام تھی۔ کارخانہ لگنے سے اس پر قابو پانے میں مدد ملی۔ فیکٹری کی زمین ہمارے بزرگوں نے پہلے ہی خرید لی تھی۔ دراصل وہ اپنے سرمائے پر سود نہیں لینا چاہتے تھے اسی لیے زمینیں یا گھر خرید لیتے تھے۔

"ہمارے بانی، چودھری نذر محمد بہت شریف اور سادہ مزاج تھے۔ ان کا رہن سہن غریبانہ تھا اور وہ غریب کی حیثیت ہی سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دولت سے عزت و احترام میں اضافہ نہیں ہوتا۔ وصف خاص صرف شرافت سے مخصوص ہے۔ ان کی اہلیہ، رشید و بیگم نے بیس کروڑ روپے پر مشتمل اپنی ساری دولت شالیمار اسپتال کو دے دی تھی۔

"سروس انڈسٹریز کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اسے کبھی دیوالیہ ہونے کے خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہم نے کبھی اپنے قرضوں کو ری شیڈول کرایا۔ ورنہ سید بابر علی، داؤد، سہگل وغیرہ، سبھی نے اپنے قرضے ری شیڈول یا معاف کرائے۔ جب میاں منشا کے والد فوت ہوئے، انھوں نے یونائیٹڈ بینک کو دس لاکھ روپے دینے تھے۔ میاں منشا بینک کے صدر کے پاس گئے اور کہا کہ یہ قرضہ معاف کر دیں۔ اس کے برعکس ہم نے اپنا دامن پوری طرح صاف رکھا۔"

سروس انڈسٹری کی ترقی اور خوشحالی کا حال سن کر یہ احساس ہوا کہ ہمارے معاشرے میں ایسے اولوالعزم لوگ موجود ہیں جو دیانت

داری پر کامل یقین رکھتے ہیں اور دولت کی ہوس میں غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتے۔ ہمیں روزمرہ زندگی میں ایسے افراد سے واسطہ پڑتا ہے جو کہتے ہیں کہ دیانت داری سے کوئی کاروبار اب کیا نہیں جا سکتا اور کام نکلوانے کے لیے فائلوں کو پہیے لگانے پڑتے ہیں۔ جناب چودھری احمد سعید نے جو داستان سنائی، وہ ایمان افروز ہونے کے علاوہ پاکستان کے مستقبل کی ایک خوش آئند تصویر پیش کرتی ہے۔ گفتگو کے دوران خیال آیا کہ ان کے تعلیمی سفر کی روداد معلوم کی جائے۔ انھوں نے واقعاتی انداز اختیار کرتے ہوئے بتایا:

''میں نے ۱۹۶۲ء میں ایف سی کالج سے بی اے، بعدازاں پنجاب یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ میں بی ایس سی آنرز کیا۔ اس کے بعد لندن کے نارتھرن پولی ٹیکنیک میں پولیمر ٹیکنالوجی پڑھنے چلا گیا، مگر وہاں دو سال تک فیل ہوتا رہا، چنانچہ والد صاحب نے واپس بلا لیا۔ میں نے پھر کاروبار سے متعلق کئی کورس کیے اور بیس سال تک پروڈکشن کے شعبے سے منسلک رہا۔ ۲۰۰۱ء میں یہ شعبہ بیٹوں کے سپرد کر دیا۔ میرے دو بیٹے ہیں: عارف سعید جس نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ دوسرا بیٹا، عمر سروس انڈسٹریز کا ایم ڈی ہے۔''



طیب اعجاز نے دریافت کیا کہ آپ کے ادارے کی بنیاد تین بزرگوں نے مل کر رکھی تھی، ان کی اولاد کے مابین تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟

چودھری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''ہمارے مابین خوشگوار تعلقات ہیں۔ گو ماضی میں رفتہ رفتہ سب نے اپنی کمپنیاں الگ کر لی ہیں اور وہ مشترکہ کاروبار سے الگ ہو گئے، تاہم نئی نسل کا آپس میں میل ملاپ رہتا ہے۔''

اس پر مزید سوال پیدا ہوا کہ آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر بتائیے، قومی معیشت کی بہتری کے لیے کس قسم کے اقدامات کیے جائیں؟

انھوں نے بلاتوقف کہا ''ملکی معیشت میں بہتری لانا زیادہ مشکل نہیں، اس ضمن میں دو اقدامات ضروری ہیں۔ اول یہ کہ ہماری برآمدات بڑھنی چاہئیں۔ وجہ یہ کہ ہم ڈالر میں بہت سی اشیا خریدتے ہیں، اس لیے ہمارے پاس ڈالر بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔ ابھی ہماری برآمدات یا درآمدات ۲۴ یا ۲۵ ارب ڈالر پر رکی ہوئی ہیں۔ اس عدد کو ۴۰ یا ۴۵ ارب ڈالر تک پہنچنا چاہیے۔ دوسرے ٹیکس دینے والے پاکستانیوں کی شرح بڑھنی چاہیے۔ فی الوقت بہت سے دولت مند پاکستانی ٹیکس نہیں دیتے۔ ان کا بڑا نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، ان کا دیا ہوا پیسہ ترقیاتی کاموں پر نہیں لگے گا، بلکہ حکومتی مشینری اسے ہڑپ کر جائے گی۔ دوسری طرف ایف بی آر کہتا ہے کہ امیر پاکستانی ٹیکس نہیں دیتے۔ اب ایف بی آر کوشش کر رہا ہے کہ اچھی کمانے والے پاکستانی اس کے ہاں رجسٹرڈ ہو جائیں۔ اس پر بہت سے پاکستانیوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے ہیں۔ وہ رجسٹرڈ نہیں ہونا چاہتے۔ اس عمل سے بہرحال نواز شریف حکومت نے ایک خطرناک قدم اٹھایا ہے کیونکہ تاجر طبقہ ان کا ووٹر ہے۔

''بیرون ممالک میں شہریوں کی اکثریت ٹیکس دیتی ہے، لیکن پاکستان میں یہ شرح بہت کم ہے۔ اسی لیے حکومت کو اخراجات پورے کرنے کی خاطر بینکوں، آئی ایم ایف وغیرہ سے قرضے لینا پڑتے اور پھر ان قرضوں پر سود دینا پڑتا ہے۔ ملک ایسے تو نہیں چلتے، دوسری طرف تاجر طبقہ ۰.۶ فیصد وِدہولڈنگ ٹیکس برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان نے انھیں مواقع فراہم کیے ہیں، لاکھوں

خاندان خوشحال ہوئے ہیں اور ہم ایک آزاد ریاست کے آزاد شہری ہیں۔"

ہمارا مکالمہ ایک خاص آہنگ کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا' تو اچانک چودھری صاحب نے ایک انتہائی دلچسپ اور تاریخی اہمیت کا موضوع چھیڑ دیا۔ وہ کہہ رہے تھے:

"کچھ عرصہ قبل چودھری نثار علی خان نے بیان دیا کہ وہ ان وکلا کی پروا نہیں کرتے جو قبضہ مافیا، ایل پی جی مافیا یعنی کرپٹ لوگوں کے کیس لڑتے ہیں۔ اس بات سے چودھری اعتزاز احسن کو زک پہنچی۔ انھوں نے اسمبلی میں کہا' میں بہاول بخش کا پوتا اور احسن کا بیٹا ہوں۔" اب عام لوگ بہاول بخش کو نہیں جانتے۔ یہ شمس آباد کا تھانے دار تھا۔ موصوف نے قتل میں ملوث ایک بااثر شخص کو جیل سے فرار کرا دیا۔ اس پر انگریز حکومت نے انھیں برطرف کر دیا۔ فرار ہونے والا شخص بہاولپور کا زمین دار تھا۔ اس نے بہاول بخش کو اپنی زمینوں پہ ٹھہرایا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اس کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ زمین دار فریاد لے کر نواب بہاولپور کے پاس پہنچا۔ نواب نے آدھی زمینیں اسے اور آدھی بہاول بخش کو دے ڈالیں۔ یوں وہ بھی زمین دار بن گئے۔ ان کا آبائی تعلق کنجاہ (گجرات) سے تھا جہاں ان کی دس مرلے زمین بھی نہیں تھی۔ اسی طرح اعتزاز احسن کے والد نواب بہاولپور کی سفارش پر تحصیل دار لگے حالانکہ انھیں اس شعبے کی الف ب کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ احسن علیگ کے نام سے مضامین لکھتے تھے مگر حقیقت میں یہ مضامین ان کی بیوی، رشیدہ بیگم لکھتی تھیں۔ یہ علیگ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نہیں مسلم لیگی ہونے کے ناتے سے لکھتے تھے۔ ان کا تعلق گجرات کے ہریا والہ گاؤں سے تھا۔ رشیدہ بیگم کے والد نامی گرامی ذیلدار تھے۔

"احسن علیگ اور رشیدہ بیگم کی شادی کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ بہاول بخش رشتہ لے کر ذیل دار کے پاس گئے۔ یہ برطرف تھانے دار اور وہ ایک بڑے زمین دار، کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ بہرحال ذیل دار صاحب نے وضع داری نبھائی اور بات چیت جاری رکھی۔ اس

زمانے میں رواج تھا کہ جب "ہاں" ہو جاتی تب رشتے میں مٹھائی رکھ کر دی جاتی تھی۔ بہاول بخش نے بات پکی ہونے سے قبل ہی یہ مٹھائی بنوا دی۔ یوں ذیلدار کو ناچار یہ رشتہ کرنا پڑا۔ غرض قیام پاکستان کے بعد بہت سے لوگوں کی قسمت ہی نہیں خاندانی تاریخ بھی بدل گئی۔ مثبت بات یہ ہے کہ غریب اور متوسط طبقات کے افراد کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔ حقیقتاً پاکستان کی وجہ ہی سے انھیں عزت ملی۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ممکن تھا کہ میرے والد انشورنس کی ملازمت کرتے یا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہوتا۔"

ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کے والد پاکستان کرکٹ بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔ تب جنرل ضیاالحق کا مارشل لا آ چکا تھا۔ یہ کیسے ہوا کیونکہ آپ تو پیپلز پارٹی کا حصہ تھے۔ کیا صدر فضل الٰہی کے کہنے پر ان کا تقرر ہوا؟

چوہدری صاحب نے جواب میں کہا "میرے والد مارشل لا آنے سے قبل پی سی بی کے چیئرمین بن چکے تھے۔ ممکن ہے ان کے تقرر میں صدر فضل الٰہی کا بھی عمل دخل ہوا ہو، کیونکہ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان جیسے قانون پسند اور اصول پرست سیاست دان کم ہی گزرے ہیں۔ جب جنرل ضیاالحق نے مارشل لا لگایا، تو وہ صدر فضل الٰہی سے ملاقات کرنے گئے۔ جنرل صاحب چاہتے تھے کہ صدر استعفا نہ دیں ورنہ آئین معطل ہو جاتا اور جگ ہنسائی بھی ہوتی۔ صدر صاحب کہنے لگے، میں اس سلسلے میں مسٹر بھٹو سے بات کرنا چاہتا ہوں چنانچہ ان کی مری میں اسیر بھٹو صاحب سے بات کرائی گئی۔ انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ آپ بطور صدر کام کرتے رہیں ورنہ آئین کالعدم ہو جائے گا۔ اس کے بعد صدر فضل الٰہی قصرِ صدارت میں موجود رہے ورنہ وہ فوراً استعفا دینا چاہتے تھے۔



"میں ان کو پاکستان کا بہترین پارلیمنٹیرین سمجھتا ہوں۔ چوہدری صاحب آزادی پاکستان سے قبل ایم این اے تھے۔ وہ ایک ایماندار اور غریب پٹواری کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی کی، اسپیکر قومی اسمبلی بنے اور آخر میں انھیں پاکستان کا پہلا منتخب صدر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ آئین کی رو سے صدر پاکستان کے محدود اختیارات تھے لیکن فضل الٰہی حق بات کہنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کے اقتدار کا آخری دور چل رہا تھا۔ صدر فضل الٰہی نے انھیں کہا: "جناب! آپ نے کئی غلطیاں کی ہیں۔" بھٹو صاحب کے منہ پر یہ کہنا بڑی بات تھی۔ وہ بولے "میں اب ویسی غلطیاں نہیں کروں گا۔" صدر نے کہا: "آپ پھر نئی غلطیاں کر سکتے ہیں۔" صدر مرحوم ویسے الفاظ میں راہ گم کردہ شخصیات کو سخت باتیں سنا جاتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، وہ چیخ کر بولتا ہے۔ جیسے بعض علمائے کرام خاصا اونچا بولتے ہیں حالانکہ انھیں مولانا مودودی کے مانند دھیمے اور مدلل انداز میں بولنا چاہیے۔

"جماعت اسلامی میں قاضی حسین احمد مرحوم سے میرا خاصا تعلق رہا۔ جب وہ پاسبان (تنظیم) بنانے لگے، تو صلاح مشورے کی خاطر مجھے بھی بلوایا۔ میں نے انھیں کہا نوجوانوں کی کوئی نئی تنظیم نہ بنائیے کیونکہ نوجوان جنگجوئی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب جمعیت وجود میں آئی، تو اس نے مختصر عرصے میں کئی یونیورسٹیوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ جمعیت کے لڑکوں نے بہت خدمات انجام دیں۔ اسی نے طالبات بھی تنظیم کو دے دی تھیں لیکن پھر جمعیت کے لڑکوں نے جنگجوئی اختیار کر لی جس سے تنظیم کو

میں چودھری فضل الٰہی کو پاکستان کا بہترین پارلیمنٹرین سمجھتا ہوں

نقصان پہنچا۔ قاضی صاحب کہنے لگے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو اس طرف نہیں جانے دیں گے۔ وہ دراصل جماعت اسلامی کو وسعت دینا اور نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔"

اب انھیں ایک مشکل سوال کا سامنا تھا کہ آپ صنعت کار ہوتے ہوئے وقتاً فوقتاً سیاست کے میدان میں بھی داخل ہوتے رہے۔ آپ کے تجربے کی رو سے ایک کاروباری کو سیاست کرنی چاہیے؟

انھوں نے سنبھل کے جواب دیتے ہوئے کہا "سچی بات یہ ہے کہ مجھے سیاست پسند نہیں۔ جب میں زرعی ترقیاتی بینک کا سربراہ بنا تو وہاں مجھے سیاسی فریب دیکھنے کو ملے۔ میں نے تو پہلے ہی بادلِ نخواستہ یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کاروباری افراد کو حکومت میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ وہ کارخانے لگانے اور اپنا کاروبار بڑھانے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ روش ملک کے لیے اچھی نہیں۔ صدر ضیاالحق نے ایک یہ اچھا کام کیا کہ وہ درمیانے طبقے کو سیاست میں لے آئے جس نے حکومت میں پہنچ کر غریبوں کی فلاح و بہبود کے کام بھی کیے ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ کاروباری لوگوں یا زمین داروں نے حکومت میں آ کر اپنے محلات کھڑے کر لیے۔ ان لوگوں کو سیاست سے لاتعلق رہنا چاہیے۔"

ان آن ایک الگ نوعیت کے سوال نے گفتگو کا رخ ایک اہم واقعے کی طرف موڑ دیا۔ سوال یہ تھا کہ بھٹو دورِ حکومت کے دوران لاہور میں آپ کی فیکٹری کو آگ لگائی گئی تھی۔ یہ کیا قصہ تھا؟

انھوں نے حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا "اس واقعے سے بھٹو حکومت کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ دراصل جماعت اسلامی کے راہنما اصغر صدیقی لیبر یونین کے لیڈر بن گئے تھے۔ جب مزدوروں کے مطالبات پر یہی لیڈری چمکی تھی لہٰذا اصغر صدیقی نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے میری فیکٹری میں آگ لگا دی۔ میں مولانا مودودی کے پاس گیا اور انھیں سارا واقعہ سنایا۔ وہ کہنے لگے، میں اصغر صدیقی سے بات کرتا ہوں۔ میں نے کہا اگر صدیقی نے غلط بیانی کر دی تو...... مولانا بولے، اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ اپنے لوگوں کی کردار سازی کرتے ہوئے میں نے اپنی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔ یہ جملہ ایک عظیم انسان ہی کہہ سکتا ہے۔ مولانا نے پھر اصغر صدیقی سے واقعے کی بابت پوچھا جس نے من و عن میری باتیں دہرا دیں۔ اس پر مولانا کہنے لگے کہ اس قسم کی جنونی اور مار دھاڑ جماعت میں نہیں چل سکتی۔ لہٰذا اصغر صدیقی نے جماعت کو خیرباد کہہ دیا۔ جماعت اسلامی کا اپنا خاص مزاج ہے جو غنڈہ گردی سے تعلق نہیں رکھتا۔"

چودھری صاحب کی گفتگو میں اس قدر تجسس تھا کہ ہمیں چائے پینے کا خیال ہی نہیں آیا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ہم ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونا چاہتے تھے۔ ایک ایسے وقت جب فکری اور عملی فراست کا وجود بکھرتا جا رہا ہے۔ چودھری صاحب کا وجود قوم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کھری بات کہنے والی شخصیتیں اب کتنی رہ گئی ہیں؟ ہم نے ان سے پوچھا آپ ایک صنعت کار کی حیثیت سے پاکستان کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں۔ انھوں نے چند لمحوں کے توقف سے جواب دیا:

"میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہر فرد اپنے آپ کو درست کرے، تب معاملات خود بخود صحیح ہونے لگیں گے۔ یہ ملک کے حالات سدھارنے کی اوّلین ضرورت ہے۔ یہ خاصا کٹھن کام ہے مگر ہر پاکستانی دیانت داری سے اسے انجام دے۔ اس کے پہلو بہ پہلو احتساب کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ جن لوگوں نے قومی خزانہ لوٹا ہے، میری زندگی میں ان کا احتساب ہو جائے۔ اس ضمن میں میاں شہباز شریف سے بھی بات ہوئی مگر وہ بھی

مگر نچلوں پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں ہیں۔ مجھے عمران خان کے کردار کے حوالے سے بھی کچھ تحفظات ہیں۔ وہ ماضی میں رنگ رنگیلے رہے ہیں اور اب بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ جو لیڈر وطن کی باگ ڈور سنبھالے، اس کا کردار صاف شفاف اور دامن ہر داغ سے پاک ہونا چاہیے۔ وہ ہی عوام و خواص کو نیک و بد کی تمیز سکھا سکیں گے۔"

مجھے انٹرویو کے دوران محسوس ہوا کہ احتساب کا لفظ جس قدر عام ہوا ہے اسی قدر بے وزن ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے عوام کا خون چوسنے والے اور اپنے وطن کو قرضوں کی دلدل میں دھکیلنے والے اقتدار کے مالک ہیں جبکہ احتساب کے تمام ادارے بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ سے فوج اور سیکیورٹی کے ادارے دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کو مالی معاونت پہنچانے والوں اور قومی وسائل ہڑپ کرنے والوں کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ حقیقی معنوں میں جانچ پڑتال شروع ہوئی ہے مگر طاقت ور مافیاؤں نے پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں جنھیں ہمارا میڈیا بے نقاب کر رہا ہے اور افق پر امید کی روشنی نمودار ہو رہی ہے چنانچہ چودھری صاحب سے سوال کیا گیا کہ دولت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے۔ ان کا جواب کیا تھا ایک شعلہ سا لپک گیا تھا:

"میں نے اپنی زندگی میں بے حساب دولت دیکھی ہے۔ میرے والد تو غربت کے عالم سے گزرے مگر میں نے خوشحال ماحول ہی میں آنکھ کھولی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں دولت کی ہوس نہیں رکھتا کیونکہ ایک حد کے بعد پیسہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ میں اس لیے زمین نہیں خریدتا کہ چند برس بعد مجھے اس سے مالی فائدہ ہوگا۔ ہمارے بزرگوں کا نظریہ دولت یہ تھا کہ لوگوں کو روزگار دینے کی خاطر نئے کارخانے لگاؤ۔"

طیب اعجاز نے صنعت کاروں اور تجارت پیشہ حلقوں کی راہنمائی کے لیے ایک اہم سوال پوچھا کہ آپ کی کمپنی ۱۹۷۹ء میں اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہوئی۔ یہ فیصلہ مثبت ثابت ہوا یا منفی رہا؟

چودھری صاحب نے کھلے ذہن کے ساتھ اس نازک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ادارے کو پبلک لمیٹڈ کمپنی بنا کر ہمارے بزرگوں نے اسے اولاد میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے خاندانوں کے سبھی ہر وزن کمپنی کے حصص رکھتے ہیں۔ کمپنی کا ۱۰ روپے والا حصص آج تقریباً ایک ہزار روپے کا ہے چنانچہ سبھی لوگ صاحب ثروت ہو چکے اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ادارے کو پبلک لمیٹڈ بنانے سے نئی نسل کو بہت فائدہ پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس کمپنی کی مالیت دو تین ارب روپے ہو جائے، اسے اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت سروس انڈسٹریز کے ۵۶ فی صد حصص ہم دو بھائیوں کے پاس ہیں۔ عوامی اور سرکاری و نجی ادارے بقیہ ۴۴ فی صد حصص رکھتے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ ہمارے بزرگوں اور نئی نسل نے کبھی کاروبار میں کرپشن اور بے ایمانی سے کام نہیں لیا اور اپنے حسابات صاف شفاف رکھے۔ ایسی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

"مثال کے طور پر بیسٹ وے گروپ کے مالک سر انور کو لیجیے۔ انور پرویز نے برطانیہ میں بس کنڈکٹر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں قانون تھا کہ جنرل اسٹور روزانہ صرف ۸ گھنٹے تک کھلتے اور ہفتہ اتوار کی چھٹیوں میں بند رہتے تھے۔ دراصل تب ٹریڈ یونینز بہت طاقتور تھیں اور وہ یہ قانون ختم نہیں ہونے دیتی تھیں۔ انور پرویز نے بھی ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ وہ خود اس کے مالک تھے، وہ اسے رات گئے تک کھلا رکھتے۔ ہفتہ اتوار کو بھی جنرل اسٹور کھلا رہتا مگر انھیں اصل کامیابی حسابات رکھنے کی وجہ سے ملی۔ وہ ناخواندہ تھے مگر انھوں نے دکان کا حساب کتاب رکھنے کے لیے ایک اکاؤنٹنٹ رکھ لیا۔ وہ پورا ٹیکس ادا کرتے اور تمام سرکاری واجبات بھی۔ دوسرے درست اکاؤنٹس رکھنے کی بدولت انھیں نفع و نقصان کی بابت معلوم ہوتا رہتا۔ غرض حسابات دیانت داری سے انجام دینے کے باعث اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے کاروبار میں برکت ڈال دی۔"

ہم نے ان کے تجربات کی روشنی میں پوچھا کہ پی آئی اے کا مستقبل کیا ہے۔ انھوں نے دوٹوک لہجے میں کہا:

مولانا مودودیؒ نے کہا، جماعت میں مار دھاڑ نہیں چل سکتی

"پی آئی اے کو اب پرائیویٹائز کر دینا چاہیے۔ میرے دور میں نجکاری کا سنہرا موقع آیا تھا جب پی آئی اے کا ایک حصص ۲۳ روپے تک پہنچ گیا تھا، لیکن حکومت نے یہ موقع گنوا دیا۔"

چودھری صاحب سے نہایت تند سوال پوچھا گیا کہ ایک زمانے میں سروس شوز کا معیار بہت عمدہ تھا اور متوسط طبقے کے لوگ بھی ان جوتوں کو آسانی سے خرید لیتے۔ مگر کچھ عرصے سے ان کی قیمتیں خاصی بڑھ گئی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

انھوں نے خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے کہا "جوتے مہنگے ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثال کے طور پر خام مال دگنا مہنگا ہو چکا۔ پھر ۱۷ فی صد سیلز ٹیکس بھی دینا پڑتا ہے۔ اوپر سے چین کے بے حساب جوتے مارکیٹ میں دستیاب ہیں، جبکہ پچھلے دس برس میں مجموعی طور پر مہنگائی خاصی بڑھی ہے۔ ان سب وجوہ کی بنا پر ہمیں جوتے مہنگے کرنا پڑے۔ اس کے باوجود سروس انڈسٹریز جوتے برآمد کرنے والی سب سے بڑی پاکستانی کمپنی بن چکی۔ اس کی درآمدات پیداوار سے دگنی ہو چکی ہے اور ہر سال پچاس کروڑ سے ایک ارب مالیت کی نئی مشینیں لگ رہی ہیں۔"

اب ہم ذہنی میں داخل ہو رہے تھے اور چودھری صاحب سے یہ اہم اور نوکیلا سوال پوچھ رہے تھے کہ حکومت کی معاشی پالیسیاں صنعت و حرفت کے فروغ میں کس حد تک سودمند ہیں۔ انھوں نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے جواب دیا:

"میرے نزدیک وزیر خزانہ اسحاق ڈار ایک اہل اور صاحبِ بصیرت شخصیت نہیں۔ انھوں نے دفعہ ۱۶۴ کے تحت بیان دیا اور بعد میں صحافیوں کو بتایا کہ انھوں نے دباؤ میں آ کر جھوٹ بولا تھا۔ گویا وہ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ انھوں نے جھوٹ بولا۔ ویسے وہ نمازی پرہیزگار آدمی ہیں۔ میں تو انھیں ایک اچھا اکاؤنٹنٹ سمجھتا ہوں اور بس۔ اسحاق ڈار میں تو پھر کچھ خوبیاں ہیں، شوکت عزیز صاحب میں تو وہ بھی عنقا تھیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک بینکار تھے اور بڑے بینکاروں کا کام یہ ہے کہ وہ دولت مندوں کی جائز اور ناجائز خواہشات پوری کرتے رہیں۔ شوکت عزیز نے بھی اسی قسم کی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک چالباز اور چالاک شخص ہیں۔ میرا ان سے جھگڑا بھی ہوا۔

جنرل مشرف کی حکومت میں شاہد کاردار وزارتِ خزانہ سے منسلک تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں نے وزیراعظم شوکت عزیز کو مشورہ دیا کہ نئے بجلی گھر بنانے کے منصوبے شروع کیے جائیں۔ یہ ۲۰۰۳ء کی بات ہے جب قومی معاشی ترقی کی شرح ۸ فی صد تک پہنچ گئی تھی۔ شاہد کاردار نے وزیراعظم کو بتایا کہ اس وقت بجلی کا شارٹ فال ۲۵ فی صد ہے۔ اگر شرحِ ترقی ۸ فی صد ہی رہی، تو اگلے تین سال میں بجلی کا بحران جنم لے گا۔ مگر شوکت عزیز نے لوڈشیڈنگ کے امنڈتے طوفان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ نتیجتاً کئی برس سے پاکستان بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ یہ شوکت عزیز ہی ہیں جنھوں نے جنرل مشرف اور چودھری افتخار کے مابین لڑائی کرائی ورنہ چودھری افتخار نے مشرف حکومت کے حق میں کئی فیصلے دیے تھے۔ جب اسٹیل ملز کا فیصلہ حکومت کے خلاف آیا، تو اسی دن سے شوکت عزیز چیف جسٹس کے خلاف ہو گئے۔"

ہمارا آخری سوال تھا کہ جنرل راحیل شریف نے احتساب کا عمل شروع کیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

انھوں نے توانا لہجے میں کہا:

"یہ ایک اچھا قدم ہے مگر احتساب کے عمل کو انجام تک پہنچنا چاہیے۔ تبھی فائدہ ہوگا۔"

ہم کھلی فضا میں آئے تو دھلے ہوئے پودوں اور درختوں نے نظر کو تازگی اور ذہن کو شادمانی سے بھر دیا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت آزادی کی مہک فضا میں رچی بسی تھی۔

◆◆◆

اردو کی فریاد

مظلوم قومی زبان کا قصہ جسے آزادی کے ۶۸ برس گزر جانے پر بھی اشرافیہ پاکستان نہ اپنا سکی

اوریا مقبول جان



پرویز مشرف کے بعد جنم لینے والی اسمبلیوں، نوزائیدہ جمہوری نظام اور ارباب سیاست سے اگر آپ یہ سوال کریں کہ ان سات آٹھ سالوں میں ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس پر آپ کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے تو تمام سیاسی پارٹیوں کے اراکین اتفاق رائے سے یک زبان ہو کر کہیں گے کہ اٹھارویں ترمیم..... ہم نے گزشتہ ساٹھ ستر سالوں کی صوبائی خودمختاری کی جدوجہد کا ثمر لوگوں کی جھولی میں ڈال دیا۔ اب صوبے آزاد اور خودمختار ہیں۔ اپنا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم خود بنائیں، اپنے اسپتال خود چلائیں، اپنی معدنیات خود نکالیں۔ مرکز تو ایک وحدت کی علامت ہی رہے گا۔ درحقیقت یہ پاکستان اور اس کی سرحدیں اہم سچائی اور زمینی حقائق نہیں بلکہ زمینی حقیقتیں تو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور خیبرپختونخوا ہیں۔ ان کی سرحدیں مقدس اور محترم ہیں۔ ان سرحدوں پر کھڑے ہو کر کوئی سیاسی لیڈر گرجتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم لوگوں نے ہماری یہ بات نہ مانی تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، اس ملک کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگے گا۔ لیکن اسی سرحد کے اندر کوئی شخص اگر یہ سوال اٹھائے کہ یہ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور خیبرپختونخوا کی سرحدیں کوئی آسمانی صحیفے نہیں بلکہ یہ لکیریں تو انگریزی سامراج نے کھینچی تھیں اور اب ان صوبوں میں موجود اقلیتوں کو بھی اپنے الگ صوبے چاہئیں تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ اب صوبے کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا بلکہ نعرہ یہ بلند ہوتا ہے کہ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے لیکن سندھ، پنجاب، بلوچستان اور خیبرپختونخوا کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن پاکستان کے حوالے سے خون کا آخری قطرہ بہانے کا ذکر آپ کو بس چودہ اگست یا ۲۳ مارچ کی



تفریحات میں کہیں مل جائے۔

لسانی، صوبائی اور علاقائی عصبیت وہ ہتھیار ہے جس سے غریب آدمی کو دوسرے گروہ کا خوف دلا کر، اس کے خلاف نفرت ابھار کر سیاسی راہنما انھیں اپنے پیچھے لگاتے ہیں اور وہ بھیڑ بکریوں کی طرح تبھی ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ملکی تناظر میں بلوچی، سندھی اور پختون کو پنجابی کھا جائیں گے، صوبائی سطح پر سندھی کو اردو بولنے والے اور اردو بولنے والوں کی سندھی، پختون کو ہزارہ اور ہزارہ کو پختون کھا جائیں گے۔ خوف کے مارے یہ غریب عوام ان چالاک سیاسی راہنماؤں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میں نے چالاک کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ یہ تمام سیاسی راہنما، لسانی ہوں یا علاقائی، قومی ہوں یا صوبائی ان سب کی ذاتی زندگیوں کا ان تمام نعروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کے حواریوں اور اس ملک کے حکمران طبقوں کا بھی لسانیت اور علاقائیت سے دور کا واسطہ تک نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے لیے ایسا نظام وضع کر لیا ہے کہ اٹھارویں کیا ایک سو اٹھارویں ترمیم بھی آ جائے اور صوبے خودمختار حکومتیں کیوں نہ بن جائیں ان کی زندگی پر ان کا کوئی اثر تک نہ ہوگا۔ رونا پیٹنا صرف اور صرف غریب عوام کا مقدر بن جائے گا۔

اٹھارویں ترمیم کے بلند بانگ نعروں کی گونج میں صوبوں کو تعلیمی نظام وضع کرنے کی آزادی میسر آئی ہے۔ لیکن اسمبلی کے ارکان، ان کے امیر عزیز و اقارب، بیوروکریٹ، جرنیل، کرنیل سے کپتان تک اور سپریم کورٹ کے ججوں سے لے کر سول ججوں تک سب کے بچے ایسے سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جن پر اٹھارویں کیا ایک سو اٹھارویں ترمیم کا بھی کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے کوئی بھی یا تشدد ارتیں ہو تو اس کے او یا اے لیول کی جانب لے جانے والے سلیبس والے سکول میسر ہیں۔ اس کے بعد وہ گلگت بلتستان چلا جائے یا میرپور خاص اس کو وہاں کے اسکول میں نہ کورس فرق ملے گا اور نہ ہی نظام تعلیم۔ اس لیے کہ صوبائی خودمختاری کا نعرہ تو غریب آدمی سے لیے ہے۔ اشخاص نہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے تحت لیے جانے والے او لیول اور اے لیول سے ہے اور نہ ہی انگریزی ذریعہ تعلیم سے۔ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو وہ قومی زبان اردو ہے۔ اس قومی زبان اردو سے اس قدر دشمنی کیوں ہے؟ یہ سوال اس قدر مضحکہ خیز بن جاتا ہے جب اردو کے خلاف بولنے والے تقریریں بھی اردو میں کر رہے ہوتے ہیں۔ زبانیں اپنی ضروریات اور لوگوں کے درمیان خود بخود بننے والے رابطے سے ترقی کرتی ہیں۔ انھیں کبھی کوئی نافذ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو برصغیر جہاں ہر فرد کو اتالیق فارسی ضرور پڑھاتا تھا، وہاں کی زبان فارسی ضرور ہو جاتی۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ انتہائی جنوب میں چنائی، مشرق میں کلکتہ، شمال میں سارناتھ اور مغرب میں کوئٹہ تک پھیلے ہوئے برصغیر پاک و ہند اگر آپس میں کوئی ایک زبان لوگ رابطے اور سمجھ بوجھ کے لیے آج بھی استعمال کر رہے ہیں تو وہ اردو ہے جسے لاکھ ہندی کہا جائے، اس کی اصل اردو ہی ہے۔ پاکستان میں اٹک کا پل عبور کر کے آنے والے پشتون، رحیم یار خان کے بازار میں آنے والے سندھی، مکران سے کراچی آنے والے بلوچ اور شہروں شہروں گھومنے والے پنجابی کو اگر کوئی زبان بولنا آتی ہے تو وہ اردو ہے۔ ایک اور حیران کن بات یہ کہ وہ ممی ڈیڈی برگر کلاس جیسے بچپن ہی سے نرسری گیتوں کی انگریزی لوریاں ملی ہوتی ہیں، وہ بھی آپس میں اپنی ایک خودساختہ اردو میں گفتگو کرتی ہے جو اب ان کی پہچان بن چکی ہے۔ مدتوں انگریزی ذریعہ تعلیم میں پڑھنے کے باوجود وہ آج تک انگریزی کو ذریعہ اظہار نہیں بنا سکے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کا تصور بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی سے لے کر او لیول یا اے لیول تک کہیں

بھی آپ کو استاد انگریزی زبان میں پڑھاتے یا تشریح کرتے نظر نہیں آئیں گے۔ انھیں بات کو واضح کرنے، ذہن نشین کرانے اور بہترین ابلاغ کے لیے اردو استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی شاعری اور ڈرامے میں موجود اصطلاحات کی گرہیں بھی اردو میں کھولی جاتی ہیں اور یہ کام برسوں سے انگریزی لٹریچر کی کلاسوں میں جاری ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے اور کیٹس کی شاعری کا ابلاغ ایسے ہی ممکن ہے۔ سائنس کی اصطلاحات کو چھوڑ کر اور میڈیسن کے وہ الفاظ جو بیماریوں کے ناموں اور دواؤں وغیرہ سے متعلق ہیں یا پھر قانون میں مروجہ اصطلاحات کو جوں کا توں بولا جاتا ہے باقی ان سب کی تشریح کلاسوں میں اردو زبان میں کی جاتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سائنس، میڈیسن اور قانون کی یہ تمام اصطلاحات بذات خود انگریزی نہیں بلکہ لاطینی اور فرانسیسی ہیں۔ انگریز نے بھی اصطلاحات لے کر ان کی اپنی زبان میں تشریح کی اور ہم بھی وہی کرتے ہیں، لیکن امتحان دینے اور کتابیں لکھنے کے لیے ہم نے انگریزی کو منتخب کیا ہے۔ کتابیں تو ہم لکھ ہی نہیں رہے بلکہ انگریزی کی برآمد کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں مجبوراً امتحان لینے کی زبان بھی انگریزی رکھنا پڑتی ہے۔ یہ زبان کا مسئلہ نہیں، ہماری کام چوری ہے، ورنہ کتاب استاد کے ہاتھ میں انگریزی میں ہوتی ہے اور اسے سمجھانے کے لیے اسے اردو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ منافقت اور دوغلا پن ہماری انتظامیہ اور عدالتی نظام میں ہے۔ ہمارے سامنے روزانہ لاکھوں سائل آتے ہیں۔ اپنا دکھڑا اپنی زبان میں روتے ہیں یا پھر کوئی مسئلہ ہو تو اردو میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان کا انتظامی عہدے پر بیٹھا انگریز کا غلام سول سروس کا آفیسر اسے حکم نامہ انگریزی میں تھماتا ہے۔ یہی حال چھوٹی سی چھوٹی عدالت کا ہے۔ سائل اپنی زبان میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، وکیلوں کو چار فقرے روانی سے انگریزی میں بولنے نہیں آتے لیکن درخواست بھی انگریزی میں لکھتے اور جج فیصلہ بھی انگریزی میں تحریر کرتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کی سب سے بڑی منافقت۔ ہم کس پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں انگریزی لکھنا پڑھنا آتی ہے۔ یقیناً ان بے بس اور مجبور اٹھارہ کروڑ عوام پر۔ مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب وفاق نے سپریم کورٹ میں یہ جواب جمع کروایا کہ اب صدر اور وزیراعظم اردو میں تقریر کریں گے۔ اس سے عوام کا بھلا نہیں ہوگا۔ بھلا اس سے ہوگا جب آپ صرف ایک سطر کا یہ آرڈر کریں گے کہ اگلے لمحے دفتروں میں اردو مستعمل ہوگی۔ پاکستان میں بیوروکریسی کی ننانوے فی صد میٹنگ اردو میں ہوتی ہیں لیکن کارروائی انگریزی میں تحریر کی جاتی ہے۔ جس سول سروس کے آفیسر نے ساری زندگی دفتر میں اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو بولنی ہے اس کا امتحان انگریزی میں کیوں لیا جاتا ہے۔ صرف ایک فی صد کہ سول سروس کا مقابلے کا امتحان اردو میں ہوگا۔ پھر دیکھیے اس ملک کے پبلشرز صرف پندرہ دن میں تمام مواد اردو زبان میں مارکیٹ میں لے آئیں گے اور تمام اشرافیہ اپنے بچوں کو اردو کی لوریاں دینے لگے کہ یہی حکمرانی کا راستہ ہوگا۔ ◆◆◆

غور کرو کہ......

عورتوں سے مشورہ کرنا تباہی ہے اور مفسدوں پر بخشش کرنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے، اور تیز دانتوں والے بھیڑیے پر رحم کھانا دراصل بکریوں کے ساتھ ظلم ہے۔

درس حیات

ا۔ دنیاوی کاموں میں عورتوں سے مشاورت بے برکتی لاتا ہے۔

۲۔ جو فساد برپا کرنے والا ہو اسے معاف کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

(شیخ سعدی شیرازی، انتخاب: سدیم رحمن، لاہور)

ایک مبارک کلمے

بسم اللہ سے آغاز کیجیے



خیر و برکت پانے کا سہل ترین نسخہ

محمد خلیل چودھری

اللہ تعالیٰ کی پاک اور لاریب کتاب قرآن مجید میں آیا ہے: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔'' (سورۃ النمل: ۳۰) ترجمہ: یہ (خط) سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اللہ پاک کے اسم مبارک کے ساتھ آغاز کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔'' گویا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط کا آغاز اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام ہی سے کیا۔

اسی طرح جب حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے چلنے کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا، تو اللہ پاک نے ارشاد فرمایا۔ ''قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۔ (سورۃ ہود: ۴۱) ۔ ترجمہ: اللہ نے فرمایا، اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے، اس کا چلنا بھی ہے اور اس کا رکنا بھی..... گویا کسی بھی ایسے کام کا آغاز کرنا ہو جو جائز ہو، تو اللہ کا نام لینا اور اس سے شروع کرنا انبیا علیہم السلام کی سنت مبارک ہے۔ یوں اس کام میں برکت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی کام کرتے، تو اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف فرمانرواؤں کے نام خطوط لکھے، تو ان کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کے نام ہی سے کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہ بات واضح کرتے ہیں کہ ہر کام کا آغاز اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ترجمہ: ''ہر وہ محتشم کام جس کا آغاز اللہ کی حمد سے نہ ہو، تو وہ ادھورا ہوتا ہے۔'' (ابوداؤد، ج ۲، ۳۰۹)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ کھانے پینے، ذبح کرنے، وضو کرنے، کشتی میں سوار ہونے غرض ہر (صحیح) کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دروازہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو۔ چراغ گل کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو، برتن ڈھانپتے ہوئے بسم اللہ پڑھو اور مشک کا منہ بند کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو۔ (الجامع لاحکام القرآن ۹۸)

امام ابن ماجہ اور امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بنی آدم بیت الخلا میں داخل

ہو، تو اس کی شرمگاہوں اور شیطان کے درمیان بسم اللہ حجاب (پردہ) ہے۔ یعنی بیت الخلا میں جانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لی جائے، تو یہ شیطان اور شرمگاہ کے درمیان ایک پردے کا کام دے گی۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، "لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔ حدیبیہ کا معاہدہ لکھنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ لکھنے کا حکم دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھ لے، تو اس کا سارا جسم پاک ہو جاتا ہے اور جو بسم اللہ نہیں پڑھے گا، اس کے صرف اعضائے وضو پاک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے، تو پہلے بسم اللہ پڑھتے پھر اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے۔

کھانا کھانے سے پہلے بھی بسم اللہ پڑھنے سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے اور آدمی کم کھانے سے بھی سیر ہو جاتا ہے۔ نیز جلد ختم نہیں ہوتی کیونکہ جب آدمی بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا کھائے، تو اس کے کھانے میں شیطان بھی شریک ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بے برکتی ہوتی ہے اور زیادہ کھا کر بھی پیٹ نہیں بھرتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ سے ایک صحابیؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ میں جب بھی کھانا کھاتا ہوں، تو سیر نہیں ہوتا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شاید تم اکیلے کھانا کھاتے ہو؟"

عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہ۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اکٹھے مل کر کھانا کھایا کرو اور بسم اللہ بھی پڑھا کرو۔ تمھارے کھانے میں برکت ہو جائے گی۔"

آج کل جو ہمارے رزق میں برکت نہیں، اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ہم مل کر کھانا نہیں کھاتے اور بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔"

تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ اگر کھانا شروع کرتے وقت کوئی بسم اللہ پڑھنا بھول جائے، تو کھانے کے دوران جب یاد آئے بسم اللہ فی اولہ واخرہ پڑھ لے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے اور بسم اللہ پڑھنا بھول جائے، تو کہے بسم اللہ فی اولہ واخرہ (مشکوٰۃ ص ۳۶۵)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کے کیا فوائد ہیں اور نہ پڑھنے کے کیا نقصانات۔ لہٰذا کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ ضرور پڑھ لینی چاہیے۔ قیصر روم نے ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا کہ اس کے سر میں درد رہتا ہے جس سے افاقہ نہیں ہوتا۔ میرے لیے کوئی دوا بھیج دیجیے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیجی۔ وہ ٹوپی کو پہن لیتا، تو آرام آجاتا۔ ٹوپی اتار دیتا، تو پھر سر درد شروع ہو جاتا۔ وہ حیران ہوا۔ ایک دن ٹوپی کو کھول کر دیکھا، تو اس میں ایک کاغذ موجود تھا جس پر لکھا ہوا تھا: "بسم اللہ الرحمن الرحیم" یعنی بسم اللہ شریف میں اتنی برکت ہے کہ اس کی وجہ سے قیصر روم کا سر درد ختم ہو گیا۔ بلکہ حضرت خالدؓ بن ولید تو بسم اللہ پڑھ کر زہر پی لیتے، تو ان پر زہر کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

فضائل وفوائد بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

☆ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جس کو منظور ہو کہ موکلین دوزخ سے نجات حاصل ہو اس کو بسم اللہ کثرت سے پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ ملائکہ محافظین دوزخ بھی ۱۹ ہی ہیں اور ہر حرف کے مقابلہ میں ایک فرشتے سے نجات ملے گی۔

☆ جو شخص سوتے وقت ۲۱ بار بسم اللہ پڑھے اس رات شیطان سے محفوظ رہے اور چوری اور ناگہانی موت اور

ہر ایک بلا سے محفوظ رہے۔

☆ جب کسی ظالم کے سامنے ۵۰ مرتبہ بسم اللہ پڑھے۔ اس ظالم کے دل میں اس کی ہیبت پیدا ہوگی اور اس کے شر سے محفوظ رہے۔

☆ رزق کے لیے طلوعِ آفتاب کے وقت سورج کے مقابل ہو کر ۳۰۰ مرتبہ درود شریف بھی اتنی بار پڑھے، تو اللہ اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔

☆ کند ذہنی دور کرنے کے لیے ۷۸۶ بار بسم اللہ پانی پر دم کر کے نہار منہ پلائیں، تو ذہن اس کا بہت تیز ہو جائے گا۔

بسم اللہ کے بعض خواص مجربہ

ہر مشکل اور ہر حاجت کے لیے

۱۔ جو شخص بسم اللہ الرحمن الرحیم بارہ ہزار مرتبہ اس طرح پڑھے کہ ہر ایک ہزار پورا کرنے کے بعد درود شریف کم از کم ایک مرتبہ پڑھے اور اپنے مقصد کے لیے دعا مانگے۔ پھر ایک ہزار اور اسی طرح پڑھ کر مقصد کے لیے دعا کرے۔ اسی طرح بارہ ہزار پورے کر دے، تو ان شاء اللہ ہر مشکل سے نجات اور ہر حاجت پوری ہو۔

۲۔ بسم اللہ کے حروف کے عدد ۷۸۶ ہیں۔ جو شخص اس عدد کے موافق سات روز تک متواتر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرے اور اپنے مقصد کے لیے دعا کیا کرے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مقصد پورا ہوگا۔

تسخیر قلوب

جو شخص بسم اللہ الرحمن الرحیم چھ سو مرتبہ لکھ کر اپنے پاس رکھے، تو لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت و عزت ہوگی۔ کوئی اس سے بدسلوکی نہ کرسکے گا۔

حفاظت از آفات

جو شخص محرم کی پہلی تاریخ کو ایک سو تیرہ مرتبہ پوری بسم اللہ الرحمن الرحیم کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھے، ہر طرح کی آفات و مصائب سے محفوظ رہے گا۔

چوری اور شیطانی اثرات سے حفاظت

سونے سے پہلے ۲۱ مرتبہ پڑھے، تو چوری اور شیطانی اثرات سے اور اچانک موت سے محفوظ رہے۔

ظالم پر غلبہ

کسی ظالم کے سامنے پچاس مرتبہ پڑھے، تو اللہ تعالیٰ اس کو مغلوب کر کے اس کو غالب کر دیں گے۔

ذہن اور حافظہ کے لیے

۷۸۶ مرتبہ پانی پر دم کر کے طلوع آفتاب کے وقت پیے تو ذہن کھل جائے اور حافظہ قوی ہو جائے۔

حفاظت اولاد

جس عورت کے بچے زندہ نہ رہتے ہوں، وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۶۱ مرتبہ لکھ کر تعویذ بنا اپنے پاس رکھے، تو بچے محفوظ رہیں گے۔ مجرب ہے۔

کھیتی کی حفاظت اور برکت کے لیے

۱۰۱ مرتبہ کاغذ پر لکھ کر کھیت میں مخصوص جگہ دفن کر دے، تو کھیتی تمام آفات سے محفوظ رہے اور اس میں برکت ہو۔

حکام کے لیے

بسم اللہ الرحمن الرحیم کسی کاغذ پر ۵۰۰ مرتبہ لکھے اور اس پر ۱۵۰ مرتبہ بسم اللہ پڑھے۔ پھر اس تعویذ کو اپنے پاس رکھے، تو حکام مہربان ہو جائیں۔ اور ظالم کے شر سے محفوظ رہے۔

درد سر کے لیے

اکیس (۲۱) مرتبہ لکھ کر درد والے کے گلے میں یا سر پر

باندھ دیں، تو وہ مر جاتا ہے۔

☆ اگر کوئی شخص دنیا و آخرت کے مصائب سے بچنا چاہے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کا کثرت سے ورد کرے۔

☆ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک مرتبہ پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں دس ہزار نیکیوں کا ثواب درج کرتا ہے۔ دس ہزار گناہ محو ہو جاتے ہیں اور دس ہزار درجات بلند ہوتے ہیں۔

☆ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۷ مرتبہ کفن پر لکھ دیا جائے، تو میت عذاب قبر سے محفوظ رہے گی اور منکر و نکیر سوال کرنے میں سختی نہ کریں گے۔

☆ ۲۱ مرتبہ بسم اللہ پڑھنے کے سبب چوری، آگ، ناگہانی موت، بیماری اور ہر قسم کی آفت و بلا سے حفاظت نصیب ہوگی۔

☆ ۳۵ مرتبہ بسم اللہ لکھ کر گھر میں لٹکا دی جائے، تو شیطان و جن اس گھر میں داخل نہ ہو سکیں۔

ہر ضرورت اور مشکل کے لیے

بعد نماز سنت فجر اگر کوئی شخص بسم اللہ ۹۰ بار اوّل آخر گیارہ مرتبہ درود شریف ہمیشہ ورد میں رکھے، ان شا اللہ کبھی کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ جب بھی ضرورت کے وقت پڑھے گا، ہر مقصد میں کامیابی اور مشکل آسان ہوگی۔

مالی پریشانی سے بچنے کے لیے

اگر ہر نماز کے بعد سورۃ فاتحہ بسم اللہ سمیت ۴۱ مرتبہ پابندی کے ساتھ پڑھ لیا کریں، تو آپ کبھی بھی مالی پریشانی سے دوچار نہیں ہوں گے۔

◆◆●

زبان کی حفاظت

زبانیں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اردو داں افراد کے لیے عربی بالکل حلوہ ہے کیونکہ ہمارے ستر فیصد سے زائد الفاظ اسی زبان سے آئے ہیں۔ عربی گرامر سے کچھ واقفیت ہو جائے، تو پھر اچھی خاصی عربی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کوشش کیجیے قرآن مجید کی عربی ضرور سیکھیں۔ کیا ہم اپنے پیارے خالق، سب سے بہترین دوست، مددگار اور راہنما سے اس کی زبان میں بات نہیں کرنا چاہتے؟ ہم اہتمام سے اس کے گھر جاتے اور ادب سے کھڑے ہو کر ہدایت مانگتے ہیں۔ لیکن جب وہ قرآن حکیم کے ذریعے ہمیں ہدایت دیتا ہے، تو ہم گونگے، بہرے اور اندھے بن جاتے ہیں۔ یہ کتنی حیرت اور بے وقوفی کی بات! صبر اور نماز طاقت کے دو عظیم سرچشمے ہیں، تو پھر ہم طاقتور کیوں نہیں بن جاتے؟

زندہ قومیں اپنی زبان کی حفاظت کرتی جبکہ مردہ احساس کمتری کی ماری ہوتی ہیں۔ اردو میں عربی کے بعد سب سے زیادہ اور عمدہ لٹریچر موجود ہے۔ اردو چھوڑ کر ہم نے اپنی نئی نسل کی جڑیں فخریہ طور پر کاٹ دی ہیں۔ جاپان، فرانس، اسپین، چین، جرمنی وغیرہ میں کہیں انگریزی نظر نہیں آتی۔ ترکی جو آئی ایم ایف کی غلامی سے نکل آیا ہے، وہاں ترک آپس میں ذرا انگریزی بول کر تو دکھائیں۔ دنیا کے ایک بڑے دانشور اور فلسفی شاعر اقبال بھی ہمارے پاس ہیں، جس پر حسن نثار جیسے صحافی کو ندامت ہے! اپنی جڑیں کٹوا اور اپنے شاندار ترین ماضی کو فراموش کر کے ہماری نئی نسل ہوا میں اڑ رہی ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں اور کنفیوژڈ ہیں۔

(ڈاکٹر انوار الحق، اسلام آباد)

نیکی و بدی آمنے سامنے

مالکؒ بن دینار اور ایک یہودی

انسان کو کامل مومن بنانے والے تیر اثر سبق آموز واقعات

پروفیسر خالد پرویز

ان کے پاس ذاتی گھر نہیں تھا اس لیے کرائے کے مکان میں رہائش رکھتے تھے۔ مگر کرائے کا مکان بھی کسی نہ کسی وجہ سے اکثر بدلنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کی وسیع و عریض زمین میں آپ یہاں توکل بہاں۔ ایک دفعہ ایک جگہ گھر لیا تو ساتھ کا ہمسایہ یہودی تھا۔ وہ اسلام دشمن تھا اور خاتم المرسلین ﷺ کے نام لیواؤں کو تنگ کر کے خوشی محسوس کرتا۔ وہ دن اس کے لیے عید کا دن ہوتا تھا جب کسی سچے اطاعت گزار، اللہ کے پرہیزگار اور عاشق احمد مختار ﷺ کو ایذا پہنچاتا۔

جب یہودی نے دیکھا کہ ہمسائے میں ایک نیا کرایہ دار آیا ہے تو اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کا نیا ہمسایہ اللہ کا پیارا اور وقت کا ولی ہے تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ کون سا ایسا حربہ استعمال کروں کہ یہ مومن پرہیزگار یہ مکان چھوڑ جائے۔ سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے اپنے مکان کی چھت سے ایسا پرنالہ لگوایا جس کا منہ ہمسائے کے صحن میں کھلتا تھا۔

پرنالہ لگوانے کے بعد یہودی روزانہ اپنے دین دار ہمسائے کے گھر پرنالے کے ذریعے نجاست پھینکنے لگا۔ وہ مدت تک ایسا کرتا رہا۔ اس انتظار میں رہا کہ شکایت کرے تو پھر اس طرح لڑائی کروں گا اور یوں مالک مکان سے کہہ کر اسے یہاں سے نکلوا دوں گا۔ مگر اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔

آخر کار یہودی نے تنگ آ کر خود ہی اپنے ہمسائے سے پوچھا "آپ کو میرے پرنالے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

یہ سوال سن کر ہمسایہ مسکرایا اور بولا "تکلیف تو ہوتی ہے مگر میں نے ایک ٹوکری اور جھاڑو کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ جو نجاست آپ کے پرنالے سے میرے گھر گرتی ہے، اسے میں روزانہ صاف کر دیتا ہوں۔"

یہودی نے پوچھا "آپ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو غصہ نہیں آتا؟"

نیک دل صاحب ایمان ہمسائے نے جواب دیا: "میرا پروردگار ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو غصہ پی جاتے اور دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں۔"

یہودی نے جیسے ہی یہ جواب سنا تو اس کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "اے مالک بن دینارؒ! جو دین ایسی اچھی تعلیم دیتا ہے، اس کو میں ابھی

لیے قبول کرتا ہوں۔ رب رحمٰن و رحیم سے اپنے گناہوں کی معافی کا طلب گار ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہوں۔"

ایک انوکھا تحفہ

ایک انسان کی غیر موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا، ذات پر کیچڑ اچھالنا، بدگمانی کا اظہار کرنا اور اس کے بارے میں ناپسندیدہ بات کرنا غیبت کہلاتا ہے۔ غیبت ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ غیبت کرنے والا جھوٹ کی سیاہ مٹی سے ایسا گھروندہ تیار کرتا ہے جو وقتی طور پر خوبصورت لگتا اور ٹھوس بھی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اس کی بنیادیں بدنیتی پر استوار ہوتی اور دیواریں بدظنی کی کھوکھلی اینٹوں سے تعمیر کی جاتی ہیں اس لیے سچ کی بارش کا ایک قطرہ ہی انھیں زمین بوس کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ غیبت کرنے والے کو سوائے افسوس، پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اسی طرح کا ایک غیبت گو حضرت حسن بصریؒ کے دور میں بھی موجود تھا۔ اس کا ہر لمحہ اور ہر لحظہ دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی میں گزرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی برائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس کرتا۔ ایک ساعت ایک مقام پر تو دوسری ساعت دوسرے مقام پر گزارتا۔ جو کوئی سنتا کہ اس نے یہ کچھ کہا ہے، تو غم زدہ ہو کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے اور کچھ خاموش ہو کر رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصریؒ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ پھر مریدین نے حضرت حسن بصریؒ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کے متعلق ایسی ایسی باتیں بناتا پھر رہا ہے۔

اللہ کے ولی کے ہر کام کا اپنا جدا انداز اور منفرد طریقہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے سنا تو فوراً ایک مرید کو آواز دی۔ وہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمائیے جناب! کیا حکم ہے؟"

حضرت حسن بصریؒ نے کہا "یہ لو پیسے، انھیں جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ۔ وہاں سے تازہ و اعلیٰ چھوہاروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔"

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھوہاروں کا ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے چھوہاروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص سے کہا "یہ طباق اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا پھرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حسن بصریؒ نے آپ کے لیے بھیجا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا از حد شکرگزار اور ممنون ہوں کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔"

مرید خاص نے حضرت حسن بصریؒ کے حکم کی تعمیل میں آپ کا پیغام اور چھوہاروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت حسن بصریؒ کے قول و فعل سے از حد متاثر اور اپنے کیے پر شرمندہ و نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: "اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو۔ بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

کڑوے خربوزے کی مٹھاس

آقا اور غلام کا رشتہ حاکم و محکوم کا ہوتا ہے۔ آقا کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر غلام ہر وقت خدمت کے لیے تیار رہتا ہے۔ مگر بعض غلام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ظاہری خوبیوں، باطنی خاصیتوں اور عملی خوبصورتیوں کے باعث آقا کے دل میں اپنا

مقام پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں غلام کی قدر و منزلت وزرا اور اکابرین سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ غلام کا ہر عمل لائق تحسین اور باعث آفرین ٹھہرتا ہے۔ غلام بھی اپنے ہر فعل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ آداب غلامی سے نہ صرف واقف بلکہ انھیں اپنی عقل و خرد کے بل بوتے پر برتنے کے فن میں بھی کمال رکھتا ہے۔

ایسا ہی ایک غلام ایک بادشاہ کے دربار میں شاہی خدمت پر مامور تھا۔ بادشاہ اپنے غلام کی عقل و دانائی سے ازحد متاثر تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے جب بادشاہ اپنے شاہی غلام کی تعریف بھرے دربار میں بڑے فخر سے کیا کرتا۔

ایک دفعہ ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ کافی منزلیں طے کر کے بادشاہ سے ملاقات کو پہنچا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک خربوزہ پیش کیا۔ بادشاہ نے سوغات قبول کی اور اپنے مخصوص غلام کو آواز دی تاکہ خربوزہ اسے کھلا سکے۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ کوئی چیز اس مخصوص غلام کو کھلائے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ مگر وہ غلام دربار میں موجود نہیں تھا چنانچہ ایک نوکر روانہ کیا گیا کہ وہ شاہی غلام کو بلا لائے۔

بادشاہ کا پیغام ملتے ہی شاہی غلام حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمائیے آقا! میرے لائق کوئی خدمت!"

بادشاہ نے کہا "ادھر میرے قریب آؤ۔"

مقرب غلام اپنے آقا کے قریب گیا۔ بادشاہ نے تحفے میں آیا خربوزہ اٹھایا اور ایک قاش کاٹ کر غلام کو کھانے کے لیے دی۔ غلام نے انتہائی رغبت اور چاہت کے ساتھ وہ قاش کھائی اور الحمدللہ کہا۔ غلام کی پسندیدگی دیکھ کر بادشاہ نے ایک اور قاش کاٹی اور غلام کو دی۔ اس نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوشی اور مسرت کے ساتھ کھایا اور رب کا شکر ادا کیا۔ اسی طرح بادشاہ نے اپنے منظور نظر غلام کو خربوزے کی ایک ایک قاش کاٹ کر دی جسے وہ مزے لے لے کر کھاتا گیا۔

آخر خربوزے کی ایک قاش بچ گئی۔ بادشاہ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جس خربوزے کو غلام اتنی خوشی اور شادمانی سے کھا رہا تھا، آخر وہ کس قدر عمدہ اور لذیذ ہو گا، آخری قاش منہ میں ڈال لی۔ لیکن چکھتے ہی اگل دیا کیونکہ وہ بڑی تلخ، کڑوی اور انتہائی بدمزہ تھی۔

اب بادشاہ نے اپنے مقرب غلام سے کہا "مجھے ازحد حیرانی ہے کہ تم اتنا کڑوا اور زہر کے مانند خربوزہ کھاتے رہے اور یہ نہ کہا کہ یہ کھانے کے قابل تو کیا چکھنے کے قابل بھی نہیں۔"

گردش زمانہ کے ہاتھوں بنے غلام مشہور زمانہ شخصیت، لقمان نے دست بستہ عرض کی "بادشاہ سلامت! آپ مجھے انتہائی محبت و شفقت کے ساتھ کھلا رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ آپ کی خوشی کو بدمزگی میں بدل دوں۔ مزید یہ کہ میں نے آپ کے ہاتھوں ہزاروں انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ نعمتیں کھائی ہیں۔ اگر آج ایک تلخ چیز کھانے کو مل گئی تو یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے کھانے سے انکار کر دوں اور محض خربوزے کی کڑواہٹ کے باعث آپ کے حکم کی بجا آوری کے بجائے حکم عدولی کروں۔"

آئیے اپنے آپ سے سوال کریں کہ کیا ہم اپنے مالک حقیقی کی ہزاروں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی کبھار کسی چیز میں ہلکی سی کڑواہٹ محسوس کریں تو شکوہ و شکایت پر تو نہیں اتر آتے؟

آخر یہ شخص کون تھا؟

جیسے ہی ان کے دل میں خدا خوفی اور دماغ میں نجات بخردی کا سودا سمایا، دنیاوی تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر محل سے رات کی تاریکی میں لوگوں سے چھپتے چھپاتے نکل پڑے۔ لباس فاخرہ اتار پھینکا۔ غلاموں کے سے کپڑے زیب تن کیے اور مزدوری کی تلاش میں سفر کا آغاز کیا۔ وضع قطع اور چال ڈھال ایسی اختیار کی کہ کوئی نہ پہچان سکا کہ یہ وقت کا بادشاہ ہے۔

رب کی ذات روزی رساں ہے۔ آخر ایک شخص نے انھیں اپنے باغ کی نگرانی اور نگہبانی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ ملازمت ملتے

پر رب رحمن و رحیم کا شکر ادا کیا اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف و مشغول ہو گئے۔ جیسے ہی کوئی لمحہ فارغ پاتے، رب ذوالجلال کی تسبیح و تحمید میں گزارتے۔

باغ کے مالک کو قطعاً یہ علم نہ ہو سکا کہ جس شخص کو اس نے باغ کی خدمت و حفاظت پر مامور کیا ہے، وہ بادشاہ وقت ہے۔ ایک روز مالک باغ کی سیر کو آیا۔ نئے ملازم سے کہا "جاؤ کوئی میٹھا انار توڑ لاؤ۔ آج انار کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

وہ دوڑے گئے۔ ایک درخت سے انار توڑ لائے اور مالک کی خدمت میں پیش کیا۔ مالک نے اسے چکھا، تو وہ کھٹا نکلا۔ مالک نے ان سے کہا "میں نے تمھیں کھٹا نہیں میٹھا انار لانے کو کہا تھا۔ جاؤ کوئی دوسرا میٹھا انار لے آؤ۔"

وہ دوڑے گئے اور تیزی سے ایک اور انار توڑ لائے۔ اسے کاٹا گیا۔ مالک نے چکھا، تو وہ بھی کھٹا ہی تھا۔ مالک نے کہا "اچھا سا انار لاؤ جو میٹھا اور لذیذ ہو۔ اب تیسری دفعہ بھی کھٹا انار لے کر آ گئے ہو۔"

وہ مالک کے حکم پر پھر باغ میں گئے۔ مختلف درخت دیکھتے ہوئے ایک خوبصورت سا انار لے آئے جو ان کی دانست میں ضرور میٹھا ہونا چاہیے تھا۔ مالک نے کہا "اسے کاٹو اور پیش کرو۔"

انھوں نے انار کاٹا اور مالک کو پیش کیا۔ مالک نے اس خوشی میں کہ انار میٹھا ہو گا، ڈھیر سارے دانے منہ میں ڈالے مگر یہ کیا! یہ انار بھی کھٹا ہی نکلا۔ اس نے انار کے دانے منہ سے نکال باہر پھینکے اور جھنجھلا کر بولا "میں نے تمھیں اس لیے تو ملازم نہیں رکھا کہ کوئی میٹھا انار بھی نہ پیش کر سکو۔ تمھیں یہاں باغ میں رہتے ہوئے اتنے دن گزر گئے مگر تمھیں اتنا بھی پتا نہ چلا کہ انار میٹھا کون سا ہے اور کھٹا کون سا؟ کوئی انار چکھ کر دیکھا ہوتا! آخر تم کیسے ملازم ہو۔"

انھوں نے مالک کی یہ بات سنی تو بولے "جناب عالی! آپ نے مجھے نگرانی و حفاظت کے لیے باغ میرے سپرد کیا ہے۔ میرے اس کام میں کوئی کمی ہو تو بتائیے۔ تاہم میرا یہ کام نہیں کہ جس چیز کی حفاظت کے لیے مجھے مقرر کیا گیا ہے، اس کو چکھتا اور کھاتا پھروں۔"

مالک نے ملازم کا یہ جواب سنا، تو حیران ہو کر بولا "واہ سبحان اللہ! اتنے پرہیزگار اور متقی! آپ تو ایسے بن رہے ہیں جیسے ابراہیم ادھم ہوں۔"

باغ کے ملازم حضرت ابراہیم بن ادھم نے مالک کے منہ سے جیسے ہی اپنا نام سنا، تو فوراً اس اندیشے سے باغ سے نکل آئے کہ کہیں پہچان نہ لیا جاؤں۔ مالک حیران و پریشان یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ شخص کون تھا؟ ◆◆◆



بلبل کا گانا

جرمنی کے محققین نے انکشاف کیا ہے کہ نر بلبل اپنے سریلے نغموں کی مدد سے مادہ بلبل کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان نغموں کے ذریعے اپنی صلاحیتیں سامنے لاتا ہے۔ بین الاقوامی سائنسی جریدے "بی ایم سی ایولوشنری بائیولوجی" میں شائع ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق اسی فیصد پرندوں میں اولاد کی پرورش میں نر کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ مادہ کو انڈے سینے کے دوران کھانا کھلاتا اور گھونسلے کو دوسرے شکاری پرندوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

پرندوں میں آواز نکالنے کا نظام بہت ترقی یافتہ ہے۔ وہ آپس میں بامعنی گفتگو کرتے اور اپنی بات آسانی سے دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پرندے آوازیں سیکھتے، انھیں یاد رکھتے اور ضرورت پڑنے پر اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلبل میں عام طور پر ۱۸۰ چھوٹے چھوٹے گانے دہرانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بلبل اپنے گیتوں میں جھنجھناہٹ کی ۲۵۰ الگ الگ آوازیں، الاپ اور سیٹیاں بھی شامل کرتا ہے۔



قابل رشک حیات کا مالک

احمد مسلیؒ

ایک دلیر مسلمان کی مثالی سرگزشت جس نے نوجوانی میں نابینا ہونے کے باوجود کئی بینا افراد سے زیادہ بامقصد و بھری پری زندگی گزاری

میاں محمد اکرم رانجھا

ہمارے ہیرو کا تعلق صوبہ پنجاب کی شاید سب سے بڑی مسلم شیخ برادری سے ہے۔ وہ سب سے زیادہ محنت کرتی ہے لیکن کم سے کم کھانا اس کے نصیب میں ہے۔ پنجاب زرعی لحاظ سے سونے کی چڑیا ہے۔ کنو، تربوز، خربوزہ، گندم، چاول اور کپاس یہاں کی جانی پہچانی فصلیں ہیں۔ پنجاب کی زرعی زمین مخصوص قبائل کی ملکیت ہے۔ اسی لیے ان قبائل کے گھروں میں دولت کی ریل پیل ہے۔ مگر فصلیں پیدا کرنے والی مسلم شیخ برادری کے ہاتھ عام طور پر خالی رہتے ہیں۔

احمد مسلی پانچ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھا۔ وہ ساڑھے چھے فٹ کا لمبا تڑنگا اور خوبصورت نوجوان نکلا۔ حسن، نیک دلی اور شرافت کا مایہ تھا۔ لطیفہ گو اور حس مزاح اتنی کہ اس کے قہقہے تھمتے ہی نہ تھے۔ جدھر سے گزر جاتا لڑکیاں اس کی راہ تکتیں لیکن حیرت کی بات کہ وہ صف اول کا نمازی تھا۔ خواتین کے سامنے نیچی نظر رکھنا اس کی عادت ثانیہ تھی۔

مسلم شیخ برادری کے مردوں کی رنگت عام طور پر سیاہی مائل اور سانولی ہوتی ہے لیکن احمد مسلی کا باپ شانہ مسلی اور اس کی والدہ مہراں (مہر بی بی) گورے چٹے اور بے حد خوبصورت جوڑا تھے۔ اس لیے ان کی اولاد بھی حسین نکلی۔ یہ خاندان خوب سیرت اور نفیس بھی تھا۔ گاؤں بھر میں ان کے اچھے اخلاق کا چرچا تھا۔ خصوصاً احمد مسلی ہر کسی کا دکھ بانٹنے پر ہر وقت تیار رہتا۔ ان دنوں ایمبولینس اور کاریں کم دستیاب تھیں، اس لیے مریضوں کو چارپائیوں پر بھلوال اور منڈی پھلروان لے جانا پڑتا۔ چارپائی اٹھا کے جانا احمد مسلی کا وتیرہ تھا۔ یہ مشکل کام انجام دینے کے لیے وہ ہمیشہ صف اول میں پایا جاتا۔

احمد مسلی کی شادی نوعمری ہی میں اپنی ماموں زاد سے ہو گئی جس کے بطن سے تین خوبصورت بیٹیاں تولد ہوئیں۔ لوگوں نے گمان کیا کہ معاشرتی روایت کے مطابق بیٹیاں جنم لینے پر باپ برا منائے گا لیکن حیرت کی بات ہے، احمد نے ان کو ماں سے بھی بڑھ کر پیار دیا۔ وہ انھیں کندھوں پر بٹھا کر

گاؤں کی گلیوں میں پھرتا اور خوشیوں سے نہال ہوا رہتا۔

احمد مسلّی کو پنجابی شاعری سے خاص شغف تھا۔ خصوصاً میاں محمد بخش کے اشعار اسے بے حد پسند تھے۔ وہ ان شعروں کو لمبی تان میں الاپتا۔ اس کا خوبصورت ترنم سماں باندھ دیتا۔

اے ملک سلطان حسن دی نگری رہے راج سلامت تیرا
میں پردیسی درد رنجانا تے عدل کریں کجھ میرا

احمد اپنی مخصوص اور پرسوز لَے کے ساتھ حقیقی اور مجازی نظریۂ توحید کو یوں واضح کیا کرتا۔

تیرے جیہا میتوں ہور نہ کوئی میرے جیہاں تینوں لکھاں

اور پھر خود ہی اس توحیدی مصرعے کی وضاحت کرتا کہ باری تعالیٰ تو واحد ہستی ہے (قل ھواللہ احد) جو میرا محبوب ہے جبکہ میری طرح کے لاکھوں کروڑوں بندے تیرے حضور میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔

احمد مسلّی میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن افسوس کہ اس کا دورِ عروج بہت مختصر تھا۔ میں یونیورسٹی لاہور میں طویل عرصہ مصروف رہا۔ ایک بار واپس گاؤں گیا، تو یہ روح فرسا خبر ملی کہ احمد مسلّی صرف تیس سال کی عمر میں نابینا ہو گیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ صف اول کا نمازی، سارے گاؤں کا خدمت گزار، تین ننھی منی بیٹیوں کا باپ اور جوان جہان بیوی کا شوہر عین جوانی میں اندھا ہو گیا۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو گا؟ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اگلی صبح میں نے اس سے ملاقات کی اور روتے ہوئے اظہارِ افسوس کیا۔ میں حیران رہ گیا جب میں نے اس کی بے نور آنکھوں میں آنسو دیکھے لیکن رخساروں پر سرخی اور خوبصورت ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی دیکھی۔ میرے اظہارِ غم پر وہ مطمئن لہجے میں بولا "میاں رانجھا، میں راضی برضا ہوں۔ اس نے آنکھیں بطور امانت دی تھیں، اسی نے واپس لے لیں۔ اس میں افسوس کی کون سی بات؟ افسوس تب ہوتا کہ وہ میری ملکیت ہوتیں اور کوئی دوسرا لے لیتا۔"

میں نے بات بڑھائی "تیس سال کی بھرپور جوانی میں آنکھوں کا بے نور ہو جانا بہت بڑا حادثہ ہے۔ میں پریشان ہوں کہ تمھاری پہاڑ جیسی زندگی اب کیسے گزرے گی؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ایک مہینا پہلے میں آنکھوں والا تھا، لیکن پھر یہ حادثہ ہو گیا، تو میں نے سوچا، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں کیا کر سکتا ہوں جبکہ یہ فیصلہ اس حاکمِ مطلق کا ہے جس کے حکم سے سمندر کھودے اور ہمالیہ جیسے پہاڑ بنائے گئے۔ میرے لڑکپن میں قریبی گاؤں ریڑ کا بالا میں سید عطا اللہ شاہ بخاری جلسے میں تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ سمندروں میں پانی اور ہمالیہ کے پتھر جنم لینے کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ نہ کوئی سائنس دان اس کی وضاحت کر سکا اور نہ کوئی جغرافیہ دان اس کی وجہ بیان کر پایا۔ سوائے اس کے کہ اللہ نے کُن کہا اور سب کچھ وجود میں آ گیا (کُن فیکون)

"میاں رانجھا! یہ اسی کی رضا ہے اور اس پر راضی رہنا ہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اب صبر اور حوصلے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ میں نے دو ہفتے روتے دھوتے میں بسر کیے، پھر ایک روز صبح نماز فجر باجماعت ادا کی اور اپنا آئندہ لائحہ عمل اس طرح تشکیل دیا۔ دیکھو احمد! تم غلام ہو اس آقا کے جو بڑا ہی بے نیاز ہے اور اس کے فیصلوں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ جب تک اس نے چاہا تمھاری آنکھیں سلامت رہیں، اب اس کا فیصلہ ہے کہ باقی زندگی تم بغیر دیکھے بسر کرو۔ تو تمھیں اس پر راضی ہو جانا اور ہاتھ باندھ کر اس کے فیصلے کو قبول کر لینا چاہیے۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نے رونا دھونا چھوڑ دیا ہے۔

"آج چالیس دن ہو گئے ہیں، نمازوں میں میری ایک تکبیر تحریمہ بھی قضا نہیں ہوئی اور یہ مالک کی بہت بڑی نعمت ہے جو مجھے حاصل ہوئی۔ اللہ درجات بلند فرمائے سید عطا اللہ شاہ بخاری کے، انھوں نے مالاند جلسے میں بتایا تھا، حضور نبی کریمؐ کی حدیث ہے کہ جس شخص کی دونوں آنکھیں بے نور ہو

گئیں اس پر جنت واجب ہو گئی۔ گویا یہ خوش خبری مجھ گناہگار کے لیے ہے۔ دعا کریں میں اپنی معصوم بچیوں کا کفیل بنا رہوں، انھیں پال پوس کر ان کی شادیاں کر دوں اور اس طرح جنت الفردوس میں حضورؐ کا پڑوسی بن جاؤں۔ مجھے فخر ہے ان آنکھوں پر جو میرے نصیبوں میں تھیں مگر ختم ہو گئیں اور ان کے بدلے مجھے یہ خوش خبریاں مل رہی ہیں۔''

تیس سال۔ ہمارا یہ اندھا پیر صوم و صلوٰۃ کا صدا پابند رہا۔ سر پر گندم، دھان کی گٹھڑی اٹھائے کھیت کھلیان میں آتا جاتا۔ اس نے جوں توں کر کے تین بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کیے اور اسکے تیس سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ بروز بدھ یکم فروری 2015ء کو وہ مجھے ملنے آیا۔ اب وہ چھڑی لے کر چل پھر لیتا تھا۔

میں نے اسے دیکھا تو یہ سوچ کر بہت دکھ ہوا کہ ہمارا یہ پیر و پچاس سال سے دھکے کھا رہا ہے اور اب ادھیڑ عمر ہو چکا۔ اب یہ بیمار ہوا تو اسے کون سنبھالے گا، کون علاج کرائے گا اور جب یہ قبر کی منڈیر چھوڑ کے گا تو کون اس کا وارث ہو گا؟

میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو وہ کھل کر مسکرایا اور کہا ''میاں راجھا زندگی کے باقی دن پتنی بجاتے گزر جائیں گے۔ میرا کوئی لاوارث نہیں، کائنات کا والی میرا وارث ہے۔ کل پرسوں جمعہ ہے۔ صاف شفاف کپڑے پہن کر پڑھیں اور اپنے خالق و مالک کی رضا و شکر گزاری کرتے کرتے اس کے دربار میں حاضری دیں گے۔''

وہ بدھ کا دن تھا اور یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ جمعرات کا دن خیریت سے گزر گیا۔ میں جمعۃ المبارک کو نماز فجر پڑھنے کی تیاری کر رہا تھا جب مسجد کا لاؤڈ اسپیکر کھلا اور اعلان ہوا کہ رات کو حافظ احمد (یعنی نابینا احمد) قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ اس کی نماز جنازہ نماز جمعے کے بعد جامع مسجد میں ادا کی جائے گی۔

میں اس روز بیمار تھا۔ حالات کی وجہ سے قبرستان نہ جا سکا۔ البتہ وہ دن پہلے والی ملاقات کی یادیں تازہ کرتا رہا۔ لوگوں نے بتایا کہ آج کے سوا حافظ احمد کا کوئی جمعہ قضا نہیں ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس غریب مسکین پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بشارتیں وارد ہوئی ہیں: اول اس نے جوانی میں بینائی کھو کر تیس سال اسی حالت میں بسر کیے۔ دوم تین بیٹیوں کی پرورش کر کے ان کی شادیاں کیں اور انھیں عزت سے رخصت کیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مجھے یوں لگا کہ فرشتوں نے اسے محبت سے اٹھایا اور لحد میں اتار دیا۔ واہ کس قدر قابل رشک ہے زندگی احمد مسکین کی!

◆◆◆

بڑھاپا

رخصت ہو جوانی تو پھر آتا ہے بڑھاپا
آ کر کبھی واپس نہیں جاتا ہے بڑھاپا
رعشہ کبھی، کھانسی کبھی، لقوہ، کبھی فالج
اک جان کو سو روگ لگاتا ہے بڑھاپا
دو گام بھی چلنا ہو تو ڈھونڈے ہے سہارے
محتاج زمانے کا بناتا ہے بڑھاپا
اک پل کو بھی چین آتا نہیں صبح سے شام تک
سو سو طرح انساں کو ستاتا ہے بڑھاپا
نیند آتی ہے شب کو نہ گزرتا ہے کڑا دن
انسان کو ہر آن رلاتا ہے بڑھاپا
فکر اس کی جوانی میں ہی کر لینا ہے بہتر
صدیوں سے سبق ہم کو پڑھاتا ہے بڑھاپا
صحت کے اصول آج جو اپناؤ گے یارو
جب آئے گی پیری تو صلہ پاؤ گے یارو

(سرور انبالوی، انتخاب: محمد خلیل چودھری، دینہ)

عالم دین، فقیہ اور امام وقت

حضرت عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بن مبارک

علم، شجاعت اور سخاوت میں یکتا نامور بزرگ کا قصہ حیات

مولانا محمد مجیب الرحمٰن



آپ کا نام عبداللہ اور والد کا ابن مبارک تھا۔ والد ترکی النسل تھے جو نوجوانی میں مرو (خراسان) چلے آئے۔ وہیں آپ کی ۷۲۶ء میں پیدائش اور ۷۹۷ء میں وفات ہوئی۔ آپ کا قیام کافی بڑے شہر میں تھا۔ (البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۹۱)

توصیفی کلمات

ایک شخصیت کی اہمیت کا اندازہ قائم کرنے میں ہم عصروں کے تاثرات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مشہور صوفی و بزرگ فضیل بن عیاض ابن مبارک کی تعریف میں یوں گویا ہیں: "ان جیسا کوئی میرا نائب نہ ہو سکا۔" عبدالرحمٰن ابن مہدی مشہور رواۃِ حدیث میں سے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "میں نے ابن مبارک جیسا اس امت کا خیرخواہ نہیں دیکھا۔"

مورخ و مفسر قرآن ابن کثیر الدمشقی نے ان کے اوصاف کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: "ایک جانب ابن مبارک علم فقہ کے ماہر، تو دوسری جانب علم کے بحرِ بے کراں ہیں۔ ساتھ ہی امت کے لیے بے پناہ مال لٹانے والے سخی ہیں۔ اس سے بڑھ کر شجاعت و بہادری میں بے مثال مظاہرہ کرنے والے مجاہد بھی ہیں۔ ان میں خیر کی کئی خصلتیں جمع کر دی گئی تھیں۔" (البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۹۱) ابن مبارک کی طرزِ زندگی دیکھ کر سفیان ابن عیینہ کہتے تھے "میری زندگی کا کم از کم ایک سال ابن مبارک کی طرح گزر جائے، حالانکہ تین دن بھی ایسے نہیں گزر سکتے۔"

شجاعت و بہادری

عبداللہ ابن مبارک کے ذاتی اوصاف میں سب سے اہم ترین خوبی یہ تھی کہ موت سے بے خوف و خطر ہو کر شوقِ شہادت میں میدانِ جہاد کی طرف رواں دواں ہوتے، اور بنفسِ نفیس جہاد میں شرکت کرتے۔ نہایت ہی بہادری کا مظاہرہ فرماتے۔ عموماً

علم کی دولت ہاتھ آجانے کے بعد انسان نسل مندی اور سستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر مال بھی آجائے تو خود کو بقیہ تمام چیزوں سے ماورا شمار کرتا ہے۔ لیکن ابن مبارک کی یہ امتیازی خوبی تھی کہ مال و دولت کے ڈھیر لگے ہونے اور علم جیسی عظیم ترین نعمت ہاتھ آنے کے باوجود وہ میدان جنگ سے اپنے آپ کو مستغنی نہ سمجھتے۔

ایک جنگ میں دشمنوں کی صفیں تیار ہو گئیں۔ ادھر مسلمان بھی تیار تھے؟ ایک کافر آگے بڑھا۔ اس نے آواز دی "آؤ مقابلے کے لیے۔"

مسلمانوں کی صف سے بھی ایک جوان اپنے منہ پر کپڑا باندھ نکل پڑا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر دو کافر نکلے۔ مومن شخص نے انھیں بھی جہنم واصل کر دیا۔ جب اس شخص نے اسلامی لشکر میں آ کر منہ سے کپڑا ہٹایا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عبداللہ ابن مبارک ہیں۔ (صفۃ الصفوۃ ۲/۳۲۹) یہ ابن مبارک کی بہادری ہی تھی کہ وہ ہمیشہ جہاد کے لیے کمربستہ رہتے اور اس کا اہتمام بھی فرماتے۔

سخاوت

جیسے حاتم طائی کی سخاوت مشہور تھی، اسی طرح طبقۂ علما میں ابن مبارک کی فیاضی مشہور ہوئی۔ ان کی سخاوت کے بے شمار قصے اور ایسی ہی مثالیں ہیں کہ جن کی خبر عام نہ ہوئی۔ کئی مقروض ایسے تھے جن کے قرضے ابن مبارک نے ادا کیے۔ پھر مقروضوں کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ کسی سے راز فاش نہ کریں۔ (صفۃ الصفوۃ ۲/۳۲۸)

ابن مبارک خود کہتے ہیں: "میری تجارت کی غرض علما و صوفیا اور مشائخین کی امداد کرنا ہے۔" ایک دفعہ فضیل بن عیاض ان سے کہنے لگے "اگر تم اور تمھارے ساتھی نہ ہوتے تو میں بھی تجارت نہ کرتا۔" (صفۃ الصفوۃ ۲/۳۲۲) یہی وجہ تھی کہ ابن مبارک اپنی ذات پہ مال بہت کم خرچ کیا کرتے۔ یہ مال ساتھیوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ ہوتا۔

صوفی بزرگ، اسماعیل ابن عیاش نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ابن مبارک عجیب و غریب آدمی ہیں۔ جو ساتھیوں کی تو ضیافت فرماتے اور خود روزہ رکھتے ہیں۔ (البدایہ ۱۰/۱۹۲)

فقرا پر ہر سال ایک لاکھ درہم خرچ کرتے۔ حج کا زمانہ آتا تو ابن مبارک کے ساتھ مرو کے شہری بھی ہوتے۔ ابن مبارک کہتے کہ تم سب اپنا مال جمع کرو۔ سب اپنا اپنا زرِ خرچ ان کے پاس جمع کرا دیتے۔ انھیں ابن مبارک صندوق میں ناموں کے ساتھ محفوظ رکھتے اور حج کرنے چلے جاتے۔ مدینہ اور مکہ میں حاجیوں کی عمدہ کھانوں سے ضیافت فرماتے۔ ان کے اہل و عیال کے لیے اشیا خریدتے۔ پھر واپس مرو پہنچتے، تو سب حاجیوں کی دعوت کرتے۔ اس کے بعد ساری رقم انھیں واپس کر دیتے۔ (البدایہ ۱۰/۱۹۲)

ایک دفعہ حج کے لیے نکلے، تو راستے میں ایک پرندہ مر گیا۔ آپ نے اسے کوڑے دان میں ڈالنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ساتھی آگے نکل گئے۔ ابن مبارک وہیں ٹھہرے رہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کوڑے دان پر ایک لڑکی آئی اور مردہ پرندہ اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ عبداللہ ابن مبارک اس کے پیچھے گئے اور لڑکی سے احوال دریافت کیے۔ لڑکی نے اپنی بدحالی کا تذکرہ کیا اور کہا "چند دنوں سے تو ایسی تنگی حالت ہو چکی کہ ہمارے لیے مردار بھی حلال ہو گیا۔ ہمارے والد کے پاس جو کچھ مال تھا، لوگوں نے ظلم کر کے ان سے چھین لیا اور انھیں قتل بھی کر ڈالا۔" یہ حالات سننے کے بعد ابن مبارک نے اپنے خازن کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ ہمارے پاس نفقہ و خرچ کتنا ہے؟

خازن نے جواب دیا "ایک ہزار دینار۔"

ابن مبارک نے فرمایا "ہمارے مرو تک پہنچنے کے لیے بیس دینار کافی ہیں۔ یہ رکھ لو اور بقیہ رقم اس لڑکی کو دے دو۔" خازن نے اسی طرح کیا۔ ابن مبارک نے فرمایا: اس سال حج کرنے سے

زیادہ افضل ایک بے یارو مددگار لڑکی کی مدد کرنا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۹)

غور کیجیے! ابن مبارک جیسے جید عالم دین، فقیہ، امام وقت نے نفلی حج پر جانے کے بجائے غریب کی امداد کو اہمیت دی۔ نیز یہ بھی فرمایا "اگر ہمارے پڑوس میں محتاجوں سے گزر رہے ہوں، تو نفلی حج کے لیے کوشش کرنے کے بجائے محتاجوں کی امداد پر توجہ دینا، فقرا کی خبر گیری کرنا اور ان کی ضروریات پورا کرنا افضل ہے۔"

ابن مبارک کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ صوفی حضرت حسن فرماتے ہیں: "میں خراسان سے بغداد تک آپ کے ساتھ رہا، اس دوران کبھی میں نے آپ کو تنہا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" (صفۃ الصفوۃ ص ۲/۳۲)

حدیث شریف کا اشتغال

مال دار کے بارے میں جو علم کی جانب جھکاؤ، اہل علم کی قدردانی اور حصول علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا بہت ہی کم لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ ایسے بانصیب افراد میں سے ایک ابن مبارک ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم حدیث جیسی مبارک شے سے تعلق دوارتقی نصیب فرمائی۔ ابن مبارک گھر میں زیادہ رہتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے پوچھا "کیا آپ کو گھر میں وحشت نہیں ہوتی؟"

جواباً کہنے لگے "مجھے وحشت کیسے ہوگی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کے ساتھ رہا کرتا ہوں۔" (صفۃ الصفوۃ ص ۲/۳۲) ابن مبارک کی حالت بیان کرتے ہوئے عالم دین نعیم ابن حماد کہتے ہیں "ابن مبارک جب کتاب الرقاق پڑھتے، تو نہایت آبدیدہ ہو جاتے۔ تب کوئی ان سے اس دوران سوال کرنے یا ان کے قریب جانے کی ہمت نہ کرتا۔"

آخرت کا خوف

مال کے ساتھ پہلے تو علم ہی کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے۔ مگر جب یہ دونوں جمع ہو جائیں اور ان میں عمل بھی مل جائے،

عظیم باتیں

☆ دو محبوب قطرے، دو محبوب گھونٹ اور دو محبوب قدم اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں:

۱۔ ایک خون کا قطرہ جو جہاد میں گرنے والا اور دوسرا آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے گرے۔

۲۔ ایک غصے کا گھونٹ، دوسرا غم کا جو صبر سے نگل لیے جائیں۔

۳۔ ایک نماز کے لیے اٹھنے والا قدم اور دوسرا صلہ رحمی کے لیے اٹھنے والا۔

☆ جس انسان کو چار چیزیں مل گئیں، اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی:

۱۔ زبان جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والی ہو۔

۲۔ دل جو اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے والا ہو۔

۳۔ جسم جو دین کے لیے مشقت برداشت کرنے والا ہو۔

۴۔ نیک ساتھی یعنی بیوی جو صبر کرنے والی ہو۔

☆ محبت اگر استاد سے ہو تو روشنی بن جاتی ہے۔

☆ محبت والدین سے ہو تو اطاعت بن جاتی ہے۔

(عزنہ عارف، والٹن، لاہور)

تو نور علیٰ نور کا مصداق ہو جاتا ہے۔ ایسا حسین امتزاج ناپید نہیں، تو کمیاب ضرور ہے۔ ابن مبارک کی ذات ہی خود مبارک تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تمام تر خوبیاں بیک وقت جمع فرمائیں۔ عملی زندگی میں وہ انتہائی فعال اور متحرک تھے۔ ہر وقت انھیں اپنی آخرت کی فکر دامن گیر رہتی، چناں چہ ایک دفعہ مکۃ المکرمہ میں ابن مبارک کو زمزم سے لبریز پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ نے قبلہ رخ ہو کر یہ حدیث مبارک بیان فرمائی: ترجمہ: آپ ..... نے فرمایا: زمزم کا پانی جس نیت سے پیا جاتا ہے، اس کے لیے کافی ہے) اس کے بعد ابن مبارک نے فرمایا: یہ پانی میں قیامت کی پیاس بجھانے کے لیے پیتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے نوش فرمایا۔

عبادت وقبولیت دعا

ابن مبارک پر اللہ کا خاص کرم یہ بھی تھا کہ انھیں عبادت کا

خاص شوق عنایت فرمایا گیا۔ اسی بنا پر راتوں میں ابن مبارک کا عجیب و غریب حال ہوا کرتا تھا۔ وہ اتنا زیادہ روتے کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ حاسدین یہ دیکھ کر کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر انھیں ہم پر فضیلت دی ہے۔ (صفۃ ۲/۳۳۰) ابو وہب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مستجاب الدعوات بھی بنایا تھا۔

ایک مرتبہ ایک اندھے شخص کے سامنے سے ابن مبارک کا گزر ہوا۔ اندھے نے ابن مبارک سے سوال کیا کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے، اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹا دے۔ ابن مبارک نے دعا کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بینائی لوٹا دی۔ ابو وہب کہتے ہیں کہ میں نے خود اس کو بینا ہوتے دیکھا۔ (ایضاً ۲/۳۲۹)

حقیقی بادشاہت

حکمران وہ لوگ نہیں جو جبراً عوام پر مسلط ہو جائیں اور اپنا حکم نافذ کرنے لگیں۔ بلکہ حقیقی معنی میں حکمران وہ ہے جسے قوم دل و جان سے چاہنے لگے۔ اس کی ہر ہر ادا پر مر مٹنے لگے۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیتاب ہو اور اس کی اتباع کو اپنے لیے کامیابی کا زینہ سمجھے۔ بزرگ بھی ایک طرح کی حکومت رکھتے اور عوام کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ابن مبارک رقہ آئے۔ لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے اور غبار بہت زیادہ اڑنے لگا۔ خلیفہ ہارون رشید کی باندی محل کی کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ باندی نے لوگوں سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا: یہ خراسان کے عالم دین ہیں۔ لوگ انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔"

باندی نے یہ سن کر کہا "ہارون رشید حقیقت میں بادشاہ نہیں بلکہ حقیقتاً حکمران تو یہ ہیں، کیوں کہ ان کے واسطے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے کسی پولیس و مددگار کی ضرورت نہیں۔"

(البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۵۱)

اقوال

بزرگوں کے اقوال میں اللہ تعالیٰ نے عجیب و غریب تاثیر رکھی ہے۔ بعض دفعہ بزرگوں کا صرف ایک جملہ وہ اثر دکھاتا ہے جو کئی تقاریر اور مضامین نہیں دکھا سکتے۔ بعض دفعہ بزرگوں کے ایک ہی جملے سے سامعین کی زندگی بدل جاتی ہے۔ ابن مبارک کے بھی بے شمار اقوال ایسے ہیں۔ ایک شخص کو آپ نے نصیحت فرمائی: "اپنی قدر پہچانو۔" (صفۃ الصفوۃ ۲/۳۲۹)

ابن مبارک فرماتے ہیں: "ہم نے علم دنیا کے لیے سیکھا، لیکن علم ہی نے ہمیں دنیا چھوڑنا سکھایا۔" (صفۃ الصفوۃ ۲/۳۳۰)

ایک دفعہ فرمایا: کئی لوگ دنیا کی بہترین چیز پانے سے قبل وفات پا گئے۔"

سامعین نے سوال کیا: وہ بہترین چیز کیا ہے؟

آپ نے جواب دیا: اللہ کی معرفت۔

ابن مبارک فرمایا کرتے: شبے کا ایک درہم لوٹا دینا، لاکھوں درہم صدقہ کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ابن مبارک کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ مال و دولت کے ساتھ جود و سخا جیسی اہم نعمت بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو وافر مقدار میں عطا فرمائی، جس کا آپ موقع بموقع استعمال فرمایا کرتے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل جیسی اہم نعمت سے بھی سرفراز فرمایا جس کا آپ نے بخوبی لحاظ کیا اور اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کا زہد و تقویٰ انتہائی مثالی تھا، جس پر علما و صلحا رشک کیا کرتے۔ آپ کی زندگی میں انسانوں کے لیے بے شمار نمونے اور اسباق موجود ہیں، جن سے استفادہ کر کے زندگی گزارنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نیک عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک روز تہجد کے بعد مراقبے میں مشغول تھے کہ اشارہ ملا، سمعان شہر جاؤ اور وہاں راہبوں کی محفل میں شرکت کرو۔ وہ اس حکم پر پہلے تو بہت گھبرائے۔ لیکن یہ اشارے جب مسلسل ملے، تو آپ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہوئے۔ بھیس بدلا اور سمعان کی طرف روانہ ہو گئے۔

کئی روز سفر کے بعد وہاں پہنچے تو معلوم ہوا، آج ہی راہبوں کی بڑی تقریب ہے اور انھوں نے اس خوشی میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا ہے۔ حضرت جلسہ گاہ تشریف لے گئے اور خاموشی سے ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جو راہب بھی تقریر کے لیے کھڑا ہوتا، اس کا رنگ نہ جمتا۔ کچھ دیر وہ آئیں بائیں شائیں کرتا اور بیٹھ جاتا۔

اتنے میں ان کا بڑا راہب اٹھا۔ اس نے غضب ناک ہو کر کہا ”معلوم ہوتا ہے، ہمارے اس مجمع میں کوئی مسلمان آ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مقرر کا رنگ نہیں جم رہا۔

یہ سن کر مجمع میں شور برپا ہوا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی بڑے راہب نے پکار کر کہا ”اے محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تجھے تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں، تو جس جگہ بھی ہے کھڑا ہو جا۔ اگر تو نے اسلام کے بارے میں ہمارے شبہات دور کر دیے، تو ہم سب تیری اتباع کریں گے۔ اگر ہمیں مطمئن نہ کر سکا، تو تجھے قتل کر دیں گے۔“

یہ سن کر حضرت بایزید بسطامیؒ کھڑے ہو گئے اور بڑے راہب سے کہا ”آپ جو سوال چاہیں کیجیے، میں جواب دینے کے لیے حاضر ہوں۔“

راہب: تو پھر تیار ہو جا۔

بایزیدؒ: میں بالکل تیار ہوں۔



جنت کی کنجی

حضرت بایزید بسطامیؒ اور عیسائی راہب کے مابین ایک تاریخی مکالمہ

حبیب اشرف صبوحی

راہب: بتاؤ وہ ایک کیا ہے جس کا دوسرا نہیں؟

بایزید: وہ ایک جس کا ثانی نہیں اللہ تعالیٰ ہے۔

راہب: وہ دو کیا ہیں جن کا تیسرا نہیں۔

بایزید: وہ رات اور دن ہیں جن کا تیسرا نہیں۔

راہب: وہ تین کیا ہیں جن کا چوتھا نہیں۔

بایزید: وہ عرش، کرسی اور قلم ہیں۔

راہب: وہ چار کیا ہیں جن کا پانچواں نہیں۔

بایزید: وہ توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید ہیں؟

راہب: وہ سات کیا ہیں جن کا آٹھواں نہیں۔

بایزید: وہ سات آسمان ہیں۔

راہب: وہ آٹھ کیا ہیں جن کا نواں نہیں۔

بایزید: وہ حاملان عرش ہیں۔

راہب: اچھا یہ بتاؤ وہ گیارہ، بارہ اور تیرہ چیزیں کیا ہیں جن کا خدا نے تذکرہ کیا ہے۔

بایزید: حضرت یوسف کے گیارہ بھائی بارہ مہینے اور تیرہ چیزیں ہیں جنھیں حضرت یوسف نے خواب میں سجدہ کرتے دیکھا۔

راہب: ذاریات، حاملات، جاریات اور مقسمات سے کیا مراد ہے؟

بایزید: ذاریات سے مراد ہوائیں، حاملات سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل، جاریات سے مراد کشتیاں اور مقسمات سے مراد فرشتے ہیں جو رزق تقسیم کرتے ہیں۔

راہب: وہ کیا چیز ہے جس سے تنفس کی نسبت کی گئی لیکن اس میں روح نہیں؟

بایزید: وہ صبح صادق ہے جس میں روح نہیں لیکن تنفس موجود ہے۔ "والصبح اذا تنفس"

راہب: وہ چودہ چیزیں کون سی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سے تکلم کا شرف حاصل ہوا؟

بایزید: ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں۔

راہب: وہ قبر کون سی ہے جو اپنے مدفون کو لیے لیے پھری؟

بایزید: حضرت یونس علیہ السلام کی مچھلی۔

راہب: ایک درخت میں بارہ ٹہنیاں ہیں۔ ہر ٹہنی میں تیس پتے اور ہر پتے میں پانچ پھول ہیں۔ دو پھول دھوپ میں تین سائے میں ہیں؟

بایزید: درخت سے مراد سال، ٹہنیوں سے مراد بارہ مہینے، پتوں سے مراد تیس دن، پھولوں سے مراد پانچ نمازیں ہیں۔ دو دھوپ میں یعنی ظہر اور عصر اور تین سائے میں یعنی مغرب، عشا اور فجر۔

راہب: وہ کون سی چیز ہے۔ جس کو خدا نے خود ہی پیدا فرمایا اور پھر خرید لیا؟

بایزید: وہ مومن کا نفس ہے۔

راہب: وہ کیا ہے۔ جس کو خود اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور پھر خود اسی بارے میں سوال کیا؟

بایزید: وہ حضرت موسیٰ کا عصا ہے۔

راہب: وہ کیا ہے جس کو اللہ نے وحی بھیجی، لیکن نہ وہ انسان ہے، نہ جن نہ فرشتہ؟

بایزید: وہ شہد کی مکھی ہے۔

اس کے بعد بڑا راہب خاموش ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کچھ اور بھی پوچھو لیکن راہب کے منہ پر جیسے تالا لگ گیا۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا "اگر تم نے کچھ نہیں پوچھنا تو میرے ایک سوال کا جواب دو۔ وہ یہ کہ جنت کی کنجی کیا ہے؟"

راہب نے کہا "میرے لیے اس سوال کا جواب دینا خطرے سے خالی نہیں، یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔"

حضرت نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "کیا اس سوال کا جواب دینے سے آپ اپنے بڑے راہب کو قتل کر دیں گے؟"

راہبوں نے یک زبان ہو کر کہا "ہرگز نہیں۔ ہم تو خود اس سوال کا جواب جاننے کے منتظر ہیں۔"

یہ سن کر بڑے راہب نے کہا، تو سنو جنت کی کنجی ہے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

یہ سننا تھا کہ تمام مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ روایت ہے کہ اس موقع پر بعض راہبوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

◆◆◆



اربوں ڈالر کے کاروبار میں اپنا حصہ تلاش کیجیے

دنیائے انٹرنیٹ میں تیزی سے پھیلتا ایک شعبہ آپ کا منتظر ہے

طیب طارق

عید کے تیسرے روز تیمور نے مجھے اپنے گھر عید ملن پارٹی پر بلایا۔ اپنے سب دوستوں کو بھی اکٹھا کیا۔ چائے پر نشست کا آغاز ہوا۔ تیمور نے پوچھا: طیب بھائی آج آپ ہمیں آئی ٹی کے کاروبار میں کمیشن بیسڈ ماڈل اور اشتہارات کے ذریعے کمانے کے بارے میں بتائیں۔ میری ایک سہیلی اپنے خاندان کے ساتھ فلم دیکھنے گئی۔ اس نے ٹکٹیں آن لائن خریدی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ ویب سائٹ جہاں سے اس نے آن لائن ٹکٹس خریدیں، وہ کیسے کمائی ہوئی؟

میں نے اسے بتایا، آن لائن ٹکٹس کی ویب سائٹ کمیشن کے ذریعے کماتی ہے۔ کمیشن بیسڈ ماڈل یہ ہے کہ جس کی چیز آپ نے بیچنی ہو، آپ ان کے پاس جاتے اور کہتے ہو کہ بھائی میں تمہاری سیل بڑھاؤں گا۔ تمہاری جو بھی سیل میرے ذریعے ہوگی تم مجھے اس سے اتنا کمیشن دو گے۔ بالغرض آپ کا اس سے ۱۰ یا ۱۵ فیصد کمیشن طے ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اپنا ویب سائٹ کے ذریعے اس کی اشیا یا خدمات کی آن لائن بکنگ یا سیل کرتے اور ہر سودے کے بدلے ۱۰ یا ۱۵ فیصد یا جتنا بھی طے ہو، اتنا کمیشن لیتے ہو۔

انٹرنیٹ کی دنیا میں کمیشن بیسڈ ماڈل انتہائی کامیاب اور مانا ہوا کاروباری طریقہ ہے۔ وجہ یہ کہ اس میں آپ کے پاس کام کے لیے بہت وسیع مارکیٹ موجود ہوتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کمیشن پر آن لائن ٹکٹیں بیچتے ہیں، تو ملک بھر سے گاہک آپ سے رابطہ کریں گے۔ اگر آپ کا زمینی دفتر ہوتا، تو پورے ملک میں سیل کرنے کے لیے آپ کو ملک بھر میں اپنے دفتر بنانے اور عملہ بھی رکھنا پڑتا۔ جبکہ آن لائن کمیشن بیسڈ ماڈل میں آپ صرف ایک دفتر میں بیٹھ کر پورے ملک میں ٹکٹیں فروخت کرتے ہو۔ یوں آپ کی سیل کا حجم دفتر جاتا ہے اور

کمیشن کے ذریعے بھی آپ باآسانی اچھا خاصا کما سکتے ہو۔

مثال کے طور پر پورے ملک میں اگر آپ روزانہ ۱۰۰۰ ٹکٹس فروخت کریں، تو مہینے کی آپ ۳۰۰۰۰ ٹکٹس بیچ لیں۔ ایک معمولی ٹکٹ اندازاً ۵۰۰ روپے میں ملتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ نے اندازاً ڈیڑھ کروڑ روپے کی سیل کی۔ اگر آپ کا کمیشن ۱۰ فیصد بھی ہو، تو آپ کا منافع ۱۵ لاکھ روپے ہوا۔ ان میں سے ۵ لاکھ اگر آپ کے دفتر، ملازمین اور مارکیٹنگ کے خرچے ہوں، تو اندازاً ۱۰ لاکھ روپے آپ کا خالص منافع ہوا۔

کمیشن بیسڈ ماڈل کا اطلاق ہر اس کاروبار پر ہو سکتا ہے جسے آپ نے آن لائن منتقل کرنا ہو۔ میں تمھیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ ۲۰۰۷ء میں امریکا میں دو نوجوان بیروزگار ہو چکے تھے۔ ان کے پاس اپنے فلیٹ کا کرایہ دینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ انھوں نے سوچا کیوں نہ ہم اپنے فالتو گدے نکالیں اور لوگوں کو ایک رات گزارنے کے لیے کرائے پر دیں۔ وصول ہونے والے کرائے سے انھیں صبح کا ناشتا بھی فراہم کریں۔

پہلے ہی روز تین گاہک مل گئے جس سے ان کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ ان میں سے ایک کے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ ہم ایک ایسی ویب سائٹ بنائیں جہاں ایسے لوگ جو ہماری طرح اپنے گھر کا ایک کمرا یا ایک گدا ہی سہی، ایک یا دو راتوں یا ایک آدھ ہفتے کے لیے کرائے پر دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں، اپنا اشتہار لگائیں۔ دوسری طرف وہ لوگ جو کرائے کی اشیا لینے میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اشتہار پڑھ کر کرایہ پر لے سکیں۔ بدلے میں ہم دونوں اطراف سے معمولی کمیشن وصول کریں۔ یہ ایک طرح کا انوکھا کرایہ داری ماڈل تھا۔

میری بات کاٹتے ہوئے علی نے پوچھا: طیب بھائی، یہ تو بہت مختلف طرح کا ماڈل ہے۔ کیا سرمایہ کاروں نے اس پر پیسے لگائے؟

میں نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ جس کسی نے ان کے آئیڈیا کے متعلق سنا، اس نے انھیں پاگل قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا کہ تمھارا یہ آئیڈیا کبھی نہیں چلنے والا، بہتر ہوگا اس پہ وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی اور کام پہ توجہ دو۔ لیکن وہ دونوں بھی تھامس ایڈیسن کی طرح اپنی دھن کے پکے تھے، اپنے کام میں جتے رہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

ان کے پاس یہ کام شروع کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ ان دنوں اوباما اور بش کی الیکشن مہم چل رہی تھی۔ اس سلسلے میں سارے ملک سے مندوبین امریکا کے ایک شہر میں اکٹھے ہوتے۔ انھوں نے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے اوباما اور بش کے تصویروں والے کارن فلیکس، جو امریکیوں کے ناشتے کی ایک مرغوب غذا ہے، اس ہال کے باہر بیچنے شروع کر دیے۔ کچھ پیسے وہاں سے اکٹھے ہوئے اور کچھ ڈبے بچ بھی گئے۔ بہرحال انھوں نے کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصے بعد ایسا وقت آیا کہ ان کے پاس خریدنے کے لیے بھی رقم نہ بچی۔ تب وہ بچے ہوئے کارن فلیکس کے ڈبوں پر ہی گزارہ کرتے تھے۔

اسی دوران کسی نے ان کو مشورہ دیا کہ Y COMBINATOR سے رابطہ کرو۔ یہ امریکا کی سرمایہ کار کمپنی ہے۔ انھوں نے رابطہ کیا اور اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ ہے۔ آج ان کی کمپنی، airbnb.com کی مالیت ۲۶ کھرب ڈالر ہے۔ اس کی سالانہ سیل تقریباً ۹۰۰ ارب روپے ہے اور یہ سب کمیشن بیسڈ ماڈل کی بدولت ہوا۔

تیمور نے حیران ہو کر سوال پوچھا: طیب بھائی، کیا امریکا میں بھی اس طرح کے جنونی لوگ پائے جاتے ہیں جو کاروبار کے لیے اتنی محنت کرتے ہوں؟

میں نے ہنستے بتایا کہ کاروبار شروع کرنے اور اس کو بلندیوں تک لے جانے کے لیے اسی طرح کی دھن چاہیے۔ جنھوں نے امریکا میں کاروبار شروع کیا انھوں نے بھی ویسی ہی محنت کی باوجود اس کہ انھیں ہم سے کئی گنا اچھی ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ دور کیوں جائیں، پاکستان کے کامیاب کاروباریوں پر تم اگر ایک نظر ڈالو، تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ ان سب ہی نے اسی طرح انتھک محنت کی۔ اسی انتھک محنت کی بدولت آج وہ اس مقام تک پہنچے۔

لیکن مقام تک پہنچنے کے لیے انھوں نے بڑے بڑے رسک بھی لیے۔ صوفی گروپ آف کمپنیز کے بانی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سڑک کنارے صابن کا ٹھیلا لگایا کرتے تھے۔ اسی طرح مشہور ریسٹورنٹ چین، ہندو خان کے مالک کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کراچی میں ایک ٹھیلے سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی آن لائن مارکیٹ snapdeal.com کا ایک شریک بانی مائیکروسافٹ کی ملازمت چھوڑ کر ہندوستان واپس آیا تھا، صرف اس لیے کہ وہ کاروبار کر کے نہ صرف بھارت کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک بنے گا، اپنے اور اپنے گھر والوں کے خوابوں کو تعبیر دے گا بلکہ ملک کو بھی ترقی دے گا۔

کمیشن بیسڈ ماڈل کی طرف واپس آتے ہوئے میں نے انھیں بتایا کہ airbnb کی طرح uber آن لائن ٹیکسی بک کروانے کی ویب سائٹ ہے جس کی فی الوقت مالیت ۴۶ کھرب روپے ہے۔ وہ اس وقت دنیا کے ۲۵ سے ۳۰ ممالک میں اپنے آپریشنز چلا رہی ہے۔ دور کیوں جائیں۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں اس وقت اس طرح کا آئی ٹی کا کاروبار عروج پر ہے۔ uber بھارت میں بھی کام کر رہی ہے لیکن وہاں مقامی نوجوان بھارتیوں کی بنائی ہوئی ایپ، OLA CABS نے اسے شکست دے دی ہے۔ OLA CABS بھی آن لائن ٹیکسی یا رکشہ بک کروانے کی ایپ ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ انگریزی کے علاوہ اور زبانوں کے اندر بھی موجود ہے۔

ہماری طرح بھارت میں بھی ٹیکسیوں کے ساتھ ساتھ بے شمار رکشے چلتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے کہ رکشے والے یا ٹیکسی والے انگریزی نہیں سمجھتے۔ بھارت میں یہ مسئلہ بھی ہے کہ بہت سے رکشے یا ٹیکسی والے اپنی مقامی زبان مثلاً تامل، گجراتی وغیرہ کے علاوہ کوئی اور زبان بھی نہیں سمجھتے۔ اس کا حل OLA CABS والوں نے یوں نکالا کہ رکشے والوں کو بیک وقت کئی زبانوں میں چلنے والی ایپ دے دی جو ان کی مقامی زبان میں بھی چلتی ہے اس طرح رکشے والوں کی بھی مشکل آسان ہوئی اور ola cabs والوں کی بھی۔

آن لائن بس ٹکٹ بکنگ، آن لائن مووی ٹکٹس بکنگ، آن لائن ہوٹلز بکنگ، آن لائن ایئر ٹکٹس اور آن لائن ایئر ٹکٹس ...... یہ سب بہت بڑے اور الگ الگ سیکٹرز ہیں جن کی مالیت بھارت کے اندر اربوں روپے کی ہے۔ ہمارے ہاں بھی ان شعبوں میں تیزی سے بڑھوتری ہو رہی ہے۔ redbus.in جو بھارت کی سب سے بڑی آن لائن بس ٹکٹ بکنگ ویب سائٹ تھی، کچھ عرصہ قبل ۸ ارب روپے میں فروخت ہوئی ہے۔ وہ ماہانہ ۱۰ لاکھ سے زائد ٹکٹس فروخت کرتی ہے۔

کمیشن بیسڈ ماڈل کے دو شعبے بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ وہ ہیں: آن لائن گروسری اور ہوم ڈلیوری ماڈل۔

میں تم لوگوں کو ایک اور قصہ سناتا ہوں۔ اپروا مہتا ایک بھارتی نژاد امریکی ہے جو amazon میں ملازمت کرتا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں اس نے سوچا کہ ترقی کے لیے اپنا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ amazon میں بےشک ملازمت بہت اچھی ہے۔ بڑھوتری کے امکانات بھی زیادہ ہیں لیکن اپنے کاروبار سے جتنا پانچ دس سال میں کما سکتا ہوں، amazon میں شاید ساری عمر ملازمت کر کے بھی نہ کما سکوں۔ چناں چہ اس نے amazon کی پرتعیش ملازمت چھوڑ دی۔ دوستوں نے اسے سمجھایا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو amazon جیسی کمپنی میں لوگ ملازمت کے لیے ترستے ہیں اور تم اسے لات مار رہے ہو لیکن وہ اپنی دھن کا پکا نکلا۔

اس کے ذہن میں کوئی خاص آئیڈیا نہیں تھا بس ایک دھن تھی کہ مجھے اپنا مستقبل خود بنانا ہے۔ دو سال اس نے مختلف آئیڈیاز پر طبع آزمائی کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی، سب آئیڈیاز ناکام ہو گئے۔ حد تو یہ تھی کہ اس کا جو پارٹنر تھا، وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری، کوشش کرتا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں ایسا اچھوتا آئیڈیا آیا جس نے نہ صرف اس کی کمپنی کی مالیت چند ہی سالوں میں ایک کھرب روپے کر دی بلکہ گروسری کے سیکٹر کو نیا

بزنس ماڈل بھی فراہم کر دیا۔ وہ تھا instacart.com امریکا میں ۲۰۰۰ء کی دہائی کے معاشی ڈپریشن کے بعد آن لائن گروسری کا یہ پہلا اسٹارٹ اپ رہا ہے۔

آن لائن گروسری فراہم کرنا جہاں آسان ہے وہیں انتہائی مشکل بھی ہے خصوصاً اگر آپ پورے ملک میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹے شہروں میں کام کرنا چاہتے ہیں تو ایک حل یہ ہے کہ آپ وہاں اپنا گودام بنائیں، عملہ رکھیں اور ڈلیوری کریں لیکن اس حل میں کئی طرح کے مسائل آڑے آتے ہیں مثلاً کم آرڈر، گودام کا کرایہ، چیزوں کی فراہمی، ڈسٹری بیوشن وغیرہ۔

اپرواجتا نے اس کا یہ حل نکالا کہ ایک ایسا آن لائن گروسری اسٹور بنایا جس میں ڈلیوری تو آپ کی مرضی کے اسٹور ہی سے ہوگی لیکن آرڈر آپ آن لائن ان کی کمپنی کو دیں گے۔ اسی ویب سائٹ پر آپ اپنی مرضی کے قریبی اسٹور کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ بدلے میں آن لائن گروسری اسٹور کمپنی ان روایتی گروسری اسٹورز کی سیل بڑھانے کے عوض ان سے ہر سیل کے بدلے مخصوص معاوضہ یا کمیشن لے گی۔

اس ماڈل کے دو بڑے اہم فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کے ذریعے آپ نہ صرف پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں اپنے آپ کو پھیلا سکتے ہو۔ دوسرا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ آپ پر مال یا اسٹاک کی کوئی ذمے داری نہیں۔ وہ آپ نے خریدنا نہیں اور یوں آپ کا پیسہ مال خریدنے میں نہیں پھنسے گا۔ آپ ایک طرح سے مارکیٹنگ کمپنی ہو گے جو ان کے لیے آن لائن آرڈر لے گی اور بدلے میں اپنا کمیشن وصول کرے گی۔

اسی طرح بھارت میں grofers.com کے نام کی ایک کمپنی حالیہ دنوں میں بے حد مقبول ہوئی ہے۔ وہ کسی بھی چیز کے آرڈر پر اس کی ہوم ڈلیوری کرتی اور بدلے میں اس دکان دار سے اپنا کمیشن لیتی ہے۔ آن لائن ہوم فوڈ ڈلیوری کی ایپس تو اب پاکستان میں بھی کافی مقبول ہو رہی ہیں۔ eatoye اور foodpanda.com کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا، یہ سب

دنیا بھر میں لوگ کمیشن کی بنیاد پر کاروبار کرنے والی ویب سائٹس بنا کر سالانہ اربوں ڈالر کما رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے پڑوس بھارت میں اس کاروباری شعبے کی مالیت ۴۰ ارب روپے ہے۔ مگر پاکستان میں تعلیم یافتہ مرد و زن بھی اس شعبے کی افادیت سے ناواقف ہیں۔ یہ خواتین و حضرات زیرِ نظر مضمون سے کماحقہ معلومات و آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں آن لائن فوڈ آرڈر کرنے پر ڈلیوری کی سہولت دیتی اور بدلے میں ریسٹورنٹس سے اپنا کمیشن لیتی ہیں۔

پاکستان میں فلموں اور بس ٹکٹس کی آن لائن بکنگ بھی شروع ہو چکی۔ ایک کمپنی جو کہ پلان ۹ کے بزنس انکیوبیشن سنٹر میں انکیوبیٹ ہوئی تھی pk-bookme کے نام سے کافی اچھا کام کر رہی ہے۔ ہالز وغیرہ کی بکنگ کے لیے p4plan.com کے نام سے ایک کمپنی کام کرنے لگی ہے۔ bookme.pk کو حال ہی میں ترکی کی ایک وینچر فنڈنگ کمپنی سے اچھی خاصی فنڈنگ ملی ہے جس کی مالیت تقریباً کروڑوں روپے میں ہے۔ اس کے علاوہ ہوٹل بکنگ میں jovago.com جو ایک جرمن کمپنی راکٹ انٹرنیٹ کی سرمایہ کاری ہے، کام کر رہی ہے۔

حرا نے سوال پوچھا: طیب بھائی آپ کے خیال میں اس وقت پاکستان میں کمیشن بیسڈ ماڈل میں کن شعبوں میں کام کرنا ممکن ہے؟

میں نے جواب دیا کہ میرے خیال میں اس وقت پاکستان میں سوائے فوڈ آرڈرنگ ایپس کے، تقریباً سب ہی شعبوں میں کام کے مواقع موجود ہیں۔ ان میں فی الحال مقامی اکا دکا کمپنیاں کام رہی ہیں اور ابھی تک سوائے ہوٹل بکنگ کے، کسی سیکٹر میں بھی بھاری سرمایہ کاری موجود نہیں جس کی وجہ سے ترقی کی گنجائش موجود ہے۔ میرے خیال میں اس

وقت پاکستان میں آن لائن بکنگ میں ٹرین بکنگ اگر ممکن ہو تو، اور اس کے علاوہ بس ٹکٹ بکنگ، اور مووی ٹکٹ بکنگ میں کافی اسکوپ موجود ہے۔ آن لائن ائیر ٹکٹ انڈسٹری کا حجم بہت بڑا ہے، اس میں بھی کافی مواقع موجود ہیں۔

علی نے سوال کیا: طیب بھائی، میری تحقیق کے مطابق آن لائن دکانداری کے ایک اور کمیشن بیسڈ ماڈل میں آپ چیزیں بے تحاشا ڈسکاؤنٹ پر فروخت کرتے ہیں، تھوڑا سا اس کے بارے میں بھی بتائیں۔

میں نے جواب دیا، میرا خیال ہے کہ تم groupon ماڈل کے بارے میں بات کر رہے ہو۔ اس میں مارکیٹ پلیس ماڈل کی طرح آپ دکانداروں اور خدمات فراہم کرنے والوں سے بات کرتے ہو کہ بھائی میں تمہاری سیل بڑھاؤں گا، تم مجھے اپنی خدمات بک کرنے کی اجازت یا اپنی مصنوعات ڈسکاؤنٹ پہ دو۔ ہر سیل کے پیچھے اتنے فیصد کمیشن میرا ہوگا۔ بنیادی طور پہ یہ ماڈل وہاں کامیاب ہے جہاں مارکیٹ میں زبردست مقابلہ آچکا ہو۔

دکاندار آپ کو ڈسکاؤنٹ دو وجوہ کی بنا پر دیتا ہے۔ ۱۔ اپنی سیل بڑھانے کے لیے ۲۔ نئے کسٹمر لانے کے لیے کیوں کہ ان میں سے اگر ۲۰ سے ۲۵ فیصد اس کے باقاعدہ گاہک بن گئے، تو ان کا کام چل جائے گا۔ ۳۔ اپنے برانڈ کی مارکیٹنگ کے لیے۔ گاہک آپ کے پاس اس لیے آتا ہے کیوں کہ آپ اسے وہی مصنوعات مارکیٹ کے مقابلے میں حیرت انگیز ڈسکاؤنٹ پر دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ کسٹمر آپ کی ویب سائٹ یا ایپ پر آ کر کوپن خریدتا ہے جسے وہ جا کر دکاندار کو دکھاتا ہے۔ دکاندار اس کے بدلے آپ کو ڈسکاؤنٹ دے دیتا ہے۔ یہ کوپن روایتی پرنٹ کوپن بھی ہو سکتا ہے اور ای کوپن بھی۔ اس طرح کی ویب سائٹوں کو آن لائن کوپننگ ویب سائٹس کہا جاتا ہے۔

یہ بھی آن لائن شاپنگ کا ایک شاندار کمیشن بیسڈ ماڈل ہے۔ سب سے پہلے امریکا میں ایک شخص نے groupon.com کے نام سے اس ماڈل پہ ویب سائٹ شروع کی جو دیکھتے ہی دیکھتے بے حد مقبول ہوئی کیوں کہ اس ماڈل میں خریدار کو حد سے زیادہ ڈسکاؤنٹ ملتا تھا۔

یہی ماڈل بھارت میں بھی بے شمار لوگوں نے شروع کیا۔ mydala.com بھارت کی ایک مشہور کوپن ویب سائٹ ہے۔ اس وقت groupon.com کی مالیت اندازاً ۴ کھرب روپے ہے۔ بھارتی ویب سائٹس کی مالیت بھی اس وقت اربوں روپے میں ہے۔ پاکستان میں اس وقت اس ماڈل پہ تین ویب سائٹیں dealtoday.pk، lootlo.pk، اور 24hours.pk کام کر رہی ہیں۔ تم ان سے کوئی چیز خرید کر دیکھ سکتے ہو کہ یہ ماڈل کیسے کام کرتا ہے۔

علی کے ایک اور دوست راحیل نے سوال کیا کہ طیب بھائی، آپ بلاگ، ویڈیوز اور اشتہارات کے ذریعے کمانے کے بارے میں بھی بتائیں۔ میں نے سنا ہے کہ آج کل بہت سے لوگ ایڈسنس یعنی گوگل کے اشتہارات کا استعمال کرتے ہوئے گھر بیٹھے کماتے ہیں۔ اخبارات میں آن لائن فارم فل کر کے گھر بیٹھے لکھ پتی بننے کا بھی بہت چرچا ہے۔ تھوڑی اس حوالے سے بھی راہنمائی کریں۔

میں نے ان سب سے درخواست کی کہ یہ دونوں موضوعات ہم اگلی نشست پر رکھ لیتے ہیں کیوں کہ اگر ہم نے ان پر بات شروع کی تو ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔ یہ موضوع طویل نشست کا متقاضی ہے۔ سب دوستوں نے مجھے اس شرط پہ اجازت دی کہ اگلی نشست پہ میں انھیں اپنے گھر بلانے کی اچھی سی دعوت مع لوازمات کروں گا۔ یوں ہماری آج کی محفل اختتام پذیر ہوگئی۔

(اردو ڈائجسٹ اس مضمون کے حوالے سے اپنے قارئین کی آرا کا منتظر رہے گا۔ کوئی سوال پوچھنے یا کسی بھی کاروبار کے حوالے سے تفصیلی معلومات لینے کے لیے آپ مضمون نگار سے براہ راست اس نمبر پہ رابطہ کر سکتے ہیں۔

0333 - 4777489 یا اس ای میل پر رابطہ کیجیے

tayyab.tariq@urdu-digest.com

جب شادی گھر بن گیا

ماتم کدہ

چند سکے بچانے کی تمنا میں ظالموں نے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑ ڈالا

تحسین شاہد

شہنائی کی گونج نے سبھی لوگوں کو برات کی آمد سے آگاہ کر دیا۔ فاروق کے گھر (چائنہ اسکیم لاہور) میں رنگ برنگی روشنیوں اور قمقموں کی برسات اتر آئی تھی۔ فاروق کی بیٹی نرگس کی آج شادی تھی۔ دور و نزدیک سے مہمان آ چکے تھے۔ فاروق آج بہت خوش تھا۔ یہ دن دیکھنے کے لیے اس نے نجانے کب سے تیاری کر رکھی تھی۔ وہ ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ اسے مہینے بعد جو تنخواہ ملتی، اس میں سے کچھ نہ کچھ رقم بچا کر وہ جمع کرتا رہا۔ تنخواہ بہت کم تھی لیکن وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنی بیٹی کے لیے دنیا کی ہر نعمت جمع کر لینا چاہتا تھا۔ گھر میں تین وقت کے بجائے دو وقت کھانا پکتا۔ لوگ پوچھتے تو کہتا "جب میں بیٹی کو اس کے اپنے گھر بھجوا دوں گا تب پیٹ بھر کے کھانا کھاؤں گا۔"

وقت گزرتا رہا۔ وہ بیٹی کے لیے جہیز اکٹھا کرتا رہا۔ آخر دسمبر ۲۰۱۴ء کی آخری عشرے میں شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ پھر وہ لمحہ بھی آن پہنچا جب نرگس کو مہندی لگانے کی تقریب کا آغاز ہوا۔ سہیلیاں اور محلے کی عورتیں سب مل جل کر شادی کے گیت گانے لگیں۔ نرگس پیلے رنگ کے لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی ماں فرزانہ بیٹی کی بلائیں لیتے نہ تھکتی۔ وہ ایک ایک لمحے کو یادگار بنا دینا چاہتی تھی۔ ویڈیو والے مہندی کی فلم بنانے میں مصروف تھے۔ عزیز و رشتہ دار سبھی خوب جشن منا رہے تھے۔ رات گئے تک مہندی کی تقریب جاری رہی۔ نرگس اپنے ارمانوں اور خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے تیار تھی۔ سہیلیاں ڈھولک بجا رہی



ر خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر مہندی کی تقریب ختم ہوئی، تو سب سونے کے لیے مخصوص جگہ پر لیٹ گئے۔ لیکن نرگس کو نیند کہاں آئی، وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ ہونے والے شوہر خرم کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی خالہ کا بیٹا تھا۔ بینک میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کے پاس اپنی کار تھی۔ وہ خوش لباس تھا اور ہردلعزیز بھی۔ وہ جب اپنی خالہ (نرگس کی والدہ) کے گھر آتا، تو بہت دیر تک بیٹھا رہتا۔ اس کا واپس جانے کو دل نہ کرتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ رات ٹھہر جاتا۔ اگلی صبح جب نرگس اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا ناشتا میز پر آراستہ کرتی، تو خرم نہ صرف مزے لے لے کر کھاتا بلکہ چوری چوری اسے دیکھتا رہتا۔ وہ حقیقت میں نرگس کو دل سے چاہنے لگا تھا۔ وہ نرگس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ اس نے جب والدہ سے شادی کے متعلق بات کی، تو انھوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ لیکن خرم کے والد ابھی اور شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چناں چہ انھیں رضامند کرنے کے لیے خرم کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔

بینک میں ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتی ہیں، اس لیے وہ ہفتے کی صبح ہی خالہ کے گھر آ پہنچتا اور اپنے کزن ریحان کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت نرگس کے گھر گزارنا چاہتا تھا۔ جب نرگس سے تنہائی میں ملاقات ہوتی، تو وہ اسے سہانے خواب دکھانے لگتا۔ نرگس نہایت خاموشی سے خرم کی باتیں سنتی اور خاموشی سے اپنے ذہن میں مستقبل کے تانے بانے بنتی رہتی۔ نرگس خود بھی خرم کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ وہ کیوں نہ چاہتی، خرم بھی تو لاکھوں میں ایک تھا۔ ایک لڑکی اپنی زندگی کے جو خواب دیکھتی ہے، ان تمام خوابوں کی تعبیر خرم کی شخصیت میں موجود تھی۔ وہ ہنس مکھ تھا، ملنسار بھی۔ وہ ہردلعزیز تھا اور دوسروں کو اپنا بنانے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔

اگر خرم خوبصورت اور مضبوط قد و قامت کا مالک تھا تو

اوور ٹائم

ایک مچھر نے دن کے وقت ایک شخص کے کان پر کاٹ لیا۔ اس پر اس شخص نے کہا:

"میاں مچھر تمھاری ڈیوٹی تو رات کو ہوتی ہے۔"

مچھر نے جواب دیا:

"جی ہاں جناب آج کل میں اوور ٹائم کر رہا ہوں۔"

نرگس بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ وہ بھی سہیلیوں میں چاند کی طرح الگ پہچان رکھتی تھی۔ کالج میں ہوتی، تو سہیلیاں اسے ہر دم گھیرے رہتیں۔ جب گھر پر ہوتی، تو محلے کی لڑکیاں اسے تنہا نہ ہونے دیتیں۔ وہ خوش لباس تھی اور خوش گفتار بھی۔ ہر وقت مسکراہٹ چہرے پر سجی رہتی۔ وہ چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کی عزت کرنا خوب جانتی تھی۔

اس نے لاہور کالج برائے خواتین سے بہترین نمبروں سے ایم اے کیا اور گھر کی خانہ داری میں مصروف ہو گئی۔ ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے باوجود وہ خود کو ایک عام لڑکی ہی تصور کرتی۔ اس نے کبھی غرور نہیں کیا کہ وہ ایم اے پاس ہے۔ نرگس کے والد کی تنخواہ کم تھی۔ والدہ گھر میں سلائی کڑھائی کا کام کر کے جہیز بنانے میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی رہی، لیکن نرگس کو والدین نے شہزادیوں کی طرح پالا پوسا۔ ماں کی خواہش تھی کہ جہاں نرگس تعلیم یافتہ ہو، وہاں اسے گھر گرہستی کا ہر ہنر بھی آنا چاہیے تاکہ سسرال جا کر کسی کا طعنہ نہ سننا پڑے۔ ماں اور باپ کی خوشیاں خواب بن کر آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ وہ اس پہر سے نجات کے منتظر تھے جب لاڈلی بیٹی دلہن کا سرخ جوڑا پہنے اپنے گھر روانہ ہوتی۔

خدا خدا کر کے ۲۷ دسمبر کا سورج طلوع ہوا۔ نرگس نے آسمان کی طرف دیکھا، تو یہ دن اسے پہلے سے زیادہ روشن

دکھائی دیا۔ تبھی اسے خیال آیا، آج ماں باپ کے گھر اس کا آخری دن ہے۔ گو وہ والدین کو ملنے آ سکتی تھی لیکن اس کا اصلی گھر شوہر کا گھر ہی کہلاتا۔ بچپن کی باتیں، گڑیوں سے کھیلنا، اسکول کی شرارتیں پھر کالج کی سہیلیوں کی شرارتیں، سب ایک ایک کرکے اسے یاد آنے لگیں۔ وہ کبھی کھل کر قہقہہ مار کر مسکرا دیتی پھر گہری خاموشی اسے گھیر لیتی۔ والدین کے گھر سے بیٹیوں کی رخصتی، جنازے کی طرح ہی ہوتی ہے۔ والدین بیٹیوں کو پال پوس کر بڑا کرتے۔ زمین پر پاؤں رکھ کر چلنا سکھاتے اور پھر اسکول بھیجتے ہیں۔ کاپیوں، کتابوں اور کھلونوں سے کھیلتی ہوئی بیٹی جب جوان ہو، تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی آرزو پروان چڑھنے لگتی ہے۔

ناشتا کرنے کے بعد فاروق برات کے استقبال کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے لگا۔ اسے برات کا استقبال گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ایک نئے تعمیر شدہ شادی گھر میں کرنا تھا۔ نرگس کو ایک کمرے تک محدود کر دیا گیا۔ اس کمرے میں کسی غیر محرم مرد کا داخلہ ممنوع تھا۔ سہیلیاں ہی نرگس کی ضروریات پورا کر رہی تھیں۔ جب نرگس کو کسی بات پر چھیڑتیں، تو وہ رونے والا چہرہ بنا کر احتجاج کرتی۔ اس پر سہیلیاں قہقہہ لگا کر پورے گھر کو معطر کر دیتیں۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا کہ شام ہو گئی۔ نرگس کو بیوٹی پارلر لے جایا گیا۔ وہاں دلہن کا روپ دینے کے ساتھ ساتھ اس طرح میک اپ ہوا کہ دیکھنے والوں پر چاند کا گمان ہونے لگتا۔ ماں نرگس کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی وہ خوش کیوں نہ ہوتی، یہی دن دیکھنے کے لیے، تو اس نے رات دن اتنی مزدوری کی تھی کہ اس کی کمر میں درد رہنے لگا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ بھی لگ چکا تھا۔ کیونکہ آج اس کی لاڈلی بیٹی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر جا رہی تھی۔ نہ جانے کتنے ارمان دل میں تھے اس دن کو دیکھنے کے لیے!

سورج ڈھلتے ہی شام کے سائے زمین پر اتر آئے۔ اب ہر شخص برات کی آمد کا منتظر تھا۔ فاروق شادی گھر کی انتظامیہ سے مل کر انتظامات کو حتمی شکل دینے لگا۔ رات آٹھ بجے برات کی آمد کا اعلان ہوا، تو شہنائی نے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لڑکیاں بھاگتی ہوئی برات کا استقبال کرنے قطار بنا کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں گلاب کی پتیاں تھیں۔ انھوں نے گیندے کے پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں پہن رکھے تھے۔ سر پر گلاب کے پھول لگے تھے۔ ہر چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ زرق برق لباس پہنے لڑکیاں دولھے اور براتیوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھیں۔

برات کے آتے آتے چند نوجوان ڈھولک کی تھاپ پر خوب ناچ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ بینڈ باجے والے نوٹوں کی بیلیں ادھر ادھر اپنے تھیلے میں ڈالنے لگے۔ نرگس کے والد اور دیگر عزیزین استقبال کے لیے شادی ہال کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔ آتش بازی کا مظاہرہ زوروں پر تھا۔ جونہی یہ مظاہرہ ختم ہوا، دولھے کے والد اعجاز اور دیگر عزیز و اقارب کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنا کر شادی ہال لایا گیا۔

یہ شادی گھر نیا تعمیر ہوا تھا۔ ہر طرف خوبصورت روشنیوں کی چکاچوند دکھائی دیتی تھی۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھوایا۔ اس لمحے رات کے دس بج چکے تھے۔ عزیز و اقارب باری باری دولھا دلہن کے ساتھ تصویریں بنوانے لگے۔ ویڈیو والے فلم اور کیمرے والے تصویریں کھینچ رہے تھے کہ آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے گردش کرتے دکھائی دیے۔ اچانک تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس سے ماحول میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ شادی ہال کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مالکان بار بار بتیاں بند کرکے تقریب ختم ہونے کا اشارہ کر رہے تھے۔ لیکن انسان جب حد سے زیادہ خوش ہو، تو پھر اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ لڑکی اور لڑکے ویڈیو کے سامنے تصویریں بنوانے میں مصروف رہے۔

موسم کے تیور دیکھ کر نرگس کی رخصتی کے لیے تیاری ہو رہی

تھی کہ شادی گھر کی وہ دیوار جس کے ساتھ اسٹیج بنایا گیا تھا، دھماکے سے دلہا اور دلہن کے اوپر آ گری۔ چند لمحوں میں خوشیوں بھرا ماحول دردناک تکلیف اور سسکیوں میں بدل گیا۔ بچاؤ بچاؤ کی آوازوں نے ماحول کو سوگوار کر ڈالا۔ دیوار گرنے کی دیر تھی کہ چھت بھی مہمانوں پر آ گری۔ بجلی بند ہونے اور مسلسل بارش کی وجہ سے مدد پہنچتے ہوئے دیر ہو گئی۔ برات اور لڑکی والوں کے بیشتر افراد دیوار اور چھت کے نیچے دب چکے تھے۔ جو شادی ہال سے باہر تھے، اندھیرے کے باعث مدد کرنے سے قاصر رہے۔ ایک شخص نے ریسکیو والوں کو ایمرجنسی کال کی۔ ریسکیو والے بھی اس وقت آئے جب دلہن نرگس سمیت چھ افراد جان کی بازی ہار چکے تھے۔ دلہا اور بے شمار براتی شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ وہ پھول اور گلدستے جو فاروق نے اپنی بیٹی نرگس کو دلہن کے روپ میں دینے کے لیے خریدے تھے، انہی پھولوں کی چادر اوڑھ کر بیٹی باپ اور بھائی کے کاندھوں پر سوار قبرستان میں جا سوئی۔ اس سانحے نے نرگس کے سارے خوابوں کو تنکوں کی طرح بکھیر کے رکھ دیا۔ جب بیٹی کا جنازہ اٹھا تو فاروق اور اس کی بیوی دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے ”بیٹی! ہم تو تمہیں دلہن کے روپ میں اپنے گھر بھیجنے کی آرزو رکھتے تھے۔ لیکن تم تو ہمیں چھوڑ کر ایسی دنیا میں جا بسی ہو جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔“ نرگس کی ماں فرزانہ کے بین دل کو چیر رہے تھے۔ ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نرگس کی سہیلیوں کی چیخ پکار بھی دلوں کو چیر رہی تھی۔ کسی کو علم بھی نہ تھا کہ یہ شادی گھر جو بہت خوبصورت اور روشنیوں سے منور دکھائی دے رہا ہے، اس کی تعمیر ایسے ناقص میٹریل سے ہوئی ہے کہ وہ شادی کی تقریب کو ہی ماتم کدہ میں بدل کے رکھ دے گا۔

◆●●

عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے

کہتے ہیں کہ ایک جواں مرد کو جنگ تاتار میں زخم لگا۔ وہ زخم اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا کہ شہر کے فلاں دکاندار کے پاس اس کی دوائی ہے۔ اگر تو اس سے مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ دینے سے دریغ نہ کرے مگر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دکاندار بڑا کنجوس مشہور ہے۔ سچ ہے کہ اگر اس کے دسترخوان پر روٹی کے بجائے سورج ہوتا، تو قیامت تک دنیا میں کوئی روشن دن نہ دیکھ پاتا۔ ساتھی کی بات سن کر زخمی جواں مرد نے کہا، اگر میں اس سے وہ دوائی مانگوں، تو کیا معلوم وہ دے یا نہ دے اور اگر دے، تو وہ دوا فائدہ کرے یا نہ کرے۔ گویا کہ اس سے دوائی کا مانگنا زہر قاتل لینا ہے۔

کسی نے کیا خوب عقل کی بات کہی ہے کہ کمینوں سے خوشامد کر کے، تو نے جو کچھ مانگ لیا بدن میں، تو تو نے اس کا فائدہ پایا لیکن روح کو تو نے گھٹا لیا۔ عقل مندوں کا بیان ہے کہ اگر آب حیات آبرو عزت کے بدلے بکتا، تو کوئی عقل مند اسے ہرگز نہ خریدے گا۔ اس لیے کہ عزت سے مرنا ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ کسی عقل مند نے کیا خوب نکتہ بخشا ہے کہ اگر اچھی عادت والے کے ہاتھ سے، تو کڑوی دوا لے کر پی لے یہ بہتر ہے بہ نسبت کسی بدمزاج کے ہاتھ سے میٹھی مٹھائی کھا کر مزہ اٹھانے سے۔

درس حیات:

۱: کمینے اور کم ظرف آدمی کے ہاتھ سے کھانا پیناز ہر کھانے کے برابر ہے۔ ۲: کمینہ کچھ دے کر طعنہ زنی کرے گا جس سے روح مجروح ہو جاتی ہے۔ ۳: غیرت مند بن کر زندگی گزار، بے آبرو اور بے غیرت بن کر مت زندگی گزار۔ ۴: کنجوس اور کم ظرف کا احسان لینا ضمیر کی موت کو قبول کرنا ہے۔ ۵: کمینے اگر کچھ خوشامد سے دے بھی دیں گے مگر وہ طعنہ زنی کے نشتر سے تیرا ضمیر زخمی کرتے رہیں گے۔ ۶: کسی کو اگر کچھ دو تو نہایت خندہ پیشانی سے دو۔ ۷: اگر کسی کو کچھ نہ دے سکو، تو خندہ پیشانی سے معذرت کر لو تاکہ وہ مانگنے والے دکھی اور بددل ہو کر نہ جائیں۔

(شیخ سعدی شیرازی/ انتخاب: مطیع اللہ سہیل، مظفر گڑھ)

کوا
ایک ذہین پرندہ

محمد خلیل چودھری





چینی زبان بولنے اور کتے کی طرح بھونکنے والا

کوے کو سیانا پرندہ کہا جاتا ہے اور یہ بات سولہ آنے سچ ہے۔ چین میں پایا جانے والا ایک کوا بہت سی حیرت انگیز خوبیوں کا مالک ہے۔ یہ کوا چینی زبان بول سکتا ہے۔ اور تو اور بلی کی طرح چوہے بھی پکڑ لیتا ہے۔ یہ حیرت انگیز کوا چین کے صوبے گونگوئی کے رہائشی ماباؤ چینگ کی ملکیت ہے۔ جس نے اسے کئی برس کی محنت کے بعد یہ سب حیرت انگیز کام سکھائے ہیں۔

ماباؤ کے بقول یہ کوا چینی زبان سے عام فہم الفاظ جیسے ہیلو وغیرہ باآسانی بول سکتا ہے۔ جبکہ کتے کی نقالی کرنے کے فن میں، تو اسے عبور حاصل ہے۔ ماباؤ نے اس پالتو کوے کو ایک سال قبل تربیت دینا شروع کی۔ ماباؤ کا کہنا ہے کہ اس نے تمام کام بہت خوبی سے سیکھے۔ چوہوں کے پیچھے بھاگ کر انھیں پکڑنے کا فن سیکھنا کوے کا ایسا کام ہے جس پر اسے بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف پڑوسی اس کوے کی حرکات کی وجہ سے ماباؤ سے کافی ناراض رہتے ہیں۔

روس کے سب سے اعلیٰ تعلیمی ادارے، ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی میں سائنس دان پرندوں کی ذہنی صلاحیتوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ شعبہ حیاتیات میں سائنسدانوں نے پرندوں پر ایک دلچسپ تجربہ کیا جس میں چڑیا، الو، طوطا، مرغی اور کوے سمیت متعدد دوسرے پرندے شامل تھے۔ اس تجربے میں پرندوں کو کھانا حاصل کرنا تھا۔ پہلے مرحلے میں کھانا حاصل کرنے کے لیے پرندوں کو رسی کھینچنا تھی۔ زیادہ تر پرندے یہ کام نہیں کر سکے تاہم کچھ کامیاب ہو گئے۔ دوسرے مرحلے میں پرندوں کو چند رسیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا جبکہ آخری مرحلے میں رسیوں کو الجھا دیا گیا۔ اس طرح پرندوں کو کھانا حاصل کرنے کے لیے زیادہ ذہنی صلاحیت استعمال کرنا پڑی۔ تجربے میں کوا سب سے

ذہین نکلا جو زیادہ آزمائشوں میں کامیاب رہا۔

☆☆

کوا ایک ننھا سا پرندہ ہے۔ لیکن بڑا ذہین اور چالاک۔ اس کی ذہانت میں ہمارے لیے بہت سبق پوشیدہ ہیں۔ وہ ہر وقت ہوشیار، مستعد اور دشمن کی طرف سے چوکس رہتا ہے۔ پھر پھرتی سے بچ نکلنا اس کی خاص خوبی ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کو تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

کوے کے جسم میں پر، چونچ، ٹانگیں، پیر اور پنجے سیاہ ہوتے ہیں، بس سینہ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ وزن تقریباً ایک کلو اور لمبائی ۱۵ انچ سے ۲۱ انچ ہوتی ہے۔

اڑنے کی رفتار ۳۰ میل فی گھنٹا ہے تاہم وہ کچھ مدت کے لیے ۶۰ میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھی اڑتا ہے۔ نظر تیز ہے اور سننے کی صلاحیت شاندار۔ اسی لیے تمام اقسام کے کوے بہت چست و چالاک ہوتے ہیں، کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ جنگلی کوا عام طور پر چھے سات سال جبکہ پالتو کوا بیس برس تک زندہ رہتا ہے۔

کوے کی ۴۰ اقسام ایشیا، یورپ، افریقا اور شمالی امریکا میں پائی جاتی ہیں۔ یہ پرندہ صرف انٹارکٹکا اور جنوبی امریکا میں نہیں پایا جاتا۔ خیال ہے کہ دنیا کے اولین کوے چار پانچ کروڑ سال پہلے وسطی ایشیا میں پیدا ہوئے اور پھر ان کی اقسام دنیا بھر میں پھیل گئیں۔

کوا اونچے درخت یا بلند عمارت کے چھجے پر ٹہنیوں، تنکوں، دھاگوں اور شاخوں وغیرہ سے پیالے کی شکل کا گھونسلا بناتا ہے۔ مادہ پھر اس میں چار پانچ انڈے دیتی ہے۔ بیس دن بعد انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔

کوے بڑی محبت اور توجہ سے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ سارا دن ادھر ادھر اڑ کر ان کے لیے خوراک ڈھونڈتے اور انھیں کھلاتے ہیں۔ جب مادہ دانہ لینے جائے، تو کوا بچوں کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر مادہ کی باری آتی ہے۔ کوا اپنے بچوں کی خاطر چیل، عقاب حتیٰ کہ انسان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔

کوے کو کوئی خاص کھانا پسند نہیں، وہ کچھ بھی کھا لیتا ہے۔ مثلاً کیڑے مکوڑے، مکڑیاں، مچھلیاں، سانپ، پھل، بیج، اناج اور سبزیاں، موقع ملے، تو دوسرے پرندوں کے انڈے حتیٰ کہ بچے بھی کھا جاتا ہے۔ گھر کے کوڑے میں سے بھی کھانا چوری کر لیتا ہے۔ کوا خوراک کی تلاش میں ۵۰ میل تک سفر کر سکتا ہے۔ بھوک ہو، تو مردہ جانور بھی کھاتا ہے۔



ٹاور آف لندن کے کوے

آپ جانتے ہوں گے کہ طوفان آنے سے قبل حضرت نوحؑ علیہ السلام نے تمام پرندوں کے جوڑے اپنی کشتی میں جمع کر لیے تھے۔ جب طوفان ختم ہوا، تو حضرت نوحؑ نے ایک فاختہ بھیجی جو واپس آ گئی۔ پھر آپ نے ایک کوا بھیجا جو پلٹ کر نہ آیا۔ یوں آپ سمجھ گئے کہ اسے زمین مل گئی۔ یہ واقعہ بھی کوے کی ذہانت نمایاں کرتا ہے۔

برطانیہ میں ایک مینار ٹاور آف لندن کہلاتا ہے۔

وہاں کئی سو برس سے چار تا چھ کوے پالے جا رہے ہیں۔ دراصل برطانیہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب ٹاور پر کوے نہ رہے، تو برطانوی بادشاہت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ۱۶۷۵ء میں ٹاور پر ایک رصدگاہ بنائی گئی۔ جلد ہی ماہرین فلکیات نے تب کے بادشاہ چارلس دوم سے شکایت کی کہ ٹاور کے کوے انھیں بہت تنگ کرتے ہیں بادشاہ نے کوے مارنے کا حکم دیا۔ لیکن ٹاور کے چوکیداروں نے اسے روایت کے بارے میں بتایا، تو وہ ڈر گیا۔ یوں کوے تو ٹاور ہی میں رہے البتہ رصدگاہ گرین وچ کے مقام پر منتقل ہو گئی۔

عقاب، شاہین، چیلیں اور الو کوے کے دشمن ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے۔ دراصل جب کووں کی تعداد بڑھ جائے، تو وہ بہت شور مچاتے اور فصلوں میں گند بکھیرتے ہیں۔ اسی لیے دنیا میں کئی جگہ بندوقوں سے ان کا شکار ہوتا ہے۔



اور ذہین کوا پانی اوپر لے آیا

ماہرین کے مطابق تمام پرندوں میں کوا سب سے ذہین ہے۔ وجہ یہ کہ اس کا دماغ بڑا ہے۔ لہٰذا وہ کوئی بھی مسئلہ جلد حل کر لیتا ہے۔ کوئی انسان بندوق لیے ہوئے ہو، تو وہ جان جاتا ہے کہ یہ شکاری ہے۔ تب وہ اڑنے میں دیر نہیں لگاتا۔ لیکن کوئی آدمی کھیتی باڑی کا سامان لیے ہوئے ہو، تو کوا نہیں اڑتا، وہ جانتا ہے کہ یہ کسان ہے۔ کووں کی بعض اقسام شاخوں اور تاروں سے بطور آلہ کار کام لیتی ہیں۔ ذہانت کے معاملے میں صرف بندر اور ڈولفن کوے سے آگے ہیں۔

تبت کے باشندوں کا راہنما دلائی لامہ کہلاتا ہے۔ روایت ہے کہ جب پہلا دلائی لامہ ننھا سا تھا، تو ان کے گھر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ والدین اتنے خوف زدہ ہوئے کہ اپنے بچے کو اٹھائے بغیر بھاگ گئے۔ گھر واپسی پر انھیں یقین تھا کہ بچہ مر چکا ہو گا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دو کوے دلائی لامہ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تب سے تبت میں کوا مقدس پرندہ سمجھا جاتا ہے۔

کوا اس لحاظ سے عجیب پرندہ ہے کہ کہیں اسے خوش قسمتی کا نشان سمجھا جاتا ہے اور کہیں نحوست کا! دنیا کی بعض اقوام اسے دیوتا سمجھتی ہیں اور کچھ شیطان۔ مثلاً جزائر بحرالکاہل کے قبائلی سمجھتے ہیں کہ کائنات کوے کی تخلیق ہے۔ جبکہ سویڈن میں کوے کو بدروح یا مرے انسانوں کی روحیں سمجھا جاتا ہے۔

کوے سے کئی توہمات بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں گھر کی دیوار پر کوا خوب شور مچائے، تو کہتے ہیں کہ آج مہمان آئیں گے۔ کوے سے متعلق کئی محاورے اور ضرب المثل بھی موجود ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں ملنے والا کوا گھریلو کوا کہلاتا ہے۔ چڑیوں کی چوں چوں کے ساتھ اس کی کائیں کائیں بھی صبح سویرے ہمارا استقبال کرتی ہے۔ یہ بھی بڑا ذہین اور چالاک ہے۔ صحن میں کھانے کی کوئی شے رکھی ہو، تو موقع پاتے ہی لے اڑتا ہے۔

ذہانت کا ایک ثبوت

کوے کو اخروٹ یا کوئی سخت خول والا میوہ ملے، تو وہ اسے سڑک پر گراتا ہے۔ یوں گاڑیوں کے نیچے آ کر خول ٹوٹ جاتا ہے۔ اور کوا مزے سے اخروٹ کا مغز کھاتا ہے۔ اسی طرح وہ گھونگھا بھی بلندی سے چٹان پر پھینکتا ہے۔ چٹان سے ٹکرا کر گھونگھے کا خول سلامت نہیں رہتا۔ کوا پھر اس میں موجود کیڑا مزے سے کھاتا ہے۔ ہے نا یہ ذہین پرندہ!

بھوٹان کا قومی پرندہ

بھوٹان جنوبی ایشیا کا ملک ہے۔ کوا بھوٹان کا قومی پرندہ ہے۔ بلکہ وہاں اسے دیوتا کی حیثیت حاصل ہے۔ بھوٹان کے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی لیے شاہ بھوٹان کے تاج پر بھی ننھا سا کوا بنا ہوا ہے۔

انسانوں کی پہچان

اللہ تعالیٰ نے کوے کو یہ غیر معمولی صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ہر انسان کو چہرے سے پہچان سکتا ہے۔ اسی لیے کوئی بچہ کوے کو ستائے، تو وہ اسے یاد رکھتا ہے۔ اور موقع پا کر اس پر حملہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا کوے کو کبھی تنگ مت کیجیے۔

شاہ ہنری کا حکم

۱۵۱۵ء میں برطانیہ کے بادشاہ ہنری ہشتم نے حکم دیا کہ جو جتنے زیادہ کوے مارے گا، اسے اتنا ہی بڑا انعام ملے گا۔ دراصل اس زمانے میں کوے کو خونخوار پرندہ سمجھا جاتا تھا، اسی لیے یہ شاہی حکم جاری کیا گیا۔

امریکی پیچھے پڑ گئے

دوسری جنگ عظیم کے وقت امریکا میں اناج کی کمی ہوگئی۔ انہی دنوں کوے بکثرت کھیتوں میں مکئی، گندم وغیرہ اجاڑنے لگے۔ لہٰذا امریکی حکومت نے کوے کو عوام کا دشمن قرار دے کر لوگوں سے اپیل کی کہ انھیں زیادہ سے زیادہ مارا جائے۔ یوں ہزاروں کوے ہلاک کر دیے گئے۔

راز فاش ہوگیا

جنوبی مشرقی انگلینڈ کے علاقے کینٹ سے ایک دلچسپ خبر سامنے آئی جب کووں نے زیر زمین دبائے گئے کوڑے کرکٹ کے تھیلے کھود کر نکالنا شروع کر دیے۔ کووں کی اس حرکت سے کوڑا کرکٹ، تو زمین پر بکھر گیا لیکن پولیس کو کچھ خفیہ قسم کے کاغذات ملے جن میں بنک سے متعلق اہم معلومات درج تھیں۔ یہ کاغذات کوڑے کرکٹ کے ساتھ زمین میں دبا دیے گئے تھے لیکن کووں نے راز فاش کر دیا۔

درد کی شدت ناپنے والا سافٹ ویئر

امریکی ماہرین نے چہرے کے نقوش سے درد کی شدت ناپنے والا سافٹ ویئر تیار کر لیا ہے۔ بچوں سمیت بڑے بھی کبھی کبھی اپنے درد کی شدت ڈاکٹر کو ٹھیک سے بتا نہیں پاتے، مگر سافٹ ویئر کی ایجاد سے اب یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ امریکی ماہرین نے ایسا سوفٹ ویئر تیار کیا ہے جو چہرے کے تاثرات دیکھ کر درد کی شدت بتاتا ہے۔ ماہرین نے پہلے چہرے کے تاثرات کمپیوٹر میں فیڈ کیے پھر انھیں سافٹ ویئر سے منسلک کر دیا۔ ماہرین نے سوفٹ ویئر کو طبی دنیا میں اہم پیش رفت قرار دیا ہے۔

(انتخاب: عارفہ انیس، ملیر ہالٹ کراچی)

روشن ستارے



ڈاکٹر نرگس ماولوالا



عاصم خواجہ



ڈاکٹر عمر سیف



میر ظفر علی



ڈاکٹر ارجمند ہاشمی

ذہانت و فطانت سے مالا مال

۵ پاکستانی ہیرو

دنیا بھر میں ملک و قوم کا نام روشن کرنے والے باصلاحیت پاکستانیوں کی سرگزشت

سید عاصم محمود

اللہ تعالیٰ نے وطن عزیز کو سیکڑوں بیش قیمت نعمتوں سے نوازا ہے، مگر بعض پاکستانی کفران نعمت کرتے ہوئے اٹھتے بیٹھتے اپنے دیس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ خرابی ان میں ہوتی ہے، مگر اپنی ناکامیوں کا ذمے دار وہ پاکستان کو ٹھہراتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں، اپنی ہی کشتی میں خود سوراخ کرنا!

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سڑسٹھ برس میں پاکستانیوں نے سائنس و ٹیکنالوجی اور علم و ادب سے لے کر کھیلوں تک دنیا والوں پر اپنی صلاحیتوں کا سکہ بٹھایا ہے۔ آج بھی دنیا بھر میں ایسے پاکستانی مختلف شعبہ جات میں کارنامے دکھا رہے ہیں جنھیں پاکستان میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ یہ پاکستانی اس سچائی کا زندہ ثبوت ہیں کہ انھیں اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع ملے، تو وہ ذہانت و محنت میں کسی سے کم نہیں۔

ذیل میں ایسے پاکستانی جوہر قابل کا تذکرہ پیش ہے۔ جنھوں نے پچھلے چند برس کے دوران اپنے اپنے شعبے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھے اور اپنے پرائے، سبھی سے داد پائی۔ یہ پاکستانی قوم کے وہ ہیروز ہیں جو شہرت سے بے نیاز ہو کر کام

کرنے میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر عمر سیف

پاکستان کے یہ نوجوان جوہر قابل سافٹ ویئر ٹیکنالوجی کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے پاکستانی معاشرہ بدل رہے ہیں۔ خاص طور پر پنجاب انفارمیشن ٹیکنالوجی بورڈ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ صوبہ پنجاب میں آئی ٹی انقلاب لانے پر کمربستہ ہیں۔

لاہور میں جنم لینے والے عمر سیف صرف ۲۲ سال کے تھے، جب انھوں نے دنیا کی مشہور ترین امریکی درس گاہ، ایم آئی ٹی سے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں پی ایچ ڈی کی۔ اس عمر میں بیشتر طلبہ تعلیم مکمل کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ عمر پھر ایم آئی ٹی ہی میں پڑھانے لگے جو پاکستانی کی حیثیت سے ان کے لیے اعزاز کی بات تھی۔

۲۰۰۵ء میں عمر وطن واپس چلے آئے۔ انھوں نے نہایت پرکشش تنخواہ اور معزز عہدے والی ملازمت کو صرف اس لیے خیرباد کہا کہ اپنے وطن کی خدمت کر سکیں۔ وہ پھر لمز (لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز) میں پڑھانے لگے۔ جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ پاکستانی طلبہ و طالبات بھی ایم آئی ٹی کے طالبان علم کی طرح ذہین و فطین ہیں، بس انھیں ترقی کرنے اور اپنی صلاحیتیں دکھانے کے مواقع نہیں ملتے۔

۲۰۱۱ء میں دنیائے ٹیکنالوجی کے مشہور ترین رسالے ایم آئی ٹی ٹیکنالوجی ریویو نے عمر سیف کو دنیا کے ''۳۵'' بہترین نوجوان موجدوں میں شمار کیا۔ عمر پہلے پاکستانی ماہر ٹیکنالوجی ہیں جنھیں اس فہرست میں شامل ہونے کا اعزاز ملا۔ اسی فہرست میں گوگل اور فیس بک کے بانی، سرگئی برن اور مارک زکربرگ بھی شامل تھے۔

اسی سال عمر سیف کو پنجاب انفارمیشن ٹیکنالوجی بورڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ پچھلے چار برس کے دوران عمر سیف کی قیادت میں پنجاب کے کئی سرکاری محکموں میں بذریعہ انفارمیشن ٹیکنالوجی انقلاب آچکا۔

سیلاب کے خطرے سے نمٹنے کی خاطر عمر سیف کی قیادت میں بورڈ کے ماہرین نے ''فلڈ مانیٹرنگ ڈیش بورڈ'' ایجاد کیا۔ یہ ڈیش بورڈ سیلاب سے متعلقہ تمام سرکاری محکموں کو لحظہ بہ لحظہ کی خبر سے آگاہ رکھتا ہے۔ یوں اب صوبے میں سیلاب سے بچاؤ کے عملی اقدامات کرنا آسان مرحلہ بن چکا۔

اسی طرح بورڈ نے حال ہی میں پنجاب پولیس کو ''۱۰۰۰'' بائیو میٹرک آلات فراہم کیے ہیں۔ یہ آلات صوبہ بھر کے ۷۰۹ تھانوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔ ان آلات میں نصب تھری جی انٹرنیٹ سبسکرائبر آئیڈینٹی موڈولز (SIMs) نادرا کے ڈیٹا بیس سے منسلک ہیں۔

جب بھی پولیس نے کسی مشکوک فرد کو گرفتار کیا، درج بالا آلے کی مدد سے فوراً اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کی جا سکیں گی۔

ڈاکٹر عمر سیف اب ''تھانہ کلچر'' ختم کرنے کی خاطر انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مدد لے رہے ہیں۔ پہلے مرحلے میں لاہور کے ۲۵ تھانوں میں سے ۱۷ تھانے ''پولیس اسٹیشن آفس ریکارڈ مینجمنٹ سسٹم'' کے تحت کمپیوٹرائزڈ کیے جا چکے۔

اس سسٹم کے ذریعے کوئی بھی پاکستانی آن لائن ہو کر بھی رپٹ (ایف آئی آر) درج کرا سکے گا۔ یوں پاکستانیوں کی تھانیدار کے خرخشے سے جان چھوٹ جائے گی۔

عمر سیف کی قیادت میں حال ہی میں صوبہ پنجاب میں ''ای اسٹیمپنگ پروجیکٹ'' شروع ہوا ہے۔ اس کے ذریعے پہلے مرحلے میں لاہور کا کوئی بھی شہری انٹرنیٹ یا موبائل کے ذریعے جان سکے گا کہ کہیں وہ جعلی اسٹیمپ پیپر تو استعمال نہیں کر رہا؟ اس منصوبے کو رفتہ رفتہ پورے صوبے میں پھیلایا جائے گا۔

پنجاب انفارمیشن ٹیکنالوجی بورڈ ضلعی کچہریوں کے خاتمے سے لے کر کرپشن ختم کرنے تک وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر سیف کی قیادت میں

بورڈ ایسی انقلابی کمپیوٹر ایجادات سامنے لا رہا ہے جنھوں نے سرکاری محکموں میں کام کا انداز بدل ڈالا ہے۔ پہلے جو کام مکمل ہونے میں کئی دن لگتے تھے، وہ اب چند گھنٹوں میں انجام پا جاتا ہے۔

امید واثق ہے، اگر عمر سیف اسی طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں سرگرم عمل رہے، تو وہ کم از کم پنجاب حکومت میں انتظام یا گورننس کا انداز تبدیل کروا لیں گے۔ ان کی سعی مسلسل سے مثبت اور خوشگوار تبدیلیاں اہل پنجاب پر عیاں ہو چکیں۔ ۲۰۱۴ء میں ان کی شاندار خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر نوید سید

عرصہ دراز سے انسان کی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح مشین نما انسان تخلیق کر لے۔ سائنسی اصطلاح میں ایسا انسان "سائبورگ" کہلاتا ہے۔ یہی تصور ذہن میں بسائے لوگوں نے "دی سکس ملین ڈالر مین" اور "ٹرمینیٹر" جیسی فلمیں بنا ڈالیں۔ لیکن اب تک حقیقی معنوں میں مشین نما انسان "ایجاد" نہیں ہو سکا۔

تاہم دنیا بھر میں سائنس دان اسی موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ انہی میں ایک پاکستانی ماہر، پروفیسر نوید سید بھی شامل ہیں۔ آپ کینیڈین شہر کالگری (Calgary) کی کالگری یونیورسٹی میں خلوی حیاتیات (Cell biology) اور اناٹومی کے پروفیسر ہیں۔

پروفیسر نوید سید معمولی سائنس دان نہیں۔ آپ کو دنیا کے وہ پہلے ماہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے جو انسانی دماغ کے خلیوں کو ایک سیلی کون چپ (Silicon Chip) سے جوڑ چکے۔ پروفیسر صاحب کی ایجاد کردہ چپ کے ذریعے دماغ کو پیغامات بھجوانا اور وصول کرنا ممکن ہے۔ اس کی مدد سے دماغی امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ممکن ہو گیا کہ انسانی جذبات ایک مشین میں داخل کیے جا سکیں۔

پروفیسر صاحب نے چند سال قبل ایسی حیرت انگیز سیلی کون چپ ایجاد کی تھی جو انسانی دماغ سے تال میل کر سکتی ہے۔ اب وہ اسے مزید بہتر بنانے کے لیے تجربات میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا ہے، اس سیلی کون چپ کی مدد سے اگلے بیس برسوں میں حقیقی "مشینی انسان" وجود میں آ جائیں گے۔

ڈاکٹر عمر سیف کی طرح پروفیسر نوید سید بھی نابغہ روزگار ہیں۔ انھوں نے کم عمری ہی میں لیڈز یونیورسٹی، برطانیہ سے نیوروفزیالوجی میں پی ایچ ڈی کر لیا۔ ۱۹۸۸ء سے کالگری یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ آپ اپنی قیمتی تحقیقات کے باعث کئی سائنسی ایوارڈ حاصل کر چکے۔

پروفیسر عاصم خواجہ

ہارورڈ یونیورسٹی، امریکا کا شمار دنیا کی بہترین اور مستند یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ کئی ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر چکے۔ پاکستان کے حوالے سے ۲۰۰۹ء میں یہ تاریخ ساز خبر سننے کو ملی کہ ایک پاکستانی ماہر تعلیم اس معزز یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

عاصم اعجاز خواجہ لندن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین جلد بسلسلہ ملازمت کانو، نائیجیریا چلے گئے۔ چناںچہ عاصم نے آٹھ برس کانو میں گزارے۔ پھر وہ والدین کے ساتھ لاہور آ گئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر میں پائی۔

پاکستان سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایم آئی ٹی، امریکا جا پہنچے۔ انھوں نے وہاں سے معاشیات اور ریاضی میں گریجویشن کی۔ بعد ازاں ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری پائی۔

۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر عاصم خواجہ نے اس امر پر تحقیق کی کہ حج ایک حاجی کی معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی زندگی پر کس قسم کے مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس منفرد تحقیق کو عالم اسلام سے

علاوہ دیگر اسلامی علمی حلقوں میں بھی سراہا گیا۔

اواخر ۲۰۰۹ء ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹر عاصم کو بطور اسسٹنٹ پروفیسر ملازمت دے دی۔ یوں آپ کو ہارورڈ یونیورسٹی میں تعلیم دینے والے پہلے پاکستانی پروفیسر بننے کا یادگار اعزاز حاصل ہوا۔

ڈاکٹر عاصم کا تقرر یونیورسٹی کے مشہور کالج، جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ میں ہوا۔ آپ وہاں پبلک پالیسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ نے دل لگا کر کام کیا۔ سینئر پروفیسر اور طالبان علم ڈاکٹر عاصم کی کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ چناں چہ آج وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے مکمل پروفیسر بن چکے۔ معاشیات، تعلیم اور مالیات کے سلسلے میں آپ کی تحقیق عالمی شہرت رکھتی ہے۔ آپ دی اکنامسٹ، نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، الجزیرہ، بی بی سی اور سی این این جیسے بڑے میڈیا نیٹ ورکس کے پروگراموں میں شریک ہو چکے۔ ڈاکٹر عاصم ہارورڈ میں ایک پروگرام، ایوی ڈینس فار پالیسی ڈیزائن (Evidence for Policy design) کے شریک ڈائرکٹر بھی ہیں۔

ڈاکٹر عاصم خواجہ دنیا بھر سے آنے والے ذہین طالب علموں کو پڑھاتے اور ملک و قوم کا نام روشن کرتے ہیں۔ پاکستانی معیشت کو بہتر بنانا بھی ان کی تحقیق کا اہم موضوع ہے۔ امریکا میں اس پاکستانی جوہر قابل کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگیے کہ انھیں ییل، فورنیا یونیورسٹی برکلے، وینڈر بلٹ اور ڈارٹماؤتھ جیسی اعلیٰ یونیورسٹیوں سے پروفیسری کی پیش کش ہو چکی۔ ان میں سے کیلی فورنیا یونیورسٹی کا شمار بھی "دنیا کی دس بہترین یونیورسٹیوں" میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ارجمند ہاشمی

عام پاکستانیوں کو اپنے سیاست دانوں سے عموماً یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اقتدار میں آتے ہی عوام کو بھول جاتے ہیں۔ وہ پھر عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے نہیں بناتے بلکہ جائز و ناجائز طریقوں سے کمائی کے دھندے پہ لگ جاتے ہیں۔ ایسے سیاست دانوں کو ڈاکٹر ارجمند شاہین سے سبق سیکھنا چاہیے۔

امریکی تاریخ میں یہ قابل فخر پاکستانی پہلے مسلمان ہیں جو مسلسل تین بار ایک امریکی شہر کے میئر منتخب ہوئے۔ ان کی داستان حیات یہ سچائی اجاگر کرتی ہے کہ انسان دیانت دار، محنتی اور پرخلوص ہو تو وہ مخالفین کو بھی اپنا ہمدرد بنا لیتا ہے۔ ڈاکٹر ارجمند کے کارنامے پاکستانی قوم کا سر فخر سے بلند کر دیتے ہیں۔

۵۴ سالہ ڈاکٹر ارجمند شاہین کراچی میں پیدا ہوئے۔ والد پاک فضائیہ میں افسر تھے۔ وہ بہ حیثیت ڈیفنس اتاشی ابوظہبی چلے گئے۔ چناں چہ ڈاکٹر ارجمند کا بچپن وہیں گزرا۔

بعدازاں وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کراچی چلے آئے۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھنے کے بعد وہ ۱۹۸۶ء میں امراض قلب میں تخصص (اسپیشلائزیشن) کرنے امریکا چلے گئے۔ تعلیم کر چکے تو انھیں ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی۔

امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر ٹیمپا میں امریکی افواج کی ایک کمانڈ، سینٹ کام (یونائیٹڈ اسٹیٹس سینٹرل کمانڈ) کا ہیڈ کوارٹر واقع ہے۔ ارجمند شاہین بحیثیت سول ڈاکٹر وہیں تعینات ہوئے۔

ہنس مکھ طبیعت اور محنتی ہونے کے باعث یہ پاکستانی نوجوان جلد ہیڈ کوارٹر میں مقبول ہو گیا۔ کئی امریکی فوجی ڈاکٹر ارجمند کے دوست بن گئے۔ ان میں جنرل ٹومی فرینکس بھی شامل تھے جو بعدازاں سینٹ کام کے سربراہ بنے۔ وہیں مستقبل کے پاکستانی صدر، پرویز مشرف سے بھی ڈاکٹر ارجمند کی پہلی ملاقات ہوئی جو دوستی میں بدل گئی۔

۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر ارجمند شاہین کو ایک اہم ذمے داری سونپی گئی۔ انھیں پیرس شہر کے سب سے بڑے اسپتال (پیرس ریجنل میڈیکل سینٹر) میں شعبہ امراض قلب کی بنیاد رکھنی تھی۔

پیرس امریکی ریاست ٹیکساس میں واقع ایک معروف شہر

ہے۔ شہر کے باسی اسے "دنیا میں دوسرا بڑا پیرس" قرار دے کر اظہار فخر کرتے ہیں۔ شہر میں ایفل ٹاور کی ۶۵ فٹ بلند نقل بھی واقع ہے۔ شہر میں سفید فاموں کی اکثریت ہے۔ اور ماضی میں وہ مقامی سیاہ فاموں کو بہت ظلم وستم کا نشانہ بنا چکے۔ آج بھی پیرس میں اچھا خاصا نسلی تعصب موجود ہے۔

یہی وجہ ہے، ڈاکٹر ارجمند شاہین شہر میں پہنچے تو بیشتر سفید فاموں نے انھیں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ نفرت کی ایک وجہ مسلمان ہونا بھی تھی۔ مگر اپنی خوش باش طبیعت اور محنت کے باعث پاکستانی ڈاکٹر نے پیرس میں بھی اپنے سیکڑوں دوست بنا لیے۔ پھر جلد ہی ایک انوکھے واقعے نے انھیں پورے شہر میں مشہور شخصیت بنا دیا۔

ہوا یہ کہ ستمبر ۲۰۰۶ء میں صدر پاکستان، پرویز مشرف جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے امریکا آئے۔ جب اجلاس ہو چکا تو وہ اپنا طبی معائنہ کرانے اپنے پرانے دوست ڈاکٹر ارجمند کے پاس چلے آئے۔ اس وقت امریکی حکومت کا چہیتا ہونے کے باعث جنرل مشرف کا طوطی بول رہا تھا۔

چناں چہ وہ بڑے طمطراق سے پیرس پہنچے۔ ان کا جلوس جدید ترین مسلح ہیلی کاپٹروں اور سیکڑوں گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ گارڈز کی بھرمار تھی۔ غرض پاکستانی صدر کے دورے نے پرسکون شہر میں خاصی ہلچل مچا دی۔

ڈاکٹر ارجمند شاہین خدمت خلق کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ بلدیہ پیرس کے کونسلر کا انتخاب لڑا جائے۔ ڈاکٹر صاحب سمجھتے تھے، کونسلر بن کر وہ شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے وسیع پیمانے پر کام کر سکتے ہیں۔

جیسے ہی ڈاکٹر ارجمند نے الیکشن بلدیہ میں کھڑے ہونے کا اعلان کیا، شہریوں کے مابین زبردست بحث چھڑ گئی۔ بعض امریکیوں کو یقین تھا کہ وہ کونسلر بنتے ہی یہ کوشش کریں گے، پیرس میں ایک مسجد بن جائے۔ کچھ شہریوں کا خیال تھا، وہ ان پر شریعت تھوپنے کی سعی کر سکتے ہیں۔

لطیفہ

منا... (ابو سے) مجھے آپ اپنی جیسی آواز نکالنا سکھا دیں۔
ابو... وہ کیوں؟
منا... تاکہ فون کے ذریعے میں سکول سے چھٹی لے لیا کروں۔
(آمنہ رمضان، ضلع پاکپتن)

غرض آغاز میں ڈاکٹر ارجمند کو خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جلد ہی ایک بڑی خوبی نے ان کے حق میں راہ ہموار کر دی۔ یہی نہیں، اسی خوبی کی وجہ سے وہ پیرس کے میئر بھی بن گئے۔

ہوا یہ کہ بلدیہ پیرس میں کرپشن تو نہیں تھی، مگر اقربا پروری کا دوردورہ تھا۔ جو شہری کونسلر بن جاتا، وہ پھر اپنے علاقے میں عزیز و اقارب اور دوستوں ہی کو ترقیاتی منصوبوں کے ٹھیکے دیتا۔ اس عمل میں خرابی یہ تھی کہ بعض اوقات کام کرنے والے ڈنڈی مار جاتے اور اپنی ذمے داری صحیح طرح انجام نہ دیتے۔

ڈاکٹر ارجمند کے حامیوں نے شہریوں کو باور کرایا کہ وہ پیرس میں تن تنہا ہیں اور یہاں ان کا کوئی رشتے دار یا قریبی دوست نہیں بستا۔ چناں چہ ان کے کونسلر بننے سے بلدیہ میں اقربا پروری کا خاتمہ ہو گا۔ نیز صرف استحقاق (میرٹ) پر لوگوں کو ترقیاتی منصوبوں کے ٹھیکے ملیں گے۔

یہ خوبی "درست انتظام" سے پیار امریکیوں کو بہت بھلی لگی۔ لہٰذا ڈاکٹر ارجمند نہ صرف کونسلر منتخب ہوئے بلکہ کل سات میں سے چار کونسلروں نے انھیں ووٹ دے کر ان کو پیرس کا پہلا مسلمان میئر بنا دیا۔ قدرتاً ایک اہم عوامی عہدہ پا کر ڈاکٹر ارجمند کو بہت خوشی و مسرت ہوئی۔

انھوں نے میئر بنتے ہی شہر کی ظاہری حالت سنوارنے پر توجہ دی۔ سڑکوں کے کنارے نئے درخت لگوائے۔ سبھی ترقیاتی منصوبوں کے ٹھیکے میرٹ پر دیے۔ خاص بات یہ کہ وہ مسلمان بادشاہوں کی طرح بے وقت بلدیاتی دفاتر میں چھاپے مارنے لگے۔ ان کے اس متحرک پن سے بلدیہ کے سبھی ملازمین بھی

مستعدی سے کام کرنے میں محو ہو گئے۔ غرض پیرس کا میئر بن کر انھوں نے شہر کا نقشہ بدل ڈالا۔

یوں مسلمانوں کو پسند نہ کرنے والے امریکی بھی ان کی قائدانہ صلاحیتوں کے معترف ہو گئے۔ چناں چہ اس سال ماہ جون میں ڈاکٹر ارجمند کو تیسری بار میئر شہر منتخب کیا گیا جو بہت اعزاز کی بات ہے۔ امریکا میں صرف وہی سیاسی لیڈر چل پاتا ہے جو ٹھوس کام کر کے دکھائے۔

ڈاکٹر ارجمند شاہین کی خاصیت یہ ہے کہ میئر بن کر بھی وہ بطور ماہر امراض قلب اپنی حساس ذمے داری انجام دیتے رہے۔ ان کا معمول ہے کہ وہ صبح اٹھ کر نماز پڑھتے اور پھر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ یہ کام وہ میئر اور ڈاکٹر دونوں کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اسپتال سے فارغ ہوں، تو گاڑی میں میئر کے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں دس پندرہ منٹ میں اپنے کام نمٹاتے اور پھر واپس اسپتال! وہاں وہ مریض کا آپریشن کرتے اور اس کی بند شریانیں کھولتے ہیں۔ پچیس تیس منٹ بعد وہ شہر کے پمپنگ اسٹیشن کا معائنہ کر رہے ہوتے ہیں۔

امریکی قوانین کی رو سے ایک شخص تین بار ہی کسی شہر کا میئر بن سکتا ہے۔ لہٰذا ۲۰۱۷ء کے میئر الیکشن میں ڈاکٹر ارجمند کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مگر انھوں نے کامیابی سے چھے سال میئر رہ کر دنیا والوں کو بتا دیا کہ پاکستانی بھی بہت اچھے منتظم، سیاست دان اور دیانت دار رہنما ہیں۔

میر ظفر علی

۲۰۰۳ء میں جب پاکستانی فلم ساز و ڈائریکٹر، شرمین عبید چنائے نے اپنی انگریزی فلم "سیونگ فیس" پہ آسکر ایوارڈ جیتا تو بہت خوشیاں منائی گئیں۔ دعویٰ کیا گیا کہ یہ کسی بھی پاکستانی فنکار کو ملنے والا پہلا آسکر ایوارڈ ہے۔ مگر یہ صریح جھوٹ ہے۔

۳۹ سالہ میر ظفر علی وہ پہلے پاکستانی ہیں جنھوں نے آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔ یہی نہیں، وہ اب تک تین آسکر ایوارڈ جیت چکے۔ میر ظفر علی "ویژول ایفیکٹس اسپیشلسٹ" ہیں۔ وہ کمپیوٹر اور دیگر آلات کی مدد سے فلموں میں حیران کن، جادوئی اور محیر العقول مناظر تخلیق کرتے ہیں۔

میر ظفر علی کراچی میں پیدا ہوئے۔ سائنس فکشن فلمیں دیکھنے کے شوقین تھے اس لیے اسپیشل ایفیکٹس کی دنیا میں آ گئے۔ اس فن کے اسرار و رموز سیکھنے کی خاطر ایک امریکی ادارے، سوانا کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن میں زیر تعلیم رہے۔ تعلیم مکمل ہوئی، تو انھیں ایک امریکی کمپنی، ڈیجیٹل ڈومین میں بحیثیت اسپیشل ایفیکٹس ماہر ملازمت مل گئی۔ کمپنی سے منسلک ماہرین فلموں میں فوق البشر اور خصوصی مناظر تخلیق کرتے تھے۔

میر ظفر کی پہلی فلم 'دی ڈے آفٹر ٹومارو' تھی جس میں عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) سے جنم لینے والے موسمی حالات فلمائے گئے ہیں۔ فلم میں میر ظفر علی نے ایسی بلند و بالا سمندری لہر تخلیق کی جس نے اونچی عمارتوں کو بھی ڈھانپ لیا۔

یہ پاکستانی ہنرمند اب تک ہالی وڈ کی چودہ فلموں میں مختلف اسپیشل ایفیکٹس میں ساتھیوں کے ساتھ آسکر ایوارڈ جیتے۔

یہ میر ظفر علی ہی ہیں جنھوں نے سپائیڈر مین تھری میں منفی کردار "وینوم" (Venom) تخلیق کیا۔ اسی طرح مشہور فلم "لائف آف پائی" میں ڈیجیٹل شیر بنانے میں اہم حصہ لیا۔ ان کی شخصیت اس امر کی دلیل ہے کہ دنیائے سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی پاکستانی اپنے ہنر کا سکہ جمانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ وہ چند پاکستانی ہیروز ہیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے پوری دنیا میں ملک و قوم کا نام روشن کر دیا۔ یہی پاکستانی تاریک ترین راہوں میں بھی امید کے چراغ روشن کرتے اور دوسروں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ انھی پاکستانیوں کی سعی سے پاکستان رفتہ رفتہ مستحکم و مضبوط ملک میں ڈھل رہا ہے اور ان شاءاللہ آنے والے برسوں میں ایک خوشحال و ترقی یافتہ مملکت بن کر ابھرے گا۔

◆◆◆

فیصل آباد کی پہلی خاتون عالمہ

ایک باہمت لڑکی کا سبق آموز قصہ جو جس نے بصارت سے محروم ہونے کے باوجود نہ صرف تین ایم اے کیے بلکہ درسِ نظامی کا آٹھ سالہ کورس بھی کامیابی سے مکمل کرلیا

غلام سجاد

ہیلن کیلر کا قول ہے "مثبت سوچ آپ کو ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتی ہے اور اس دنیا میں امید اور اعتماد کے بغیر آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔"

کچھ ایسے ہی خیالات فیصل آباد سے تعلق رکھنے والی ۲۵ سالہ ثاکل شہزادے کے ہیں جس نے بصارت سے محروم ہونے کے باوجود اپنے جوش و جذبے اور اعتماد کو ڈگمگانے نہ دیا اور محنت کے بل بوتے پر کامیابی کی منازل طے کرتی چلی گئی۔ ثاکل کی زندگی معذور و صحت مند انسانوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ۱۵ سال کی تھی کہ بصارت سے محروم ہوگئی۔ مگر آنکھوں کی تاریکی اس میں بھڑکتی امید و جذبے کی شمع نہ بجھا سکی۔ معذوری کے عالم میں اس نے ایک نہیں تین ایم اے کیے اور فیصل آباد کی پہلی "خاتون عالمہ" ہونے کا اعزاز بھی اپنے نام کرلیا۔

دیکھا گیا ہے کہ کئی خواتین و حضرات صحت یاب ہونے اور مناسب سہولیات میسر ہونے کے باوجود معذوری کو عذر بنا کر روزمرہ کام کاج اور تعلیم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ ان میں ترقی کرنے کا جذبہ ہوتا ہے نہ زندگی کا کوئی واضح مقصد، وہ بس اپنی جسن میں تمن خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو تحریک دینے کی خاطر اس دلیر اور باہمت لڑکی کا انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے جس نے انتہائی کٹھن اور ناموافق حالات کے باوجود کامیابیاں پائیں اور ایک روشن مثال بن گئی۔

☆☆



شمائل ۳ جولائی ۱۹۸۹ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئی۔ گیارھویں جماعت میں تھی کہ اچانک آنکھوں میں انفیکشن ہوا۔ مقامی ڈاکٹروں کو دکھایا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کے مصداق بصارت مزید کم ہوتی چلی گئی۔ آخر ڈاکٹروں نے شمائل کے والدین کو اسے لاہور لے جانے کا مشورہ دیا۔ پچھلے دس برس سے شمائل اور اس کی والدہ بصارت کی تلاش میں کئی اسپتالوں کے چکر کاٹ چکیں، آنکھ کے آپریشن بھی کروائے، مگر تاحال شفا نہیں ملی۔

آنکھوں پر چشمہ لگائے خوش شکل اور خوش لباس شمائل بظاہر تندرست نظر آتی ہے۔ میں نے پوچھا کہ بصارت جانے کے بعد آپ کو کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

اس نے بتایا ''شروع میں، تو بہت مسائل پیدا ہوئے مگر آہستہ آہستہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ مثلاً شروع میں کالج جانا، دوستوں سے گپ شپ کرنا اور سب سے بڑھ کر ریکارڈنگ سن کر سبق یاد کرنا کافی تکلیف دہ مسئلہ تھا۔ سبق کی ریکارڈنگ کے لیے مجھے کسی نہ کسی مددگار کی ضرورت ہوتی۔ اس سلسلے میں والدہ نے میرا بہت ساتھ دیا مگر انھوں نے دیگر بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرنا اور گھر کے کام کاج بھی نبٹانے ہوتے، لہٰذا میں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی۔ کبھی کبھار کوئی بہن یا سہیلی بھی مجھے سبق ریکارڈ کر دیتی۔

جب آنکھ میں مسئلہ پیدا ہوا، تو آپ نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا یا اس مسئلے کو نظرانداز کرتی رہیں؟ یہ سوال سن کر وہ گویا ہوئی ''علاج تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا۔ شہر بھر کے تمام اچھے نجی اور سرکاری اسپتالوں میں علاج ہوا۔ ڈاکٹروں کی کوشش سے ایک آنکھ آپریشن ہونے کے بعد ٹھیک بھی ہو گئی مگر میں نے دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔ اس وجہ سے وہ آنکھ پھر خراب ہو گئی۔''

میں نے پوچھا کہ ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق آنکھ میں بنیادی مسئلہ کیا ہوا تھا؟ شمائل نے بتایا ''میں اس وقت ڈریس میکنگ کا کورس کر رہی تھی، جس میں رنگوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مسلسل رنگ کی دیکھنے کی وجہ سے آنکھوں میں انفیکشن ہو گیا۔ پہلے پتلی پر سوجن پیدا ہوئی اور پھر نظر آنا بند ہو گیا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی آنکھوں کا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ سر میں درد ہوا نہ بخار آیا بس ایک دم بینائی چلی گئی۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا امتحان لے رہا ہے۔ ان شااللہ میں ثابت قدم رہ کر اس امتحان میں پورا اتروں گی۔ مجھے قوی یقین ہے کہ وہ کریم و بصیر جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، میری بصارت ضرور مجھے واپس کر دے گا۔''

رنگوں سے متعلق سن کر مجھے تجسس ہوا کہ کہیں کوئی کیمیکل آنکھ میں چلے جانے سے تو یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا؟ شمائل نے بتایا ''نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے بھی چیک کیا تھا۔ آنکھ میں کوئی کیمیکل وغیرہ نہیں گیا۔ جب میں ڈاکٹر کے پاس گئی، تو اس نے آنکھوں میں ڈالنے کے لیے ہائی پوٹینسی آئی ڈراپس دیے۔ میں وہ استعمال کرتی رہی تاہم آنکھوں پر سے سوجن نہ گئی۔ مجھے آنکھوں میں سرخ دھاگے ناچتے محسوس ہوتے۔ پہلے تو ایک آنکھ میں درد ہوتا تھا مگر پھر دوسری میں بھی درد ہونے لگا۔ ڈاکٹر کو بتایا، تو انھوں نے آنکھ میں انجیکشن لگا دیا۔ اس کے بعد جو تھوڑا بہت نظر آتا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔

''جب صورت حال گمبھیر ہوئی، تو انھوں نے یہ کہہ کر مجھے لاہور جانے کا کہا کہ اب کیس میری بساط سے باہر ہے۔ لہٰذا آپ لاہور سے علاج کرائیے۔ لاہور میں کلمہ چوک کے قریب واقع زینب اسپتال میں ڈاکٹر طارق چیمہ کو آنکھیں چیک کرائیں۔ انھوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ ان شااللہ آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن آپ کو ایک سال تک علاج کرانا پڑے گا۔ چونکہ پہلے آپ تیز دوائی استعمال کرتی رہیں اس لیے آپ کی آنکھیں بہت نرم ہو چکی ہیں۔ ہم فوری طور پر آپریشن نہیں کر سکتے۔ پہلے آنکھوں کو آپریشن کے قابل بنانا ہو گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر آپ شروع ہی میں میرے پاس آ

جاتیں تو مسئلہ اتنا نہ بگڑتا۔ بلکی سی سوجن کی تہ آنکھ کے پردے پر چڑھ آئی تھی، وہ ہم آرام سے ہٹا دیتے اور آپ کو نظر آنے لگتا۔ مگر اب آنکھ کافی حد تک خراب ہو چکی۔ کئی آپریشن کرنا پڑیں گے تب جا کر نظر آنا شروع ہوگا۔"

شمائل نہایت صبر و تحمل سے اپنی داستان سنا رہی تھی۔ میں اس کے صبر پر دل ہی دل میں اُسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ اس دوران مجھے خیال آیا کہ بصارت چلے جانے کے بعد انہیں زمانے سے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوست، رشتے دار یا اہل خانہ میں سے کسی کا رویہ تبدیل ہوا ہو۔

یہ سوال سن کر وہ گویا ہوئی "الحمدللہ مشکلات کے ان لمحوں میں سب نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ سہیلیاں، رشتہ دار اور والدین، بہن بھائی سب نے میرا ساتھ دیا اور میری ڈھارس بندھائی۔ کسی نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی اور نہ مجھے ٹوٹنے دیا۔ گھر کے معاملات میں امی نے میرا ساتھ دیا اور گھر سے باہر ابو نے میری ضروریات کا خیال رکھا۔ میرے اہل خانہ نے تعلیم حاصل کرنے کے دوران بھی میرا بھرپور ساتھ دیا۔"

تعلیم کا سن کر میں نے پوچھا، بصارت جانے کے بعد بھی آپ میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود رہا، اس میں کمی نہیں ہوئی؟

شمائل نے دلیرانہ انداز میں کہا "حوصلے ان کے ٹوٹتے ہیں جو جینے کی اُمنگ چھوڑ دیں۔ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر ڈالیں۔ اس عارضی امتحان کی وجہ سے میرا حوصلہ بلند ہوا اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق جذبے میں بدل گیا۔ میرے خیال میں جوش و جذبہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تحفہ ہے، یہ کسی کی وراثت نہیں۔ جذبہ انہی دلوں میں موجزن ہوتا ہے جن کی سوچ مثبت اور یقین کامل ہو۔"

بصارت جانے کے بعد آپ کو تعلیم پاتے ہوئے کافی مشکلات پیش آئی ہوں گی؟ میرا اگلا سوال تھا۔

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "جی بالکل۔ پہلے کتاب ہاتھ میں لے کر سبق یاد کرتی، تو بہت آسانی رہتی۔ جب آنکھوں میں روشنی نہ رہی، تو مسئلہ بن گیا۔ آخر بہنیں اور امی مجھے سبق ریکارڈ کر کے دینے لگیں اور میں سن سن کر یاد کر لیتی۔ مجھے ہر طرف سے دھیان ہٹا کر سننے پر توجہ مرکوز کرنا پڑتی اور لفظوں کی بناوٹ کو ذہن میں اتارنا پڑتا۔ میری ہم جماعتوں نے بھی میری مدد کی۔ گروپ اسٹڈی کے وقت مجھ پر توجہ دیتیں اور ان کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ کبھی کسی نے تنگ نہیں کیا۔"

آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟ میں نے پوچھا۔

کچھ توقف کے بعد شمائل نے بتایا "میں نے تین ماسٹرز کیے جن میں ایم اے عربی، ایم اے اسلامیات اور ایم اے ایجوکیشن شامل ہیں۔ ساتھ میں بی ایڈ اور ایم ایڈ بھی کیا اور اسکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ آٹھ سالہ درس نظامی بھی کیا ہے جس کے پیپر ابھی دے کر فارغ ہوئی ہوں۔ اب ان شاء اللہ کسی ایک مضمون میں ایم فل کا ارادہ بھی رکھتی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں تاکہ اپنا خرچ برداشت کر سکوں۔ میرے والدین نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور دے رہے ہیں۔ لیکن میں خود بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اس قابل بھی ہوں کہ اچھی ملازمت کر سکوں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ایسا کوئی نظام نہیں جو مجھے آسانی سے ملازمت دلوا سکے۔ پچھلے ایک دو سال سے کوشش کر رہی ہوں، نہ تو مجھے مخصوص کوٹے پہ ملازمت ملی اور نہ ہی میرٹ پر۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس امتیازی سلوک پر دکھ پہنچا کہ پنجاب حکومت نے میرٹ پر طلبہ و طالبات کو لیپ ٹاپ دیے مگر مجھے نہیں مل سکا۔ جبکہ میں میرٹ پر ہوں اور حق دار بھی۔"

آپ کو عالمہ بننے کا خیال کب آیا؟ میں نے سوال کیا۔

انھوں نے جواباً کہا "عالمہ بننے کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ میں

پہلے قرآن پاک حفظ کرلی تھی تاہم نانا جان نے مجھے روک دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعد میں خواتین گھر داری کے کاموں میں الجھ جاتی ہیں اور پھر قرآن پاک کو دہرا نہیں پاتیں۔ مگر میں نے شروع سے سوچ رکھا تھا کہ دینی کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی حاصل کرلوں گی۔ الحمدللہ میں اس وقت فیصل آباد میں پہلی اور واحد خاتون عالمہ دین ہوں۔"

کبھی ایسا محسوس ہوا کہ آپ عام بینا لوگوں سے ہٹ کر ہیں لہٰذا زندگی میں تنہا رہ جائیں گی؟ میں نے دریافت کیا۔

"نہیں ایسا بالکل بھی نہیں۔" شمائل نے جذباتی ہو کر جواب دیا "اول تو میں خود کو نارمل محسوس کرتی ہوں۔ میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں اور ان کا آپریشن ہوسکتا ہے۔ بس وقتی طور پر بصارت چلی گئی ہے لہٰذا میں اس قسم کی منفی سوچ ہرگز نہیں رکھتی۔ میں وہ سب کام بآسانی کرسکتی ہوں جو کوئی بھی نارمل لڑکی کرتی ہے۔ اس لیے مجھے کبھی کسی قسم کا احساس کمتری نہیں اور نہ ہی کبھی ناامیدی پیدا ہوئی۔ مجھے میری سہیلیوں اور گھر والوں نے کبھی نابینا نہیں کہا۔ ان کا کہنا ہے کہ تمھاری آنکھیں ٹھیک ہوجائیں گے۔"

روزمرہ کاموں میں کوئی ایسا وقت آتا ہے جبکہ آپ کو معذوری کا احساس ہونے لگے؟ میں نے سوال کیا۔

"جی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ مثلاً مجھ سے بجلی کا سوئچ بند نہیں ہوتا۔ تاہم اپنے روزمرہ کام میں آسانی سے کرلیتی ہوں۔ مثلاً کپڑے استری کرنا، غسل خانے جانا، سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا۔ مجھے ان سب کاموں اور جگہوں کا اندازہ ہے لہٰذا میں آسانی سے یہ سارے کام نمٹا لیتی ہوں۔"

کیا آپ سفر آسانی سے کرلیتی ہیں؟ اور دوران سفر لوگوں کا آپ کے ساتھ رویہ کیسا ہوتا ہے؟

وہ بولی "جی میں سفر آسانی سے کرلیتی ہوں اور لوگوں کا رویہ بہت مثبت ہوتا ہے۔ وہ میری مدد کرتے اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔ شہر سے جب باہر جانا ہو تو امی میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ اگر اپنے شہر میں رکشا میں آنا جانا ہو تو تنہا سفر کرلیتی ہوں۔"

آپ کی بصارت گئے دس برس بیت چکے۔ اس دوران آپ کو زندگی میں کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا؟ میں نے تجسس سے پوچھا۔

شمائل قدرے دھیمے لہجے میں بولی "جی بالکل ہوتا ہے۔ دس سال پہلے کے وہ مناظر جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے امی، ابو، بہن بھائی سب کے چہرے یاد آتے ہیں تو جھرجھری سی محسوس ہوتی ہے کہ زندگی کس موڑ پر لے آئی۔ تاہم فوری طور پر میں اللہ تعالیٰ سے اپنی کھوئی بصارت پانے کے لیے گڑگڑا کر دعا کرتی ہوں۔ الحمدللہ میں پرامید ہوں اور مجھے اللہ کی قدرت کاملہ پر پورا یقین ہے کہ وہ ضرور مجھے آنکھوں کی روشنی عطا کرے گا۔"

آپ تعلیم سے فارغ ہوچکیں اور ملازمت کی تلاش میں ہیں۔ آپ کے رشتے کا مسئلہ بھی ہوگا۔ یا خاندان میں کوئی ایسا لڑکا ہے جو خوشی بارضا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہے؟ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"جی میری پہلی کوشش تو ملازمت حاصل کرنے کی ہے۔ شادی کے لیے گھر والے کوشش کررہے ہیں۔ خاندان میں تو ایسا کوئی نہیں کیونکہ میرے کزن مجھ سے چھوٹے ہیں۔ خاندان سے باہر ہی رشتہ ہوگا۔ میں نے تو شادی کی طرف دھیان نہیں دیا لیکن والدین کی خواہش ہے اور حتی المقدور کوشش کررہے ہیں۔"

آپ کس قسم کی ملازمت کرنا پسند کریں گی؟ میں نے قدرے توقف سے پوچھا۔

وہ گلا کھنکارتے ہوئے گویا ہوئی "میں استاد بن کر طلبہ و طالبات کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں بہت کچھ ہے۔ اگر موقع ملا تو میری خواہش ہے، اپنا تعلیمی ادارہ قائم کرلوں۔ میں اس درس گاہ میں خاص و عام کے بچوں کو بلاتفریق دینی و دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور کروں گی۔"

◆◆◆

جہاں رہو خوش رہو

ایک باپ کے ایثار کی اچھوتی کہانی

فرحت ظفر

آج سے آٹھ سال پہلے گھر میں ہم پانچ بہنیں آباد تھیں۔ جس گھر میں لڑکیاں اس بہتات سے ہوں، وہاں بھائی ہونے کا کتنا ارمان ہوتا ہے، یہ بات سبھی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے ابا جان بھی دادا جان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لیے ہم سے زیادہ ہماری پھوپھیوں اور دادی اماں کو ہمارا بھائی ہونے کی چاہ تھی۔ اس وقت اگر ہمارے گھر میں کسی سے بھی اس کی خواہش پوچھی جاتی، تو سب کا یہی جواب ہوتا۔ "اللہ میاں ہمیں بھائی دے دے۔"

آخر ۹ نومبر امی جان کو زچگی کی حالت میں کراچی کے ایک مقامی اسپتال داخل کرایا گیا۔ امی کی حالت خاصی تشویشناک تھی۔ ہم سب ساری رات سجدے میں گر کر امی کی صحت اور بھائی کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر ۲ بجے ابا جان گلنار چہرہ لیے گھر میں داخل ہوئے۔ خدا نے ہماری دعا قبول کر لی تھی۔ امی خیریت سے تھیں اور ہمارا نومولود منا بھائی بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔



اس غیر متوقع خوشی نے ہماری زبانیں گنگ کر دیں۔ آنکھوں سے خوشی کے سوتے پھوٹ پڑے۔ آخر خدا کو ہماری حالت پر رحم آ ہی گیا تھا۔ اب ہم سے گھر میں ایک منٹ ٹکنا مشکل ہو گیا۔ اس لیے جلدی جلدی تیار ہوئے اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنے بھائی کو دیکھنے اسپتال پہنچے۔ امی جنرل وارڈ میں تھیں۔ بڑی مشکل سے اجازت لے کر اندر پہنچے، تو خوشی کے بجائے دل میں ایک دم خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ امی کے ساتھ والے بیڈ پہ ایک عورت بے ہوش پڑی تھی۔

اس کے ساتھ بیٹھی عورت کے گرد دو نرسیں اور ڈاکٹر پریشان صورت لیے کھڑے تھے۔ اس منظر سے کچھ لمحات کے لیے ہم اپنے نوزائیدہ بھائی کو بھول گئے۔ خاص طور پر ابا جی، تو ہم سے غافل ہو کر وہیں جا کھڑے ہوئے۔ پھر بھائی کو دیکھنے کا ارمان ہم پر غالب آ گیا۔ ہم نے بھائی کو گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ ہم پانچوں بہنیں شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے چمٹی جا رہی تھیں۔ اس وقت ہمیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ

آگے کیا ہونے والا ہے۔

ہمارے ساتھ دادی اماں بھی تھیں۔ انھوں نے بھی پوتے کو پیار کرنے سے پہلے رونے والی عورت کو دلاسا دیا اور اس سے رونے کا سبب پوچھنے لگیں۔ عورت نے سسکیاں لے کر بتایا کہ یہ لڑکی میری اکلوتی ہے۔ میں نے بیوی اس بچی کے نیچے کاٹ دی۔ اچھا گھر دیکھ کر اس کی شادی کر دی۔ اس کے دو بچے بھی ہوئے جو نجانے کس کی بدنظر کا شکار ہو کر تین اور پانچ سال کی عمر میں چھے ماہ کے وقفے سے فوت ہو گئے۔

ابھی یہ غم کم نہیں ہوا تھا کہ قدرت نے میری بچی کو ایک اور روگ لگا دیا۔ ان دو بچوں کے بعد اس کے چار بچے مردہ پیدا ہو چکے۔ اس کا شوہر بہت حساس تھا۔ اب مسلسل صدموں سے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ چھے سات ماہ کے علاج سے وہ تو کچھ ٹھیک ہو گیا لیکن اسی دوران اس بدنصیب کو دل کے دورے پڑنے لگے۔ شوہر کی بیماری اور بچوں کے غم نے اس کی حالت بگاڑ دی۔ آج اس کے پانچواں مردہ بچہ پیدا ہوا ہے۔

اس کا شوہر لاہور گیا ہوا ہے۔ ابھی تک اسے نہیں معلوم کہ اس بدنصیب کے پھر مردہ بچہ ہوا ہے۔ جب بھی اس نے یہ خبر سنی، وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی کہ اب اسے کوئی ذہنی صدمہ نہیں پہنچنا چاہیے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس خبر کو دونوں سے کیسے چھپاؤں؟ اس کو دل کے دورے پڑتے ہیں اور شوہر ذہنی مریض ہے۔ آخر کیا کروں، کہاں جاؤں؟

وہ عورت پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سارے ماحول پر سوگواری خاموشی طاری ہو گئی حتیٰ کہ ہمارے دل اس پُرمسرت موقع پر بھی بھر آئے۔ امی بھی سسکیاں لینے لگیں۔ ابا جان نے ایک نظر امی کو دیکھا اور اس دنیا و مافیہا سے بے خبر بے ہوش عورت کو جسے اپنے حادثے کی خبر بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے چھوٹی بہن کی گود سے اپنے بیٹے کو اٹھا کر اس عورت کے پہلو میں لٹا دیا۔ یہ دیکھ کر حیرت سے سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔

ابا جان نے انتہائی فیصلہ کن انداز میں سب کے سامنے کہہ دیا کہ اس بچے پر آج سے میرا کوئی حق نہیں۔ دادی اور امی کی حالت غیر ہو گئی۔ ہم بہنیں ابا جان کے قدموں میں گر گئیں کہ آپ ایسا نہ کریں لیکن آفرین ہے میرے عظیم باپ پر، انھوں نے ہمارے وقتی جذبات سے متاثر ہو کر اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ ڈاکٹروں نے بھی انھیں سمجھایا کہ آپ پھر سوچ لیجیے، یہ

ماڈل "شہر خموشاں"

لاہور شہر میں اپنی نوعیت کا پہلا ماڈل قبرستان بنایا جا رہا ہے جسے "شہر خموشاں" کا نام دیا گیا ہے۔ اس قبرستان کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں میت لانے سے لے کر دفنانے تک تمام انتظامات مقامی حکومت کی جانب سے کیے جائیں گے۔ لاہور کا یہ مثالی قبرستان فیروز پور روڈ کے قریب موضع رکھ جھیڈو میں ۹۰ کنال کے رقبے پر بن رہا ہے۔ ان کے مطابق نئے انتظامات کے تحت لاہور میں بننے والے اس جدید قبرستان میں قبر کی جگہ حاصل کرنے کے لیے ایک ٹول فری نمبر مہیا کیا جائے گا۔ لواحقین میت کی تفصیلات سے متعلق حکام کو آگاہ کریں گے، جس کے بعد میت قبرستان تک پہنچانے کے لیے جنازہ گاڑی کا انتظام ہو گا اور وہیں پر اس کے غسل کا انتظام کیا جائے گا۔ تدفین میں تاخیر کی صورت میں میت محفوظ رکھنے کے لیے سرد خانے کا انتظام بھی ہو گا۔ یہ ماڈل قبرستان صفائی ستھرائی اور تعمیری نفاست میں منفرد اور تمام قبروں کے درمیان مساوی فاصلہ ہو گا۔ قبرستان میں تمام قبریں ہموار اور سنگ مزار یکساں طرز کے ہوں گے۔ اس کے علاوہ قبرستان میں آنے و جانے والوں کے لیے بنچ نصب کیے جائیں گے جبکہ بوڑھوں اور معذور افراد کو قبروں تک پہنچانے والی گزرگاہ میں پرندوں کو دانہ ڈالنے اور تازہ پھولوں کی دکان بھی موجود ہو گی اور یہ تمام انتظامات سرکاری سطح پر کیے جائیں گے۔ حکومت پنجاب کی جانب سے لاہور کے علاوہ ملتان، سرگودھا، راولپنڈی اور فیصل آباد میں بھی ایسے قبرستان تعمیر کرنے کے منصوبے زیر غور ہیں۔

نہایت کٹھن کام ہے۔ ابا جان کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا "خدا مجھے اس امر کا پھل ضرور دے گا۔"

ابا جان نے امی اور دادی کو بڑی اچھی طرح سمجھایا۔ امی کو تو صبر ہی نہیں آتا تھا، کہتیں کہ میں جیتے جی اپنے بیٹے سے کیسے دور ہو جاؤں؟ ابا جان انھیں دو دن بعد گھر لے آئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے، وہ اپنی حرکات سے ان کا عظیم مقصد ختم کر دیں گی۔ ہم سب کی زبان پر بھی ابا جان نے پہرہ لگوا دیا۔ دادی جان سمجھدار خاتون ہیں، وہ بھی ابا جان کے ساتھ ہو گئیں۔ پھوپھیوں نے احتجاج کیا، تو ابا جان نے انھیں سختی سے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

میری امی بچاری تین مہینے تک بیمار رہیں۔ پھر بھی ابا جان کے ارادے میں ذرا سی لچک پیدا نہ ہوئی۔ وہ کہتے تھے، اللہ ہمیں اور اولاد دے گا لیکن اس خاتون اور اس کے شوہر کی زندگیاں ہماری خوشیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ چھے سات روز بعد وہ خاتون بھی "اپنے بچے" کے ساتھ گھر لوٹ گئیں۔ ابا جان کہتے تھے کہ وہ دونوں میاں بیوی بچے کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ ہماری خوشیاں ان کے آگے ماند ہیں۔

اس بات کا اسپتال کے چند لوگوں کے علاوہ صرف بچے کی نانی کو پتا تھا کہ یہ بچہ ان کا نہیں۔ اس واقعے کے تین چار ماہ بعد بچے کی نانی اور ماں ہم سے ملنے آئیں۔ ہماری حالت اپنے بھائی کو ان کی گود میں دیکھ کر جو ہوئی، ناقابل بیان ہے۔ لیکن ابا جان اور دادی جان نے ہم سب کو سنبھالے رکھا۔ امی نے بچے کو گود میں لے کر بے تحاشا پیار کیا۔ ہم سب بھی چپکے چپکے رو رہے تھے۔ خیر اللہ نے یہ کٹھن وقت بھی گزار دیا۔ پھر ہم لوگوں نے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر ابا جان کے عظیم مقصد سے سمجھوتہ کر لیا۔

اللہ میاں نے ہماری قربانی رائیگاں نہیں جانے دی۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے گھر تین بھائی اور پیدا ہوئے جو خدا کے فضل سے بالترتیب چھے، تین اور ڈیڑھ سال کے ہیں۔ امی اس حادثے سے سمجھوتہ کر چکیں۔ ہمارے اس خاندان سے بہت اچھے تعلقات ہیں جس میں ہمارا بھائی اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے نہایت ناز و نعم میں پرورش پا رہا ہے۔ اسکول میں چوتھی جماعت کا ہونہار طالب علم ہے۔ ہم لوگ کبھی کبھار اس سے مل کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔

ہمیں علم ہے کہ خاتون کی نانی کسی کو سچائی بتائے بغیر چل بسی، تو اس کے بعد کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ ہمارا بھائی ہے۔ لیکن خدا کی قسم، ہم سب گھر والوں کے دل اس عظیم قربانی سے بہت مطمئن ہیں۔ ہمارا پیارا بھائی جہاں بھی ہے خوش رہے.... یہی ہماری دعا ہے۔

سگریٹ نوشی سے پھیپھڑوں کی بیماری کا خطرہ

امریکی طبی ماہرین نے کہا ہے کہ سگریٹ نوشی کرنے والے لاکھوں افراد کو مستقبل میں پھیپھڑوں کی بیماری لاحق ہونے کا دوسروں کی نسبت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ماہرین نے تقریباً ۴۵ سے ۵۰ سال کی عمر کے ۱۰ سالوں تک روزانہ ایک ڈبی سگریٹ پینے والے ۹ ہزار افراد کے مطالعاتی جائزے میں ان کی سانس لینے کی صلاحیت، سی ٹی سکینز اور دیگر عوامل کا جائزہ لیا جس کے دوران پتا چلا کہ ان افراد میں سے ۵۵ فیصد کو سگریٹ نوشی کے باعث سانس کی نالیاں تنگ ہو جانے والی بیماری لاحق نہیں تھی تاہم ان میں یہ بیماری ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ ان میں ۴۲ فی صد کو سانس کی نالیاں تنگ ہونے جبکہ ۲۳ فی صد کو سانس اکھڑنے کی بیماری لاحق تھی جس سے ماہرین نے اخذ کیا کہ سگریٹ نوشی کرنے والے لاکھوں افراد کو مستقبل میں پھیپھڑوں کی بیماری لاحق ہونے کا دوسروں کی نسبت زیادہ امکان ہوتا ہے۔

قومی یک جہتی کی اہمیت اجاگر کرتی علامتی کہانی

تنہائی

اگر آگ بجھانے میں ہر فرد اپنا کردار ادا نہ کرے تو وہ سبھی کے آشیانے جلا ڈالتی ہے

صالحہ محبوب

''بیٹا! تم چاروں رات کو میرے پاس آنا۔ ایک اہم مشورہ کرنا ہے۔'' بوڑھے باپ نے اپنے جوان بیٹوں کو صبح بتایا جو کام پہ نکل رہے تھے۔

''جی ابا جی! کوئی خاص بات..... اگر کوئی پریشانی کی بات ہے، تو ابھی ہمیں بتائیے۔'' بڑے بیٹے نے آہستگی سے پوچھا۔

''ابا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا''۔ یہ ان کا دوسرا بیٹا تھا۔

جی بیٹا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ابا جان نے بیٹے کی طرف تشکر بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

چاروں بیٹے مختلف خدشات ذہنوں میں لیے اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔

ابا جان اپنے خوبصورت اور وسیع گھر کو محبت سے دیکھتے باہر برآمدے میں آبیٹھے۔ یہ گھر انھوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ انھیں اس کے ایک ایک کونے اور حصے سے پیار تھا۔ اب گھر میں ان کے چاروں بیٹے بیوی بچوں سمیت رہائش پذیر تھے۔ گو چاروں کی معاشی حیثیت ایک دوسرے سے مختلف تھی لیکن مشترکہ گھر نے انھیں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو رکھا تھا۔



بڑا بیٹا معاشی لحاظ سے خاصا کمزور تھا۔ اہل و عیال کے معاملے میں بھی اللہ نے اسے فقط ایک بیٹا عنایت فرمایا۔ لیکن وہ خاصا جھگڑالو تھا۔ اُسے اپنے والدین اور دادا سے گلہ تھا کہ وہ اسے نظرانداز کرتے ہوئے باقی بھائیوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ تینوں بیٹوں کے معاشی معاملات بھی عموماً اتار چڑھاؤ کا شکار رہتے۔ کبھی کسی ایک کے حصے میں گیس پانی کے نظام سے دوسروں کو محروم کرنے کی دھمکی دی جاتی، تو دوسرا فوراً بجلی کا سوئچ آف کرکے اس کا جواب دیتا۔ بہرحال انہی ہنگاموں میں گھر کا نظام رواں دواں تھا۔

یہ خاندان بھرے پرے محلے میں آباد تھا۔ سڑک کی دوسری طرف کی ساری کوٹھیاں قیمتی ساز و سامان سے آراستہ اور اعلیٰ طرزِ تعمیر کا شاہکار تھیں۔ قسم قسم کی آرائشی بتیاں، خوبصورت رنگ و روغن اور قیمتی پودوں سے آراستہ باغ۔ سامنے والے شیخ صاحب نے، تو حد ہی کر دی۔ برآمدے کے پودے، گملے اور درخت بھی بیرونِ ملک سے منگوائے۔ اباجان کا اپنا گھر بھی خاصا مضبوط تھا۔ چاروں بیٹے دست و بازو تھے۔ مگر جب بیٹوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کیا، تو گھر کی حالت خراب ہونے لگی۔ اپنی خودغرضی میں وہ اکثر مشترکہ آبائی گھر کو بھی پس پشت ڈال دیا کرتے۔ کبھی کبھی پوتوں پوتیوں کے پیچھے ان کے والدین بھی آپس میں لڑ پڑتے، تو اباجی بڑی مشکل سے صلح کرواتے۔

یہ آپس کے لڑائی جھگڑے محلے میں بھی خاصے عام تھے۔ کبھی خاندان خود ہی صلح کر لیتے اور کبھی بات محلے کی پنچایت تک جا پہنچتی۔ مگر پنچایت اپنے فیصلے پر فریقین سے عملدرآمد کرانے سے قاصر تھی۔ جس سے وہ بے اثر ہو کر رہ جاتی۔

آج بھی اباجی نے بیٹوں کو محلے ہی کی ایک لڑائی کے سلسلے میں مشورہ کرنے بلایا تھا۔ شیخ صاحب سے ان کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ دونوں گہرے دوست تھے اور ہم مزاج اور ہم خیال بھی۔ محلے کی ہر تقریب اور خوشی و غمی میں دونوں ساتھ ساتھ ہوتے۔

خصوصاً جب بھی اباجان پر کوئی مشکل آن پڑتی، تو شیخ صاحب ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوتے۔ ہمت بندھاتے اور اخلاقی اور مالی مدد بھی دل کھول کر کرتے۔ تازہ مسئلہ بھی شیخ صاحب ہی سے متعلق تھا۔ دراصل شیخ صاحب کی اپنے ہمسایوں سے لڑائی ہو گئی۔ اب وہ اپنے پڑوسیوں سے خاصا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اسی معاملے میں انھیں اباجان کی اخلاقی امداد درکار ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ عملی مدد کی بھی ضرورت تھی۔

اباجان دل ہی دل میں خاصے خوش تھے کہ انھیں اپنے دیرینہ دوست کے احسانات کا بدلہ چکانے کا موقع مل رہا تھا۔ انھیں اپنے بیٹوں کی طرف سے تعاون کا بھی یقین تھا۔ بھلا ان کی اولاد نافرمان کیسے ہو سکتی تھی؟ پھر وہ چچا سے احسان فراموشی کیسے کرتی۔ سو اباجان دل ہی دل میں خود کو تسلیاں دیتے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔

شام کو چاروں بیٹے ان کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔ اباجان نے مسئلہ سامنے رکھا، شیخ صاحب کی درخواست بھی اور پھر چاروں کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"اباجان آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر ہم شیخ صاحب کے ساتھ شامل ہو کر ان کے ہمسائے سے لڑے، تو کل وہ ہم سے بھی لڑائی کرنے لگے گا۔ بہتر ہے، چچاجان کے اپنے معاملات اور لڑائی جھگڑوں کو انہی کے گھر تک محدود رہنے دیں۔" یہ ان کا بڑا بیٹا تھا۔

اباجی! آج کل تو ہمیں خود پر بھروسا کرنے کا دور ہے۔ ہمارے اپنے مسئلے کم ہیں کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑائیں۔ آپ ان سے معذرت کر لیں۔" یہ دوسرا بیٹا تھا۔

"اباجی! یہ دونوں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہماری بھلا اپنی مصروفیت کم ہے؟ ہمارے بچے خود آپس میں محاذ کھولے

بیٹھے ہیں۔ ہم انھیں لڑتا چھوڑ کر دوسروں کی مدد کے لیے کیسے جا سکتے ہیں؟" یہ ان کا تیسرا بیٹا تھا۔

"ابا جان ہمیں اس شہر اور محلّے میں ہمیشہ رہنا ہے۔ ہمارا اپنا ہمسایہ شیخ صاحب کے پڑوسی کا دوست ہے۔ وہ اس کی مدد بھی کر رہا ہے۔ اب شیخ صاحب کی مدد کا مطلب ہے اپنی پشت کو غیر محفوظ کرنا، ہمارے اپنے ہمسائے سے تعلقات میں کشیدگی لانا! ہوش کے ناخن لیں۔ جذبات نہیں دل و دماغ سے سوچیں تو فیصلے میں آسانی رہے گی" اب ان کا چھوٹا بیٹا بولا۔

"لیکن بیٹا ہماری ہر مشکل میں شیخ صاحب نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ کئی لوگوں نے ہمیں تنہا چھوڑا مگر وہ ہمارے ساتھ کھڑے رہے۔ جب ہمارے پاس کچھ نہ تھا، تو انھوں نے ہمیں امداد دی۔ ہمارا سہارا بنے۔ جب کسی نے ہم پر حملہ کیا، تو انھوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ اب کس منہ سے میں انھیں ٹکا سا جواب دے دوں؟" ابا جان چاروں بیٹوں کی طرف دیکھ کر بولے۔

"ایک تو ابا جان آپ بھی بہت سادہ ہیں۔ ان کی چالاکی سمجھ ہی نہیں سکے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے ہمارا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ ان کا اپنا مفاد ہی ہمارے ساتھ تعاون اور دوستی میں ہے۔" دوسرا بیٹا بولا۔ تینوں کے سر اس کی تائید میں ہل رہے تھے۔

"بیٹے! اب ان کی مدد ہی میں ہمارا مفاد ہے۔ ان کے احسانات کا بدلہ چکانے کا بھلا اس سے بہتر موقع ہمیں کب ملے گا۔ ہمیں بھی اچھے دوستوں اور ہمسایوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ تو بھلا ایک مخلص دوست کو خود ہی کھو دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔" ابا جان نے بیٹوں کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔ اب اولاد کے سامنے وہ اپنا کمزور سا فیصلہ نہیں سنا سکتے تھے۔

"ابا جان! آپ چچا جان کو زبانی کلامی تسلی دیتے رہیے لیکن عملاً کچھ نہ کیجیے۔ جب وہ اصرار کریں، تو کہہ دیجیے گا کہ میرے بچے نہیں مان رہے۔ ان کے احسانات کا بدلہ اتر جائے گا! اور دوستی بھی رہ جائے گی۔" منجھلا بیٹا بولا۔

"بیٹے انھیں تسلی نہیں مدد کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی نا سمجھ بچے نہیں کہ محض ہماری تسلیوں سے بہل جائیں اور ان کی مدد، ہماری ضرورت ہے کیونکہ مشکل میں وہی ہمارے کام آتے ہیں۔ کیوں اپنی مدد اور سہارے کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو؟ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ آج وہ مشکل میں ہیں مگر ہماری مدد کے بغیر جھگڑے سے نکل جائیں گے۔ مگر یوں ہم اپنے آپ کو پورے محلّے میں تنہا کر دیں گے۔ کل کو کسی دوسرے نے ہمیں تنگ کیا، تو ہم کس سے مالی اور اخلاقی مدد مانگیں گے؟ محلّوں میں اس طرح الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" ابا جان بھی ہمت ہارنے کو تیار نہ تھے۔

"ٹھیک ہے اگر آپ شیخ صاحب کی مدد کرنا چاہتے ہیں، تو کر لیجیے۔ ہم آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔" چاروں آوازیں مکمل طور پر ہم آہنگ تھیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابا جان اپنی آنکھوں میں نمی لیے سوچنے لگے کہ وہ کس قدر بے بس ہیں۔ انھیں زندگی بھر کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ آگ پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر ہر فرد آگ بجھانے میں اپنا کردار ادا نہ کرے، تو وہ آگ کبھی کے آشیانے جلا دیتی ہے۔ ان کے بیٹوں نے خود کو محلّے کے ایک جھگڑے سے دور کر لیا مگر درحقیقت وہ ایک مخلص دوست سے محروم ہو گئے۔

اب ابا جان کو خدشہ تھا کہ کسی بھی مشکل، مصیبت، آزمائش اور پریشانی میں محلّے سے شاید ہی کوئی مدد کو پہنچے کیونکہ ان کا سب سے مخلص دوست وہاں نہیں ہوگا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ شیخ صاحب کی لڑائی یا بیٹوں کی بے اعتنائی نہیں بلکہ مستقبل میں اپنی تنہائی پر!

داداجان کی دلچسپ باتیں

ایک پوتے کے جذبات بھرے قلم سے اپنے خوددار اور محنتی بزرگ کی سبق آموز و شگفتہ یادیں

محمد اسلم لودھی

آموں کا موسم آتے ہی مجھے اپنی چوری یاد آجاتی ہے۔ میں نے بچپن میں آموں کے کریٹ سے ایک موٹا آم چرایا تھا۔ پھر مجھے خونی پیچش لگ گئے۔ والدہ نے وجہ پوچھی، تو میں نے بتادیا کہ ایک آم آپ نے دیا تھا اور دوسرا کریٹ سے چرا کر کھایا۔ پیچش لگنے کی وجہ یہی دو آم ہیں۔ والدہ نے میری چوری چھپاتے ہوئے والد کے ساتھ دوائی لینے بھجوادیا۔ میرے دادا خیر دین خان لودھی ملتان میں رہتے تھے۔ ان کی اچھی خاصی زمین ملتان کے قریب ریاض آباد ریلوے اسٹیشن کے مشرق میں واقع قصبے موضع لوٹھڑ میں تھی، لیکن وہ زمین پر انحصار کرنے کے بجائے ہاتھ سے کما کر کھانے پر یقین رکھتے تھے۔

تعلیم واجبی سی تھی کیونکہ اوائل عمری ہی میں والدین یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے۔ وہ بھارتی شہر فیروز پور کے نواحی قصبے کا سکو بیگو کے رہنے والے تھے۔ والدین کا انتقال ہوا، تو اپنے خالو کے پاس آگئے جو اس وقت فرید کوٹ شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ”پھاٹک والا“ کی حیثیت سے ملازم تھے۔ وہیں پلے بڑھے۔ جوان ہوئے، تو ابتدا میں پھلوں کی ریڑھی لگائی پھر ریلوے میں ”کانٹے والے“ کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔

آغاز میں ریلوے اسٹیشن گڑگاؤں پر تعیناتی ہوئی جو فیروز پور سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ویران جگہ واقع تھا۔ مجھے یاد ہے، شام ڈھلے جب میں دادا جان کے پاؤں دبانے ان کے پاس بیٹھتا، تو وہ مجھے اپنے لڑکپن اور جوانی کی کہانیاں سنایا کرتے۔ وہ بتاتے کہ جب انھیں تنخواہ لینے گڑگاؤں سے فیروز پور شہر آنا پڑتا، تو وہ سرشام ہی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑتے۔ ساری رات اندھیرے میں سفر کرتے گزر جاتی۔ جب صبح کا سورج طلوع ہوتا، تو فیروز پور شہر میں پہنچ جاتے۔

راستے کے ویرانے میں انھیں بے شمار مصائب و آلام سے سابقہ پڑتا۔ کبھی جنگلی درندوں سے آمنا سامنا ہوتا، تو کبھی



چڑیلیں ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی ہوا کرتی۔ چڑیلیں آگ سے خوف کھاتی ہیں۔ اگر عورت کی شکل میں کوئی چڑیل ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی، تو وہ لالٹین کا سہارا لیتے اور چڑیل سے جان چھڑا لیتے۔ اگر کسی جنگلی درندے سے واسطہ پڑتا تو ہاتھ میں پکڑی لاٹھی کام دکھاتی۔

بظاہر وہ پست قد کے دبلے پتلے بہادر انسان تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں شیر کا دل عطا کر رکھا تھا۔ ڈر اور خوف انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا۔ ایک بار انھوں نے بتایا کہ راستے میں ایک جگہ سفید رنگ کی روئی دکھائی دی۔ انھوں نے اس خیال سے وہ روئی اٹھا لی کہ بوقت ضرورت لالٹین میں اس کی بتی بنا کر استعمال کی جائے گی۔ وہ غربت اور تنگدستی کا زمانہ تھا، ہر چیز کی بہت قدر ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے روئی کا گولا اٹھا جیب میں ڈالا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔

کچھ دیر بعد انھیں محسوس ہوا کہ روئی کے گولے کی جسامت بڑھ رہی ہے، تو انھوں نے اپنا وہم سمجھا لیکن جب گولا بڑھتے بڑھتے فٹ بال سے بھی زیادہ بڑا ہو گیا، تو انھوں نے گولا پھینک دیا۔ درحقیقت وہ چھلاوا تھا۔ پرانے وقتوں میں چھلاوا اپنے کئی روپ بدل لیتا تھا جب بھی وہ سانڈ کی شکل اختیار کرتا، تو انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ جونہی روئی کا وہ گولا زمین پر پھینکا، اس نے بکری کے بچے کا روپ دھار لیا۔ اس کے منمنانے کی آواز نے رات کے سناٹے میں خوف کی فضا پیدا کر دی۔ دور دور تک کوئی انسان اور روشنی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف اندھیرا اور خوف کا عالم طاری تھا۔ بکری کے بچے کی آواز سنتے ہی انھیں احساس ہوا کہ یہ چھلاوا ہے جو مزید کئی روپ بدلے گا۔

جب وہ ریلوے پٹڑی پر بھاگ رہے تھے، تو چھلاوے نے اپنا روپ بدلا، کتے کی شکل اختیار کی اور ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ دادا نے اپنی چھڑی سے ایک دو بار اسے مارا تو اس نے سانڈ کا روپ دھار لیا۔ جب سانڈ کا روپ دھارا، تو دادا نے بھاگتے بھاگتے کلمہ طیبہ پڑھ لیا کیونکہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ اب وہ انھیں نقصان پہنچانے بغیر نہیں رہے گا۔ ایک لاٹھی سے طاقتور سانڈ سے مقابلہ تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حسن اتفاق سے فیروز پور شہر زیادہ دور نہیں تھا اور صبح کا نور آسمان سے زمین پر اترنے لگا۔ چند لوگ نماز ادا کرنے قریبی مسجد جا رہے تھے کہ دادا جان بھاگ کر ان میں شامل ہو گئے۔

ان آدمیوں کو دیکھ کر چھلاوا قریب ہی اگی جھاڑیوں میں اتر گیا اور یوں دادا جان کی اس خونخوار وحشی سے جان چھوٹی۔ دادا جان جب یہ کہانی سنا رہے تھے، تو میری سانس حلق میں اٹکی ہوئی تھی اور میں خود کو اس خوفناک ماحول کا حصہ تصور کر کے کانپ رہا تھا۔ دادا جان نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے مجھے اپنی آغوش میں لے کر پیار کیا اور کہا ''بیٹا زندگی میں جتنی بھی بڑی مشکل آئے، انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مدد کرنے والا ہے۔''

ایک بار انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے والد (یعنی میرے پردادا قطب دین خان لودھی) بہت درویش صفت انسان تھے۔ وہ شام کو بھینسیں لیے جنگل کی طرف نکل جاتے۔ ساری رات بھینسیں جنگل میں چرتی رہتیں اور وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے جانوروں کو لے کر واپس گاؤں لوٹ آتے۔ میں نے انھیں زندگی میں کبھی نماز قضا کرتے نہیں دیکھا۔ وہ تہجد گزار بھی تھے۔ سخت ترین سردیوں میں بھی مٹی کے گھڑے میں رکھے پانی سے وضو کرتے اور مصلے پر کھڑے ہو جاتے۔ وہ اپنے وقت کے ولی کامل تھے انھوں نے اپنی موت سے ایک ہفتہ پہلے کہہ دیا تھا کہ اگلے جمعہ ہم اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔

وہ جمعرات کو حسب معمول جنگل میں بھینسیں چراتے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہے۔ رات کے آخری پہر گھر تشریف لے آئے۔ تازہ وضو کیا، نماز فجر ادا کی اور اپنے بستر

پر لیٹ گئے۔ سورج طلوع ہونے کے بعد جب گھر والوں نے بیدار کرنا چاہا، ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو نہ صرف موت سے پہلے آگاہ کرتا بلکہ جمعہ کا دن دنیا سے رخصتی کا بنا دیتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میری ماں بھی نہایت سلیقہ شعار اور نیک بخت عورت تھی۔ اس دور میں دیہات میں آج کی طرح اسکول تھے اور نہ ہی فیکٹریاں اور کارخانے۔ اس لیے زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے یا جانور پال کر گزر بسر کرتے۔ جسے گورنمنٹ کی ملازمت مل جاتی وہ پورے گاؤں اور شہر میں منفرد دکھائی دیتا اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے۔ قیام پاکستان کے بعد دادا جان فیروز پور شہر سے قصور آبسے جہاں کیبن مین کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داری نبھانے لگے۔ وہیں ان کی ملاقات ملکہ ترنم نور جہاں سے ہوئی جس نے ابھی گانا شروع ہی کیا تھا۔ قصور میں چند سازندوں کے ساتھ وہ گلی کوچوں میں جا کر گایا کرتی تھی۔ جب واپس آتی، تو دادا جان کے پاس ریلوے کیبن پر حقہ پینے پہنچ جاتی۔ یہیں سے دادا جان ریٹائر ہونے تو ہمارے پاس آگئے۔

دادا جان جب مجھ سے مخاطب ہوتے، تو میں پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتا اور میرے چہرے کے تاثرات وہ مسلسل دیکھتے رہتے۔ ایک شام جب میں ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا، تو انھوں نے مجھے نصیحت آمیز لہجے میں کہا کہ بیٹا میں تمھیں ایک وصیت کرنے لگا ہوں۔ اگر دنیا اور آخرت میں کامیابی چاہتے ہو تو نماز کبھی نہ چھوڑنا۔ نماز کو اپنے لازمی معمولات کا حصہ بنا لو۔ اللہ تعالیٰ تم پر بہت کرم کرے گا اور زندگی میں تم کبھی ناکام نہیں ہو گے۔ دادا جان کی نصیحت پلے باندھ کر میں نے مسجد سے مستقل ناتا جوڑ لیا۔ میں مسجد کی صفائی کرتا، نمازیوں کے لیے کنویں اور ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر اس ہودی میں بھرتا جہاں نمازی وضو کرتے تھے۔ کنویں سے پانی کا بوکا بھر کر کھینچنا مجھ جیسے چھوٹے بچے کے لیے بہت مشکل کام تھا پھر بھی میں نے خود پر جنون طاری کر کے اس کام کو ہر ممکن انجام دیا۔

مجھے یاد ہے، جب میری عمر دس بارہ سال ہوئی، تو اینٹوں سے بنے چبوترے پر چند لوگ نماز پڑھنے آتے۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کنواں بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کو صاف کرنا بھی میں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ پھر جب اس پر مسجد تعمیر ہوئی، تو وہاں ہینڈ پمپ لگ گیا۔ اس ہینڈ پمپ کی نوزل ایک ہودی میں گرتی تھی جس کے نیچے وضو کے لیے ٹونٹیاں لگائی گئی تھیں۔ جب نمازی وہاں سے وضو کرتے، تو چھوٹی سی ہودی خالی ہو جاتی جسے ہر نماز سے پہلے بھرنا پڑتا۔ یہ ذمے داری انجام دینے کے علاوہ میں باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا۔ پہلے پہل تو کچھ مشکل پیش آئی پھر مسجد کے ساتھ ایسا مضبوط استوار رشتہ ہوا کہ اب مسجد سے باہر نکل کر میری دلی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے جیسے پانی کے بغیر مچھلی کی۔ دین اسلام میں اسی لیے مسجد کو اجتماعی مسائل حل کرنے اور باہمی محبتوں کی آماجگاہ قرار دیا گیا ہے۔ انسان ہونے کے ناتے کبھی کبھار مجھ پر سستی طاری ہو جاتی ہے لیکن پھر رب کا خوف اور دادا جان کی بات میری سستی کو لمحہ بھر میں چستی میں بدل دیتی ہے۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ دادا جان مجھے پیار سے "نور نگا" پکارتے۔ جب میں نے ان سے اس لفظ کا مطلب پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ زندگی میں تمہارے ۹ رنگ ہوں گے۔ ہر آٹھ دس سال بعد تمہارا رنگ یعنی مرتبہ تبدیل ہوتا رہے گا۔ دادا جان کو فوت ہوئے ۲۷ سال ہو چکے۔ ان کی ایک ایک بات کی سچائی آج میں اپنی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ جب میری عمر دس سال سے کم تھی، تو ماں اور باپ پیار سے مجھے سوہنا کہہ کر پکارتے تھے۔ ماں کو میرے بڑے دونوں بھائی "آپا" کہتے۔ لیکن میں نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی آپا کے بجائے امی جان کہنا شروع کر دیا۔ میرے بعد ہم سب بہن بھائی "امی جان" کے لقب سے پکارنے لگے۔ جب میں بیس سال کا ہوا، تو میٹرک پاس کر کے اس قابل ہو گیا کہ والدین کا

معاشی بوجھ بانٹ سکوں۔ باقی بھائیوں کی نسبت میں والہانہ محبت کے ساتھ ساتھ ان کی ہر ممکن تابعداری بھی کرتا تھا۔ اگلے دس سال کے دوران نہ صرف میری شادی ہو گئی بلکہ کرکٹ کے میدان میں جوہر دکھانے کے قابل بھی ہو گیا۔ سول ڈیفنس کی وردی پہن کر خود کو پاکستان کا محافظ تصور کرنے لگا۔ ابھی زندگی نے تین رنگ ہی بدلے تھے کہ چوتھے رنگ نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ مجھ جیسا بیکار نوجوان نہ صرف بنک آف پنجاب میں بھرتی ہوا بلکہ صحافت میں کالم لکھ کر قدم رکھنے لگا۔ یہ میرے لیے بالکل نئی دنیا تھی لیکن قدرت کی جانب سے یہ میرا چوتھا رنگ تھا۔ پچاس کے عشرے میں پہنچ کر قدرت نے مجھ سے کتابیں لکھنے اور پاکستان کے بڑے اخبار نوائے وقت میں کالم لکھنے کا کام لینا شروع کر دیا۔ یہ میری زندگی کا پانچواں رنگ تھا۔ ساٹھ کے عشرے میں بینک سے ریٹائر ہوا۔ ساتھ ہی میری تحریریں پاکستان کے قابل ذکر جرائد و رسائل کی زینت بننے لگیں۔ قابل ذکر لوگوں سے میری جان پہچان بھی بڑھ گئی اور مجھے پاکستان کا سب سے بہترین کالم نگار کا نیشنل ایپک گرین میڈیا ایوارڈ بھی ملا۔ معاشی اعتبار سے بھی مجھے بے شمار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اب ساتواں عشرہ چل رہا ہے۔ اس عشرے کی سب سے اہم بات ماہنامہ اردو ڈائجسٹ جیسے علمی و ادبی ڈائجسٹ میں ملازمت کا ملنا بھی قدرت کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ اردو ڈائجسٹ کا شمار پاکستان کے معیاری علمی و ادبی جرائد و رسائل میں ہوتا ہے۔ آج اگر میں پیچھے مڑ کے دیکھوں، تو خود کو ان کامیابیوں کا اہل قرار نہیں دیتا لیکن میرے دادا جان نے جو بات آج سے پچاس برس پہلے کہی تھی، اس کی حقیقت اب سامنے آ رہی ہے۔ میرے دادا جان تعلیم یافتہ انسان نہیں تھے۔ تین چار جماعتیں پڑھنے کے بعد انھیں اسکول جانا بھی نصیب نہیں ہوا لیکن قدرت بزرگوں کی زبان میں وہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے کہ ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔

جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا، تو شام ڈھلے لاہور کینٹ کے کوارٹروں میں ان کے پاؤں دبانے حسب معمول بیٹھ جاتا۔ وہ میری فرماں برداری پر بہت خوش ہوتے۔ کئی مرتبہ انھوں نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن مجھے ماں باپ کے ساتھ ساتھ دادا جان سے بھی عشق کی حد تک پیار تھا۔ سر پر سفید پگڑی باندھتے۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھی تھی۔ سانولے چہرے پر جگہ جگہ بڑھاپے کی جھریاں نمایاں تھیں لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک۔

ایک بار میں اپنے والد، محمد دلشاد خان لودھی کے ساتھ ملتان شہر دادا جان کو ملنے گیا۔ والد مجھے لیے پھل منڈی میں داخل ہوئے۔ میں نے سوچا شاید یہاں میرے دادا جان کی آڑھت کی دکان ہو گی لیکن میں نے دیکھا کہ سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص سر پر ٹوکری اٹھائے ہماری جانب چلا آ رہا ہے۔ جب وہ قریب آیا، تو میں یہ دیکھ کر سخت پریشان ہو گیا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں میرے دادا تھے۔ وہ گزر بسر کرنے کے لیے پھل منڈی ملتان میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس لمحے یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے کہ وہ ہمیں گرمیوں میں آم کا ایک کریٹ اور کچھ کھجوریں تحفتہً کس طرح بھجواتے ہوں گے۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ میرے دادا جان کے اپنے باغات ہیں کیونکہ ملتان کے مضافاتی علاقے میں ان کی اچھی خاصی زمین بھی تھی لیکن اس دن یہ عقدہ کھلا کہ وہ تو سر پر ٹوکری اٹھا کر ہمارے لیے اپنے خون پسینے کی کمائی سے آم اور کھجوریں بھجواتے ہیں۔ دوسری جانب ہماری حالت بھی کوئی مختلف نہ تھی۔ کیونکہ ہمیں بھی جی بھر کے آم سال میں ایک ہی مرتبہ کھانے کو ملتے جب دادا جان ہمیں ملتان سے بھجواتے۔

پھر حالات نے کروٹ بدلی اور دادا جان اپنے چھوٹے بیٹے رحمت خان لودھی کے پاس چلے گئے جو ان دنوں فیصل آباد اور شورکوٹ کے درمیان واقع ایک ریلوے اسٹیشن ''چنیانہ'' میں

بطور کیبن مین تعینات تھے۔ یہ اسٹیشن جنگل بیابان میں واقع تھا۔ دور دور تک کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ ایک بار مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ وہاں سخت ترین گرمیوں میں بھی کنویں کا پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ نہاتے ہوئے سردی سے دانت بجنے لگتے۔ پینے کا پانی فیصل آباد سے بذریعہ ریل آتا کیونکہ مقامی پانی میں دال نہیں گلتی تھی۔ شاید اس میں دھاتوں کی آمیزش تھی۔

جب رات کا وقت ہوا، تو بجلی نہ ہونے کی بنا پر ہم کوارٹر کے سامنے کھلی جگہ چارپائیاں بچھا کر سوئے۔ اس قدر اندھیرا تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور پاؤں بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ ساتھ والی چارپائی پر بڑا بھائی (محمد رمضان) سو رہا تھا لیکن وہ مجھے دکھائی نہ دیتا۔ ویران اور سنسان جگہوں پر میرے چچا صرف چند سو روپے تنخواہ کی خاطر چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دینے پر مجبور تھے۔ ایک بار دادا جان کو پیسوں کی ضرورت پڑی، تو انھوں نے جھنگ میں دریائے چناب کے کنارے پر واقع اپنی وراثتی ۱۴۰ کینال زمین ایک مقامی شخص کو صرف ۸۰۰ روپے میں رہن رکھ دی۔ وہ شخص اس قدر شاطر اور لالچی انسان تھا کہ اس نے ۸۰۰ روپے میں ہی ہماری ۱۴۰ کینال زرخیز وراثتی زمین پر مستقل قبضہ جما لیا۔ آج بھی وہ زمین اسی لالچی انسان کی تحویل میں ہے۔

جب چچا کا تبادلہ چنیانہ سے ساہیوال ہوا، تو ہم نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر دادا جان کو فالج کی بیماری نے آگھیرا۔ انھیں چارپائی پر لیٹا کر لاہور کینٹ لایا گیا جہاں وہ سروس ہسپتال میں داخل ہوئے۔ چند دن علاج کے بعد وہ بہتر ہو گئے۔ وہ پھر اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس ساہیوال چلے گئے۔ یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے کہ ایک صبح اطلاع ملی، میرے دادا جان فانی دنیا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں۔ انھیں ساہیوال ریلوے اسٹیشن سے مشرق کی جانب واقع قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بے شک آج دادا جان ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی باتیں اور نصیحتیں آج بھی حقیقت کا روپ دھارے آنکھوں کے سامنے رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ◆◆◆

یحییٰ برمکی نے کہا

☆ جب بادشاہ کی صحبت میسر ہو، تو اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیے جس طرح عاقل عورت اپنے بے وقوف شوہر کو راضی کرتی ہے۔

☆ جو لوگ دولت دنیا کے طالب ہیں اگر وہ زمانے کی سختیاں نہ اٹھا سکیں، تو پھر اپنے مقصد میں ناکامیاب ہونے کی شکایت نہ کریں۔

☆ جو لوگ ہم سے پہلے تھے وہ ہمارے لیے قابل اقتدا ہیں اور جو ہمارے بعد آئیں گے ہم ان کے واسطے عبرت ہیں۔

☆ میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا کہ گفتگو کرنے سے پہلے جس کی ہیبت مجھ پر چھا گئی ہو۔ البتہ وہ شخص فصیح ہے، تو میرے دل میں محبت جنم لیتی ہے، ورنہ وہ میری نظروں سے گر جاتا ہے۔

☆ جس شے کا دینا تجویز کر لیا گیا پھر اسے دینے میں توقف کرنا غایت درجہ کی بخیلی ہے۔

☆ جو اچھی بات سنو لکھ لو اور جو لکھو اسے حفظ کر لو۔ جو حفظ کرو اسے بیان کرو۔

☆ غلاموں کی بے ادبی اس کے مالک کے حلم پر دلیل ہے۔

(انتخاب: عائشہ رمضان، عارف والا)

مرد و عورت کے لیے

اللہ تعالیٰ کا حسین ترین تحفہ

شادی سے دور بھاگنے والی ایک دوشیزہ کی کتھا،
ربِ کائنات نے بھی اُسے عجب طور پر سبق سکھایا

نجم السحر

پینتالیس سالہ شیریں خانم محض سال بھر پہلے اپنے بیس سالہ تجربے کی بنیاد پر ہیڈ مسٹریس کے عہدے پر فائز ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کی ڈکشنری میں لفظ ناکامی نہیں پایا جاتا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، پُر آسائش زندگی، بہترین ذریعہ روزگار اور پابندیوں سے آزاد زندگی، وہ والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بے حد لاڈلی۔ شروع ہی سے من مانی کی عادی ہوگئی۔ بلکہ امتحانوں میں اچھے نتائج آنے کی وجہ سے والدین بیٹی کی عقلمندی کے اس



درجہ قائل تھے کہ اس کی ہر بات مانتے۔

والدین کی فرمانبرداری کا بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسے شادی پر قائل نہیں کرسکے۔ یہ الگ بات کہ شادی کے مضر اثرات پر بیٹی کے ہم خیال ضرور ہوگئے۔ معاشی خوش حالی کی موجودگی نے یوں

بھی اس ضرورت کو غیر ضروری بنا دیا۔

جب تک وہ استاد رہی کام ٹھیک چلتا رہا۔ بچوں کے لیے وہ سخت گیر استاد تھی۔ مگر اپنی ساتھی اساتذہ میں کسی کو کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ بہت خوش اخلاق، ہنس مکھ یا سادہ مزاج تو نہ تھی مگر چڑچڑی بھی نہیں لگتی۔ نپی تلی بات کرنے والی اور معتدل مزاج انسان کی حیثیت سے اس کے لیے ناخوشگوار صورت حال کم ہی پیش آئی۔ حکام بالا اسے "مس پرفیکٹ" کے طور پر جانتے تھے، اسی لیے سب نے اسے ہیڈ مسٹریس بنائے جانے کی پرزور تائید کی۔

اسکول کی ہیڈ مسٹری زندگی کا نیا موڑ ثابت ہوئی۔ برسوں پرانے اساتذہ اسے نئے نئے لگنے لگے۔ مثلاً حساب (ریاضی) کے استاد، کاشف صاحب جو میٹرک کی جماعت کو پڑھاتے تھے، اکثر موبائل پر دوران جماعت کھیلتے پائے گئے۔ یہ معلومات اسے ان میں تین چار بار چکر لگانے پر ملیں۔ اسلامیات کی استانی نورین سے اکثر والدین شاکی تھے کہ وہ اپنے مضمون سے انصاف نہیں کرتیں۔ اظہار صاحب جنھیں طبیعات اور کیمیا کا چیمپئن مانا جاتا تھا، ان کے بچے، تو پورے نمبر لاتے مگر بورڈ کے امتحان میں کئی برس سے ان دونوں مضامین کا نتیجہ مایوس کن آ رہا تھا۔ پتا چلا کہ وہ پڑھانے میں محنت کرنے سے زیادہ ٹیسٹوں میں نمبر دینے کی پالیسی پر یقین رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ دو تین نچلے عملے کے افراد، تو گھوسٹ (بھوت) ملازم نکلے یعنی آتے، حاضری لگائی اور غائب۔ اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔

پچھلی ہیڈ مسٹریس طبیعت کی درویش تھیں۔ سارا دن اپنے دفتر ہی سے مطلب رکھتیں۔ انھوں نے ایک اسسٹنٹ رکھی ہوئی تھی جو "سب اچھا ہے" کی رپورٹ دے کر انھیں مطمئن کر دیتی۔ وہ بھی اپنے دفتر کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے رہنا پسند کرتی تھی۔ البتہ کچھ استاد اور استانیاں اس کی تعریف کی زد میں زیادہ رہتے۔ وجہ ان کے بھاری بھرکم تحائف تھے جو وہ اکثر اسے دیتے رہتے۔ شیریں خانم جس سیاست بازی سے دور رہی، اب ہر پل وہی سامنے آ جاتی۔ شروع میں اساتذہ نے دبی دبی ہمدردی کے استحقاق کا مظاہرہ یوں کیا کہ فارغ وقت میں اس کے پاس آ بیٹھتے اور دوران گپ شپ ساتھیوں کے کچے چٹھے کھولنے لگتے۔ "میڈم! مس رضیہ نے اپنی جماعت میں آدھا گھنٹا فون پر بات کی۔ یا یہ کہ رفیق صاحب حسب معمول حاضری لگا کر میٹرک کی جماعت چھوڑ 'ضروری کام' سے گئے اور پورے پیریڈ غائب رہے۔"

چند دن معاملات کا جائزہ لینے کے بعد شیریں خانم نے کچھ سخت فیصلے کیے۔ کامن روم میں حیرت اور تشویش کے ساتھ اس کا حکم نامہ پڑھا اور سنایا گیا۔ سب کو صبح ہیڈ مسٹریس کی میز پر دھری ایک ٹوکری میں اپنے موبائل فون چھوڑنے اور گھر جانے سے قبل لینے تھے۔ ہر استاد کو اپنے ہر پیریڈ کی رپورٹ لکھ کر دفتر پہنچانی تھی۔ ہر ماہ کے آخر میں والدین اور اساتذہ کو میٹنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم ملا۔ شیریں پھر دن میں اچانک چھاپے بھی مارنے لگیں۔

جماعتوں میں ان چھاپوں کے دوران کئی بھیانک انکشافات سامنے آئے۔ مثلاً پرائمری اسکول کی مس ثانیہ بچوں کو اکثر کارٹون فلمیں لگا دیتی اور خود وہ بچے میں منہ چھپا سر میز پر رکھ کر سو جاتی۔ محترمہ موبائل پر رات گئے تک سوشل رہنے کی عادی تھیں، چناں چہ صبح کی بیداری کی قدر گراں گزرتی۔ انہی گوناگوں مصروفیات (فلم لگانا اور سونا) میں سے کچھ قیمتی لمحات چرا کر بچوں کو مقدور بھر پڑھا بھی دیتی۔ شیریں خانم نے جب مس ثانیہ کو فارغ کیا، تو دیگر اساتذہ کو بھی معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اب دبے دبے الفاظ میں ان کے خلاف پروپیگنڈا بازی شروع ہو گئی۔ اس سے وہ ناواقف تھیں مگر پرانے ساتھیوں کے کترانے اور تاثرات نے انھیں بوجھل کر دیا۔

دوسرا بڑا دھچکا اسسٹنٹ ہیڈ مسٹریس کی برطرفی ثابت

ہوا۔ شیریں خانم کو ان "محترمہ" کا کوئی مصرف سمجھ نہ آیا کیونکہ انتظامی معاملات میں وہ بالکل نابلد تھی۔ البتہ اس کی جگہ ایک زیرک اور انتظامی معاملات پر گرفت رکھنے والے مرد مددگار کی وہ ضرورت روزِ اول سے محسوس کر رہی تھی۔ اب ان "محترمہ" کے چہیتے اساتذہ اس برطرفی سے بے حد مایوس ہو گئے۔ کامن روم میں کھلا کھلا اختلاف گردش کرنے لگا۔ شیریں خانم کو "کھڑوس" اور "بداخلاق ہیڈ مسٹریس" کا لقب دیا گیا۔ پرانے احباب نے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ تمام گفتگو شیریں خانم کے کانوں تک بھی پہنچی، تو اسے پتا چلا کہ "کبھی بے تحکم خلقِ خدا غائبانہ کیا۔"

اگرچہ ان اقدامات کی وجہ سے اسکول کا ماحول، معیارِ تعلیم اور سالانہ نتیجہ بہتری کی طرف چل نکلا مگر شیریں خانم کا احساسِ تنہائی بھی بڑھ گیا۔ عملہ بحالتِ مجبوری فرض شناسی سے کام کرنا، تو سیکھ گیا مگر اسے رعایت دینے پر تیار نہ تھا۔ پھر ہمیشہ سے سمٹے سمٹے رہنے والی شیریں خانم کچھ قدم آگے بڑھ کر تعلقات بنانا نہیں جانتی تھی۔ جب وہ گھر لوٹتی تو تنہائی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ گھر میں بوڑھی ماں اور ملازمین کے سوا تھا ہی کون؟ بابا کی وفات کے بعد ماں بھی خاصی خاموش ہو گئی تھی۔ دوسرے کچھ عرصے سے اسے شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ بیٹی کی شادی نہ کر کے اس پر ظلم کیا۔

معاشی استحکام شیریں خانم کا سہارا تو تھا مگر ساتھی نہیں۔ بیٹی کی تنہا، ویران زندگی کتنے بڑے نفسیاتی خلا کا شکار تھی، اس کا احساس ماں کو ہر پل ستانے لگا۔ شیریں خانم خود بھی ہم عمر خواتین کو خوشیوں بھری شادی شدہ زندگی گزارتے دیکھتی اور ان کے جوان ہوتے بچوں پر نظر ڈالتی، تو دل ہی میں ماں باپ کے لیے ناراضی سی پیدا ہونے لگتی۔ وہ اس پر دباؤ بھی تو ڈال سکتے تھے۔ کیا تھا جو جبر کا راستہ اختیار کر کے اس کی شادی کر ہی دیتے؟ تب آج ضرور وہ کاندھے سے اوپر نکلتے بیٹے اور تیزی سے قد نکالتی بیٹی کی ماں ہوتی۔ اسے برسوں تک ماں باپ کا تعاون اب برا لگنے لگا۔ ماں باپ کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ اگر اولاد نہ مانے تب بھی فیصلہ وہی کرنا چاہیے جو درست ہو...... وہ اب اس امر کی قائل ہو گئی۔

زندگی اسی رفتار سے رینگ رہی تھی کہ ایک دن اچانک...... وہ والدین سے ملنے کا دن تھا۔ دفتر میں ایک لڑکے کا باپ داخل ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گئیں، چہرہ جانا پہچانا تھا۔ وہ نویں جماعت کے ایک لڑکے کا والد تھا۔ شیریں خانم دوسرے لمحے اسے پہچان گئی، وہ اسد تھا، اس کا ہم جماعت، وہ کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ شیریں کے لیے وہ پہلا اور آخری مرد تھا جسے دیکھ کر اس کے دل میں کچھ کچھ ہوا تھا۔ کالج میں وہ اچھے دوست اور ہم جماعت تھے۔

اسد اور اس کی نوک جھوک کا سب سے بڑا موضوع شادی ہی تھا۔ وہ شادی کے خلاف دلائل دیتی جبکہ اسد اس کے حق میں۔ اسد نے دبے دبے الفاظ میں اس سے مشترکہ مستقبل کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کی، مگر شیریں خانم کے سر میں شادی نہ کرنے کا سودا سمایا تھا، اس نے بات کو کبھی سنجیدہ ہی نہ لیا۔ تعلیم تمام ہوئی مگر رابطے بحال رہے۔ پھر ایک روز اسد نے اپنی شادی کا کارڈ تھما دیا۔ اس کی شادی اپنی ماموں زاد سے ہو گئی۔ شیریں پر اب روز انکشاف ہوا کہ اسد کو اپنی زندگی سے منہا کر کے زندگی بے رنگ و بے جان کر نا تھا۔ شرمسار ہو کر خود سے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اسد سے محبت کرتی تھی۔ پھر رابطے منقطع ہو گئے۔ اسد اپنی بیگم سمیت ملک سے باہر جا کر قصہ پارینہ بن گیا۔ اب البتہ کچھ ماہ سے شیریں کو اسد کی بار بار یاد آیا جسے اس نے ضد کی بھینٹ چڑھا کر کھو دیا تھا۔ قدم قدم پر اس کی باتیں یاد آتیں۔ وہ کہتا تھا "شیری! تم پچھتاؤ گی۔"

وہ یقین سے کہتی "نہیں پچھتاؤں گی۔"

وہ کہتا "دیکھو، تنہائی ایک عفریت ہے۔ انسان کو دھیرے دھیرے نگل لیتا ہے۔ انسان کو انسان کی ضرورت

ہے۔ رفاقت سب سے حسین تحفہ ہے جو رب نے آدم کو دیا۔ یہ مٹی کا باوا ہر بات سہ جاتا ہے مگر تنہائی اسے مار ڈالتی ہے۔ رفاقت ہو تو جینا آسان ہوتا ہے۔''

وہ اس کی باتیں چٹکی میں اڑا دیتی، کہتی "اسد! تم ضرورت سے زیادہ روایتی ہو۔ ارے بابا یہ سب گھسے پٹے رویے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ شادی ایک طوق ہے جو بطورِ خاص عورت اور بالعموم مرد کو اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ انھیں آفاقیت سے نکال کر ذات کے تنگ و تاریک خول میں بند کرتا ہے۔ وہ کسی قسم کا عظیم کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔''

وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہتا ''افسوس تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ دیکھو کچھ تقاضے روح کے ہیں اور کچھ جسم کے۔ اگر تم کہو کہ میں بغیر کھائے پیے زندگی گزاروں گی اور کھانے پینے جیسی غیر اعلیٰ سرگرمی میں وقت ضائع نہیں کروں گی تو بی بی دو سرے روز ہی ساری آفاقیت دھری رہ جائے گی۔ تمھیں چاند روٹی نظر آنے لگے گا۔ پیٹ بھرا ہو تب ہی آفاق کے اسرار و رموز پر نظر جاتی ہے۔ شادی صرف جسمانی نہیں رفاقت کا سکھ بھی ہے جو انسانی ذہن کو مزید بالیدگی دیتی ہے۔''

مگر شیریں اپنے مؤقف پر اڑی رہی۔ مگر اب کچھ مدت سے اپنے تھکے اعصاب اور مضمحل ذہن میں وہ اکثر اسد کی باتوں کی گونج سنا کرتی۔ آج وہ اچانک سامنے آ گیا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ کھڑا ہو گیا ''شیری تم..... میرا مطلب ہے..... سوری میڈیم..... آپ شیریں خانم ہیں نا۔''

وہ خاصا بوکھلایا ہوا سا ہو گیا۔ اسی کے نام کی تختی میز پر لگی تھی اور وہ نام پوچھ رہا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔ پھر اپنی ہنسی کی آواز پر خود ہی حیران رہ گئی۔ وہ کیا پورا کمرا، کمرے میں لگا پنکھا، میز، میز پر رکھی چیزیں، کھڑکی میں رکھا گلدان، سامنے دیوان پر لگا بورڈ اور بورڈ پر لگی تصاویر سب حیران ہو گئے۔ یہ آواز تو پہلی بار اس منہ سے نکلی تھی۔ وہ شرما سی گئی۔

پہچان کا مرحلہ طے ہوا تو پتا چلا کہ اسد کی بیوی تین سال قبل اللہ کی رحمت میں جا چکی۔ پھر وہ اپنے بیٹے تیمور کو بیوہ اور بے اولاد بہن کے پاس چھوڑ کر دبئی چلا گیا۔ اسکول میں تیمور کا داخلہ اس کی بہن ہی نے کروایا تھا۔ وہ باقاعدگی سے والدین اور اساتذہ کی ملاقات میں آتی مگر شیریں اسے نہیں پہچانتی

سب سے زیادہ گھڑیاں بنانے والا ملک

وہ کون سا ملک ہے جہاں سب سے زیادہ گھڑیاں بنتی ہیں؟ اصل میں جب پرزوں سے بننے والی گھڑیوں کا دور آیا، تو کوئی بھی ملک ایسا نہ تھا جہاں خاص طور پر گھڑیاں اور کلاک بنتے ہوں بلکہ گھڑیاں بنانے والے ہنرمند ملکوں ملکوں گھومتے اور کام کرتے تھے۔ اس لیے گھڑی سازی ایک عالمی پیشہ بن گیا۔ لیکن پھر جلد ہی مختلف ملکوں نے گھڑی سازی کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کر لی اور اس کی وجہ سے مشہور بھی ہو گئے مثلاً برطانیہ ایسے مخصوص کلاک بنانے کے لیے مشہور ہو گیا جنھیں بحری جہاز استعمال کرتے تھے۔ یہ کلاک سمندری لہروں اور طوفانوں میں بھی خراب نہیں ہوتے تھے اور صحیح ٹائم دیتے تھے۔ اسی طرح جرمنی کی ایک کمپنی ایسی گھڑیوں میں مشہور ہو گئی جن پر ہاتھ سے نقش و نگار بنے ہوتے تھے۔ ہیرے جواہرات والی گھڑیاں بھی جرمنی میں بننے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ فن سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا اور دنیا بھر کے کاریگر بھی وہاں جمع ہونے لگے۔ اب یہ صنعت سوئٹزرلینڈ کی قومی صنعت بن گئی ہے۔ جب کلائی کی گھڑیوں کا رواج شروع ہوا تو سوئٹزرلینڈ اس میں سب سے آگے تھا۔ اس وقت سوئٹزرلینڈ سب سے اعلیٰ اور معیاری گھڑیاں بنانے کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں الارم والی، آٹومیٹک اور تاریخ بتانے والی گھڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ امریکا بھی گھڑی سازی میں مشہور ہے لیکن ان گھڑیوں کے اکثر پرزے سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور جاپان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔

تھی۔ اسد سے ملاقات نے اس کے ذہن پر چھائی گرد کو جھاڑ دیا۔ وہ کافی دیر پرانی باتیں کرتے رہے۔ وہ آج بھی اتنا ہی اچھا دوست تھا جتنا کل!

اسد رخصت ہوا تو شیریں خانم نے اپنے دفتر میں اساتذہ کی میٹنگ بلالی۔ آج اس نے دل کھول کر ان کی تعریف کی۔ ساجدہ کی کوششوں کو سراہا اور عمدہ نتائج آنے پر مبارک باد دی۔ اس کے ساتھی پہلے تو حیران رہ گئے کیونکہ اتنی خوشگوار تبدیلی کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔ پھر خوش ہوئے اور شیریں خانم کے بنائے قوانین پر اسے مبارک باد دینے لگے کہ یہ تو سب ڈسپلن قائم کرنے سے ممکن ہوا۔ خوش گپیاں بھی ہوئیں۔ اور بالآخر اچھے ماحول پر یہ دن تمام ہوا۔

اسد سے ہوئی وہ پہلی ملاقات آخری نہیں تھی۔ وہ اکثر دفتر میں، باہر یا ایک دوسرے کے گھر ملنے لگے۔ اس کی ماں اور اسد کی باجی بھی ایک دوسرے سے دوستانہ مراسم میں بندھ گئیں۔ تیمور ان سب کا لاڈلا اور ایک ذہین و متین بچہ تھا۔ شیریں کو اس کی شائستہ عادات بے حد پسند تھیں۔ وہ بھی اپنی "مشہور زمانہ" ہیڈ مسٹریس کا نیا روپ دیکھ کر حیران تھا اور خوش بھی۔ اپنے ہم جماعتوں میں بڑھتی قدر و قیمت نے اسے انوکھی مسرت بخش دی۔ شیریں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی اور جھومتی رہتی اگر ایک دن وہ واقعہ پیش نہ آتا۔

وہ جون کا جھلسا دینے والا دن تھا۔ اسکول میں چھٹیوں کا آغاز ہو چکا تھا مگر وہ اور اس کا عملہ کچھ قضیے نمٹانے آ رہے تھے۔ وہ دوپہر کو گھر پہنچی تو باجی (اسد کی بہن) آئی ہوئی تھی۔ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا کہ شاید اسد اور تیمور بھی آئے ہوں مگر وہ اکیلی تھیں۔ اسے دیکھ کر بولیں "آؤ بیٹی! شگفتہ تمہارا ہی انتظار کر رہی تھیں" ان کے انداز میں صدیوں کی تھکن تھی۔ آنکھیں بھی بجھی بجھی تھیں۔

وہ ٹھٹک کر بولی "خیریت تو ہے نا؟"

ان کے بجائے شگفتہ باجی بولی "ارے خیریت ہی ہے بلکہ خیریت سے کچھ بڑھ کر ہی۔ اسد کی شادی کر رہی ہوں۔ دیکھو یہ لڑکی چنی ہے میں نے" اس نے گم صم بیٹھی شیریں کے ہاتھ میں ایک تصویر تھما دی۔ "اچھی ہے نا۔ عمر بھی درمیانی ہے۔ ارے ملنے کو تو کم عمر حسین لڑکیاں بھی مل رہی تھیں مگر اسد بڑی عمر کی لڑکی چاہتا ہے۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہے۔ اچھے خاندان کی ہے۔ ہے نا۔"

شیریں کو سنبھلنے میں چند لمحے لگے۔ پھر وہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے پیچھے چھپ گئی۔ اب اس نے تصویر لے لی جو بے دھیانی میں لوٹا چکی تھی۔ پھر توجہ سے دیکھا اور مسکرا کر بولی "باجی! لڑکی بہت اچھی ہے۔ اسد کے ساتھ جچے گی..... مبارک ہو۔"

باجی خوش ہو گئی، بولی "اے لو! بی بی یونہی مبارک باد نہیں، گھر آنا ہوگا۔ اسد کو یہ تصویر تمہیں ہی دکھانی اور اسے شادی پر راضی کرنا ہے۔ یونہی سوکھی مبارک باد کہاں؟"

شیریں نے سینے سے نکلتی آہ سرد کو روکا اور کہا "مجھے! میں ہی کیوں؟ آپ یا تیمور کیوں نہیں؟"

باجی مسکرا کر بولی "ڈرتی ہو اس سے؟"

شیریں الجھ کر اسے تکنے لگی۔

"ہم بھی ڈرتے ہیں۔ راضی نہیں ہوتا وہ شادی پر۔ پہلی بھی بڑی مشکل سے کروائی تھی۔ اب تو نام نہیں لیتا۔" وہ آزردہ تھی۔ پھر ان کی امید کا جگنو تھا۔ کہنے لگیں "شیریں! تم دوست ہو اس کی، اسے قائل کرو نا۔" باجی نے اس کے ہاتھ تھام کر وعدہ بھی کر لیا۔ اگلے روز وہ اس وعدے کی تکمیل کرنے ان کے گھر چلی گئی۔

اسد ایک دم جان گیا۔ اس نے تصویر دیکھنے سے انکار کر دیا۔ شیریں نے اصرار کیا تو بولا "جانے دو یار۔ جب تم اتنی تعریفوں کے پل باندھ رہی ہو، تو اچھی ہی ہوگی۔ مجھے اس کی صورت سے غرض ہے نا سیرت سے۔"

وہ اکتایا ہوا بولا، تو وہ حیران ہو گئی، بولی "میں اسد....."

ایسا کیوں کہا تم نے..... ارے بھئی ہم پرخلوص تھوڑی رہے ہیں ہم" خوشی خوشی کرنا چاہیے یہ کام۔ شادی بے حد ایک بے حد خوبصورت رفاقت کا عہد نامہ۔"

وہ اپنی رو میں بول رہی تھی جبکہ وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر تھا، تاسف اور ملامت تھی۔ اسے اس بات کا احساس ہوا، تو جیسے بریک لگ گئی۔ "کیا ہوا؟" وہ حیرانگی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ کرب سے مسکرایا اور بولا "شیریں! تم صرف دکھ دینا ہی جانتی ہو یا کچھ اور بھی.....؟"

وہ مزید الجھ گئی "ایسا کیوں کہا؟ الجھاؤ مت..... صاف صاف کہو۔"

اسد کے چہرے پر ہارا ہوا غصہ نظر آیا، بولا "تم مجھے تب بھی نہیں سمجھی تھی اور آج بھی نہ پائیں۔ تم عقل عورت، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کل بھی محبت تھی آج بھی ہے۔ تمہیں زندگی کا ساتھی بنانے کی ہمیشہ سے خواہش تھی اور اب بھی ہے۔ مگر تم پر تو اکلاپے کا بھوت سوار تھا اور شاید ہے بھی۔ آزادی، تنہائی اور خودمختاری کے احمقانہ نظریات نے تمہیں اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ اب تم میرے سامنے پھر ایک سمجھوتے کی زنجیر لیے چلی آئی ہو۔ تم جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

اس نے ہاتھ جوڑے تو شیریں کے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ کی پشت رکھے ہنس رہی تھی۔ اسد برا مان گیا تو شیریں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر ہنسی پھر بھی نہ رک رہی۔

☆☆

ٹھیک ایک ماہ بعد ان کا نکاح ہو گیا۔ زندگیوں پر خوشیوں اور رفاقتوں کے در وا ہوتے چلے گئے۔ اسد شکر گزار تھا کہ شیریں نے اس کی محبت کو قبول کر لیا جس کا وہ اکثر اظہار بھی کر دیتا۔ اور شیریں اسد کی ممنون تھی کہ اس کی ویران و بنجر زندگی کو وہی گل و گلزار بنانے والا تھا۔

مگر اس نے اسد پر کبھی ظاہر نہ کیا کہ وہ اپنے پرانے

خرگوش کی سانپ سے لڑائی

ماں کی ممتا صرف انسانوں میں نہیں بلکہ جانوروں میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اسی لیے خطرے کے عالم میں مرغی کا اپنے بچوں کو پر پھیلا کر چھپا لینا یا بلی سے لڑائی مول لینا ماں کی محبت کے جذبے کو انمول بنا دیتے ہیں ایسا ہی کچھ کیا ایک مادہ خرگوش نے، جس نے اپنے بچے کو سانپ کے منہ سے نہ صرف چھڑا لیا بلکہ اسے سزا دینے کے لیے اس سے خوب لڑائی بھی مول لے لی۔

کالے سانپ نے مادہ خرگوش کی غیر موجودگی میں اس کے ننھے منے بچے پر حملہ کر کے اسے اپنے منہ میں دبوچ لیا۔ قریب تھا کہ اسے اپنی خوراک بنا لیتا لیکن اس دوران اچانک ماں وہاں پہنچ گئی اور ایک ہی حملے میں اپنے بچے کی زندگی بچائی۔

مادہ خرگوش نے سانپ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ سانپ نے بھی جوابی حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مادہ خرگوش کی جانب سے تابڑ توڑ حملوں کے بعد سانپ نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ لیکن خرگوش نے بھی اسے آسانی سے بھاگنے نہ دیا اور اس کو بری طرح جکڑے رکھا۔ تاہم لڑائی میں بری طرح پسپا ہونے کے بعد سانپ آخر کار جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

فلسفہ تنہائی سے منحرف ہو چکی۔ وہ یہ بھی جان گئی کہ عورت گھر اور شوہر کے بغیر نامکمل ہے۔ اولاد ہی اس کا غرور و فخر ہے۔ اور ازدواجی زندگی اللہ رب العالمین کا سب سے حسین تحفہ! یہ جنت میں دی جانے والی وہ واحد نعمت تھی جسے ساتھ لے کر زمین پر جانے کی اجازت دی گئی۔

اسد اور شیریں کی ہنستی مسکراتی زندگی میں تیمور مرکز وہ تھا۔ شیریں اسے دیکھ کر وہی مسرت محسوس کرتی جو اپنی اولاد کو بڑا ہوتے دیکھ کر ہوتی۔ یہ نعمتیں ملنے پر وہ اللہ کی بے حد شکر گزار تھی جس نے ٹھکرانے کے باوجود اس پر نعمتوں کا در ہمیشہ کے لیے بند نہ کیا۔

◆◆◆

تاریخ دانوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یونانی تہذیب نے دنیا کو دو بہترین تحفے دیے ہیں: ایک جمہوریت اور دوسرا اولمپکس! مشہور شاعر پنڈر (Pindar) کے الفاظ میں اولمپکس کی حیثیت کھیلوں میں ایسی ہی ہے جیسی ستاروں کے جھرمٹ میں سورج کی! جہاں فانی انسان بھی خدا سمان دکھائی دیتے تھے۔ یونانی مفکرین کے نزدیک اولمپکس بلند ترین انسانی اقدار کے حصول کا ذریعہ تھے جن کا مقصد ریاست اور اعلیٰ درجے کے شہریوں کے درمیان ایک صحت مند تعلق قائم کرنا تھا۔

بوڑھا سقراط ہر چند کوئی امیر آدمی نہیں تھا لیکن جب وہ برہنہ پا کھڑے ہو کر کلام کرتا تو اسے نہایت توجہ اور ادب سے سنا جاتا تھا۔ یونانی معاشرے میں انسانی شعور کی پختگی اور اخلاقی قدروں کی بلندی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی نے سکندر اعظم سے پوچھا "آپ استاد کو باپ پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "اس لیے کہ باپ تو مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور استاد ارسطو زمین سے آسمان پر لے گیا، باپ سبب حیات فانی اور استاد موجب حیات جاودانی ہے۔ باپ میرے جسم کی پرورش کرتا ہے اور استاد میری جان کی۔"

یونانی تہذیب نے جہاں دنیا کو علم و ادب، فلسفہ، آرٹ اور فن تعمیر کی دولت سے مالا مال کیا وہیں نسل انسانی کو پہلی مرتبہ منظم اور مربوط انداز میں قدیم اولمپکس کی شکل میں کھیلوں کے تصور سے بھی روشناس کرایا۔

اولمپکس کا بنیادی فلسفہ دنیا میں امن، انسان کی بہتری اور جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کرنا تھا۔ یہ کھیل بارہ صدیوں تک ہر چار سال بعد باقاعدگی سے منعقد ہونے کے بعد رومی بادشاہ تھیوڈوسیس اول (Theodosius-I) کے فرمان کے نتیجے میں بظاہر زوال پذیر ہو گئے۔ اولمپیا کا میدان دریاؤں کی بے رحم موجوں، آتش زدگی، زلزلوں، حملہ آوروں کی لوٹ مار کا شکار ہو کر دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اولمپکس نے تاریخ انسانی پر جو انمٹ نقوش ثبت کیے ان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے عروج کے دور میں قدیم اولمپکس میں ۱۴ کھیلوں میں ۳۰۰ کھلاڑی اور لگ بھگ چالیس ہزار تماشائی موجود ہوا کرتے تھے جبکہ آج جدید اولمپکس کھیلوں میں ۳۰۰ ایونٹس میں ۲۰۶ ممالک کے ۱۲ ہزار کھلاڑی، ۵ ہزار ایتھلیٹس شرکت کرتے ہیں اور اسے ٹیلی ویژن کی نشریاتی لہروں پر ۵ ارب انسان دیکھتے ہیں۔

قدیم اولمپکس کا اجمالی جائزہ تاریخ کے طالبعلموں، بالخصوص کھیلوں کے شیدائیوں کے لیے اپنے اندر تاریخی معلومات کا بے پناہ خزانہ سمیٹے ہوئے ہے، تو دوسری جانب سامان عبرت بھی! اولمپیا کے کھنڈر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ بادشاہوں کو تعمیر کا شوق ہوتا ہے وہ نئی نئی عمارتیں بنانے کی غلطی کرتے رہتے ہیں اور تاریخ ان کی اصلاح یوں کرتی ہے کہ محلات سے ایک دن رہائش گاہ، سو دن عجائب خانہ اور ہزاروں دن عبرت سرا کا کام لیتی ہے۔

☆ تاریخی دستاویز کے مطابق قدیم اولمپک کھیلوں کا آغاز ۳ ہزار سال قبل یونان کے مقام اولمپیا میں ۷۷۶ بی سی میں ہوا تاہم تاریخ دانوں کے مطابق اولمپک اس سے کہیں پہلے چھٹی صدی کے اختتامی سالوں سے جاری تھے اور ایک روایت کے مطابق ان کھیلوں کی بنیاد دیوتاؤں کے بادشاہ زیوس کے بیٹے ہرکولیس نے رکھی۔

☆ ایک اور روایت کے مطابق پنڈر نے یونانی دیومالائی کردار ہرکولیس (Hercules) کو اولمپکس کا بانی قرار دیا ہے جسے اوگیاس (Augeas) کے اصطبل کی صفائی پر مامور کیا گیا تھا۔ ہرکولیس (Hercules) نے دریا کا رخ موڑ کر ان کی صفائی کی مگر جب مالک نے اس کی مزدوری دینے سے انکار کیا تو اسے قتل کر دیا اور اس کی زمین پر قبضہ کرنے کے بعد

سارا مال غنیمت اولمپیا کے قریب پیسا (Pissa) کے مقام پر منتقل کر دیا۔

☆ اولمپک کو یہ نام مقدس مقام اولمپیا سے ملا جو جنوبی یونان کے مغربی جزیرہ نما میں واقع ہے۔

☆ ۷۷۶ بی سی میں منعقدہ اولمپک کے پہلے اولمپک فاتح کا اعزاز ایلس (Elis) کے شہری ''کوری بس'' نامی ایک باورچی کے نام رہا جس نے واحد ایونٹ ۱۹۰ میٹر کی اسٹیڈ دوڑ جیتی۔

☆ اولمپکس کے فاتحین کو جنگلی زیتون کے پتوں کا تاج پہنایا جاتا۔ یہ انعام انھیں آسمانوں سے اترنے والی فتح کی دیوی نائکی کی جانب سے دیا جاتا۔ نائیک یونانی زبان میں فتح کا ہم معنی لفظ ہے۔ ہر چند خواتین کے لیے اولمپکس میں شرکت کی ممانعت تھی لیکن نوجوان لڑکیوں کے لیے زیوس کی اہلیہ ہیرا (Heraia) کے نام سے علیحدہ سے مقابلے منعقد کیے جاتے جس میں صرف دوڑوں کے مقابلے شامل ہوتے۔

☆ اولمپکس کے انعقاد کا اعلان اہم یونانی شہروں میں خصوصی پیامبر ڈھنڈوروچیوں (Spondorophori) کے ذریعے کیا جاتا۔ کھیلوں کے دوران جنگ بندی رہتی تاکہ کھلاڑیوں اور تماشائیوں کو محفوظ رسائی اور واپسی کا راستہ مل سکے۔ اولمپکس کے مذہبی تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے یونان کی متحارب شہری ریاستیں اولمپکس کے مقدس مہینے کے دنوں میں جنگ بندی کر لیا کرتی تھیں تاکہ ہر ریاست سے کھلاڑی بلا روک ٹوک اولمپیا پہنچ سکیں۔

☆ اولمپک کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہد قدیم میں وقت اور ماہ و سال کو اولمپک کے درمیانی وقفے کے چار سالوں سے ناپا جاتا۔

☆ فاتح کو انعام میں زیتون کی شاخ سے بنا تاج پہنایا جاتا تھا۔ یہی نہیں زیتون کا تیل صابن کی جگہ نہانے دھونے، جلد کو نرم رکھنے اور مساج کے کام بھی آتا تھا۔

☆ قدیم اولمپکس میں افتتاحی مشعل حلف برداری یا میراتھن دوڑ کا کوئی تصور نہیں تھا۔

☆ اولمپکس میں انعامات کی تقسیم کے لیے علیحدہ دن مقرر نہیں تھا بلکہ ہر فاتح کو موقع پر انعام سے نوازا جاتا تھا۔ انعام دیے جانے سے پہلے خصوصی اور زینت (Ornate) کی ایک میز پر رکھا جاتا جسے کولوٹس (Kolutes) نامی آرٹسٹ نے ڈیزائن کیا تھا۔



ایک قدیم اولمپک اسٹیڈیم کے کھنڈر

☆ رتھوں کی دوڑ اولمپکس کا سب سے اہم اور معتبر مقابلہ تھا لیکن جیت کا سہرا جوکی یا گھوڑوں کے سر نہیں بلکہ اس کے مالک کے سر پر بجتا تھا خواہ وہ اسٹیڈیم تو کجا اولمپیا ہی میں موجود نہ ہوتا۔

☆ اولمپکس کے حوالے سے کئی حقائق ابھی تک ایک راز ہیں اور ماہرین کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ مثلاً قدیم کھیلوں میں طویل دوڑوں کا دورانیہ اور پینٹا تھلون (Pentathlion) کے فاتح کے تعین کا طریقہ کار۔

☆ موسیقی اور گلوکاری ہر چند اولمپکس کا حصہ نہیں تھے لیکن ڈیلفی (Delphi) گیمز میں انھیں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ شاعری اور ڈرامہ نگاری بھی ان مقابلوں کا لازمی

حصہ تھے۔ رباب، سارنگی اور بانسری کی رسیلی تانوں کا مقابلہ سماں باندھ دیتا۔

☆ یہ اولمپک ہر چار سال بعد ۶/ اگست سے ۹ ستمبر تک زیوس دیوتا کے احترام میں منعقد ہونے والے مذہبی تہوار کا حصہ ہوتے۔

☆ اولمپکس میں کھلاڑی برہنہ حصہ لیتے۔ ان کے فلسفے کے مطابق ایسا توازن اور ہم آہنگی، جسم اور ذہن کی تعلیم، پاکیزگی اور جسمانی حفاظت کے اصولوں کے مدنظر تھا۔ جسمانی خوبصورتی کو باطنی حسن کا مظہر گردانا گیا۔ اس برہنگی کی وجوہات کے حوالے سے دو روایات مشہور ہیں وہ یہ کہ ۷۲۰ قبل مسیح میں ایک اوپیریس نامی ہوڑاک کا جامہ دوڑ کے دوران گر گیا جس کے بعد برہنگی کی رسم عام ہو گئی۔ دوسری یہ کہ اسپارٹا کے اتھلیٹ نے اپنی ثقافت کے تعارف کے طور پر برہنگی متعارف کرائی۔

☆ قدیم اولمپکس کے کئی نامی گرامی کھلاڑیوں کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان میں کروتن کے پہلوان مائلو (Milo) قابل ذکر ہے جو ۲۶ سالہ کیریئر میں ناقابل شکست رہا۔ وہ اپنی بسیار خوری کے لیے بھی شہرت رکھتا تھا۔ روایت کے مطابق ناشتے میں سالم بکرا ڈکار جاتا تھا اور توانا بیل کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر دوڑ سکتا تھا۔ لیونیڈاس (Leonidas) کو چار مرتبہ اولمپک میں دوڑیں جیتنے پر اس کے ہم وطن اسے خدا کا درجہ دیتے تھے۔ پھر سانیا (Cania) کے باکسر میلانکماس (Melankmas) جو نہ صرف اپنی طاقت و وجاہت کے باعث مرکز نگاہ رہے بلکہ ان کی باکسنگ کی تکنیک بھی منفرد تھی جس میں وہ مخالف پر حملہ کرنے کے بجائے اسے تھکا کر مارنے میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ آرگیوس (Argeus) بھی لمبی دوڑ کا ماہر تھا جس نے اپنی فتح کی خبر گھر تک پہنچانے کے لیے ۶۰ میل کی دوڑ لگائی۔

☆ اولمپک کے زیر اثر پان ہیلینی (Panhellenic) گیمز وجود میں آئیں جن میں ڈیلفی (Delphi) کے پائتھن (Pythan) گیمز، کورنتھ (Coniuath) کے استھمیا (Isthmian) گیمز اور نیمیا (Nemea) کے نیمین (Nemean) گیمز شامل تھیں اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ چاروں گیمز کبھی بھی کسی ایک سال کے دوران منعقد نہیں ہوئیں۔ پان ہیلینی مذہبی تقدس کی حامل تھیں اور مختلف دیوتاؤں کے اعزاز میں منعقد کی جاتی تھیں اولمپکس اور نیمیا دیوتاؤں کے بادشاہ زیوس کے اعزاز میں، ڈیلفی (Delphi) روشنی اور شفق کے خدا "اپالو" اور کورنتھ سمندر اور گھوڑوں کے دیوتا پوسیڈن (Poseidon) کے لیے۔

☆ کئی صدیوں تک یونان میں اولمپکس ہی مرکزی حیثیت کے واحد مقابلے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کھیلوں کی مقبولیت کے پیش نظر تین اور مقابلے بھی منظر عام پر آ گئے۔ ہر چند سب سے معتبر حیثیت اولمپکس ہی کو حاصل رہی جیسے ٹینس کے یو ایس اوپن، آسٹریلین اوپن اور فرنچ اوپن بھی "گرینڈ سلیم" ایونٹ ہیں لیکن ومبلڈن ہی کو ٹینس کا مکہ سمجھا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے بتاتا چلوں کہ آج دنیا میں بیڈمنٹن، اسکواش اور سائیکلنگ کے ہزاروں ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں لیکن آل انگلینڈ بیڈمنٹن، برٹش اوپن اسکواش اور ٹور ڈی فرانس کو سب سے معتبر مقابلوں کا درجہ حاصل ہے۔ بہر حال تین نئے ایونٹس میں ۵۸۲ قبل مسیح میں شروع ہونے والے ڈیلفی (Delphi) کے پائتھس گیمز، اسی سال ایتھنز میں شروع ہونے والے استھامیا (Isthamlau) گیمز اور ۵۷۳ ق م میں نیمیا میں شروع ہونے والے نیونیو (Neuneau) گیمز شامل تھیں۔

☆ یہ چاروں کھیلیں قومی اہمیت کی حامل تھیں کیونکہ یہ یونانیوں کو قریب لانے کا باعث بنیں۔ تاریخی لحاظ سے یونان

ایک منظم ریاست نہیں تھا بلکہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے خود مختار چھوٹی بڑی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ یہ کھیل ان کو مشترکہ ثقافت اور مذہب کے بندھن میں پرونے کا کام دیتے۔

☆ جو کھلاڑی پان ہیلنک گیمز کے چاروں مقابلے جیتتا اسے پیریوڈونکس "Peniodonikes" کا خطاب دیا جاتا۔

☆ ۷۰۸ بی سی میں پینٹاتھلون (Pentathlon) جس میں دوڑ، لانگ جمپ، ڈسکس، جیولن تھرو شامل تھیں، کا اضافہ ہوا۔

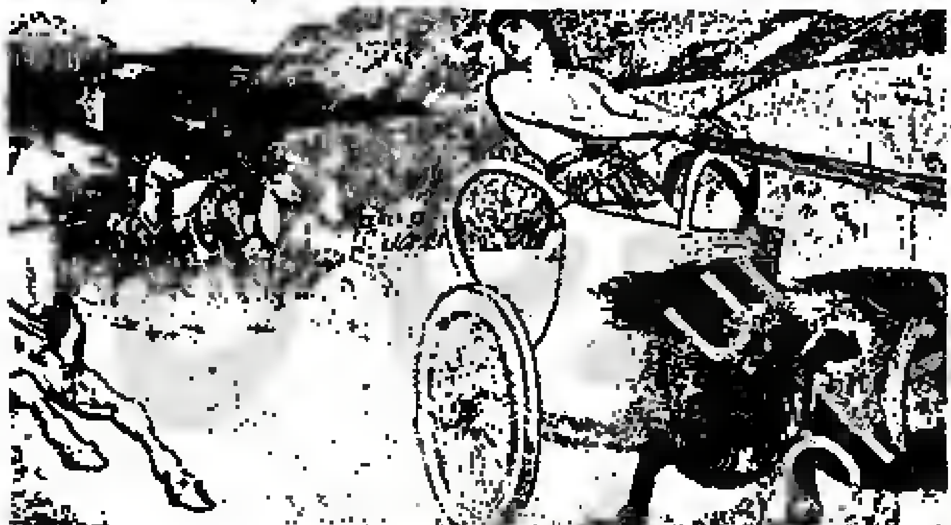
☆ ۶۸۸ قبل مسیح میں باکسنگ، ۶۸۰ قبل مسیح میں چیریٹ ریس اور ۶۴۸ بی سی میں پانکراتیون (Pankration) یعنی باکسنگ اور کشتیوں کے باہمی امتزاج کو شامل کیا گیا۔

☆ اولمپک کھیلوں میں شرکت یونان کے آزاد مرد شہریوں تک محدود تھی۔ خواتین کو شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ شادی شدہ خواتین کو تو یہ مقابلے دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ روایت کے مطابق اگر کوئی خاتون کھیلوں کو دیکھنے کی مرتکب پائی جاتی تو اسے تائپین (Typacan) نامی بلند ٹیلے سے گرا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ ہر چند ایسے کسی واقعے کا دستاویزی ثبوت تاریخ کے دامن میں نہیں لیکن اس پابندی کی ایک خلاف ورزی ضرور تاریخ میں محفوظ ہے۔ کالی پتیرا (Kallipateuia) نامی خاتون جو مشہور اولمپک چیمپئن ڈائگوناس (Diagonas) کی بیٹی اور تین اولمپک جیتنے والے بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی نے اپنے بیٹے اولمپک فاتح پیسیوڈوس (Peisivodos) کے کوچ کا روپ دھار کر اولمپک میں شرکت کی تھی لیکن اس کے خاندان کے غیر معمولی کارناموں کے باعث اسے سزا سے مبرا قرار دے دیا گیا۔

☆ مشہور مجسمہ ساز فیڈیس (Pheidius) نے سونے سے مقدس دیوتا زیوس کا ۱۳ میٹر کا مجسمہ بنایا جسے قدیم دور کے سات عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ شاندار پرشکوہ مجسمہ فیڈیس (Pheidius) کے فنِ تعمیر کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

☆ اولمپک کو چھوڑ کر کھیلوں کے دوسرے مقابلوں میں فنونِ لطیفہ یعنی مجسمہ سازی، موسیقی، شاعری کے مقابلے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے ارسطو نے موسیقاروں کو بھی ایتھلیٹ کے نام سے پکارا۔

☆ میراتھن دوڑ کا واقعہ بھی اپنے اندر دلچسپ تاریخی



اولمپکس میں رتھوں کا مقابلہ

واقعات سموئے ہوئے ہے۔ ۴۹۰ ق م کا واقعہ ہے کہ جب ایتھنز کی مختصر سی فوج نے ایرانیوں کے ایک بڑے لشکر کو میراتھن کے مقام پر شکست دی تھی جو ایتھنز کے شمال مشرق میں ۲۶ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ فتح کی یہ خوشخبری ایک اولمپکس چیمپئن فی ڈیپز (Pheidippies) کے ذریعہ بھیجی گئی۔ فی ڈیپز نے ۲۶ میل کا یہ سارا فاصلہ تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے طے کیا۔ پہاڑی چٹانوں اور دریائی وادیوں سے گزرتے ہوئے جب وہ ایتھنز پہنچا تو اتنا زخمی اور بے حال ہو چکا تھا کہ "Rejoice! we have won" (خوشیاں مناؤ ہم جیت گئے) کی خوشخبری سناتے ہی زمین پر گرا اور دم

توڑ دیا۔ لیکن یہ سارا واقعہ من گھڑت اور پیری ڈی کوبرٹن کے یہودی دوست بریئیل کے ذہن کی اختراع ہے۔ جس نے پیری ڈی کوبرٹن کے ہمراہ ایتھنز کا دورہ کیا' تو میراتھن کا میدان دیکھ کر یہ فرضی قصہ گھڑ لیا۔ جس کا مقصد قدیم اور جدید کھیلوں کو ہم آہنگ کرنا اور تاریخ کی دھند میں لپٹے واقعات سے جدید اولمپکس میں چاشنی اور عوامی پذیرائی پیدا کرنا تھا۔

☆یونانی ایتھلیٹکس کے مقابلوں کو کتنی اہمیت دیتے اور ان کی تیاری کے ضمن میں کتنی جزیاتی تیاری کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس عہد کی دستیاب نادر دستاویزات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ورزش کار کھیل کی تیاری میں سخت قوانین کی مکمل پاسداری کرتے۔ یہ تیاریاں صبح سے شروع ہو کر شام گئے تک جاری رہتیں۔ دن کا آغاز روٹی اور انگور کے ناشتے سے ہوتا جس کے بعد سخت تربیت کا آغاز ہوتا جو دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بغیر شام ڈھلے تک جاری رہتا جس کے بعد مرغن کھانے کا اہتمام ہوتا۔ ابتدائی اولمپک کھیلوں میں ورزش کار پھلوں، سبزیوں اور پنیر پر اکتفا کرتے بعد میں ان میں مچھلی اور گوشت کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس عہد کے حالات یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ ورزش کار اوسطاً چھ سیر گوشت فی کس کھا جاتے تھے۔ شراب اور ٹھنڈے مشروبات کی ممانعت تھی۔

☆صدیوں تک اولمپکس کے زائرین کے لیے کوئی باقاعدہ رہائشی بندوبست نہیں تھا۔ نہیں خیمے انہیں کھلے آسمان تلے قیام ہوتا۔ لگ بھگ ۳۲۵ ق م میں لیونی ڈاس نامی شخص نے معززین کے لیے ایک وسیع گیسٹ ہاؤس تعمیر کروایا۔ یہ عمارت فن تعمیر کا شاہکار تھی جس میں قیام پذیر شائقین کا بیک وقت ایک جانب مقابلہ گاہ کا منظر' تو دوسری جانب کشادہ وادی کا طائرانہ نظارہ استقبال کرتا۔

☆وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اولمپیا میں مقابلوں کے لیے اسٹیڈیم، جمنازیم، ویلوٹ روم، رہائش گاہیں، شاندار غسل خانے تیراکی کے سوئمنگ پول، عبادت مندروں کا جال بچھ گیا۔

☆اولمپکس کے پہلے دن کھلاڑی کوچز، ججز زیوس کے مجسمے کے سامنے پوری دیانت داری سے کھیلوں میں حصہ لینے کا حلف اٹھاتے تھے۔

☆۳۹۶ ق م میں اولمپک کے دنوں میں اضافے کے بعد دوسرا دن ایکوئیسٹرین (Equestrain) مقابلوں اور پینٹا تھلون (Pentatholun) کے لیے مخصوص ہوتا۔

☆اولمپک کا سب سے مقدس اور اہم فریضہ یعنی زیوس کے لیے قربانی تیسرے دن کی صبح انجام دی جاتی۔ مختلف ریاستوں کے سفراء، پادری، ججز، ایتھلیٹس پر مشتمل جلوس بینڈ باجوں کے شور کے جلو میں زیوس کے مجسمے کے سامنے حاضری دیتے۔ اس موقع پر مذہبی پروہت سو بیلوں کی قربانی دیتے۔ برگزیدہ افراد قربانی کے بعد جانوروں کی ہڈیاں معبد کی چھت پر لے جا زیوں کے احترام میں جلاتے۔ ہڈیوں کی راکھ وہیں پڑی رہتی جبکہ جانوروں کا گوشت حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا۔

☆۲۰۰ ق م میں جبکہ لڑکوں کے مقابلے عروج پر تھے، تیسرے دن سہ پہر کو یہ مقابلے منعقد ہوتے جبکہ رات پیلوپس (Pelops) کے مزار پر قربانی اور مذہبی رسومات کے لیے مخصوص تھی۔

☆چوتھا دن خالصتاً دوڑوں اور دوسرے مقابلے کے لیے مخصوص تھا جبکہ رات کو تمام شرکا کے لیے پرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا جاتا۔

☆قدیم یونانیوں کے لیے اولمپیا اور زیوس کا مندر متبرک ترین مقام تھا جہاں قربانی کی رسم صرف اولمپک تک محدود نہ تھی بلکہ پورے سال اہتمام سے ادا کی جاتی تھی۔

☆اولمپک میں شاندار غسل خانے تھے جہاں چشموں سے پانی پہنچایا جاتا تھا جبکہ پانچویں صدی میں تعمیر شدہ واحد سوئمنگ پول کی لمبائی ۸۰، چوڑائی ۵۰ اور گہرائی ۵ فٹ تھی۔

☆ مشہور شاعر ہومر اپنے ہیرو اکیلیز (Achillies) کو سب سے بہتر یونانی قرار دیتا ہے۔ ہر چند وہ اولمپکس کا ذکر نہیں کرتا لیکن وہ ایتھلیٹکس مقابلوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ ٹروجن وار کے ہیروز ایتھلیٹکس کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں بھی جب اکیلیز کا بہترین دوست پاٹروکلیس (Patroclues) موت کے بعد محتاج کفن تھا، اکیلیز نے اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایتھلیٹکس کے مقابلے منعقد کروانے کا فیصلہ کیا۔

☆ اولمپیا زیوس دیوتا کی سب سے مقدس عبادت گاہ تھی اور اولمپک کھیل اس کے اعزاز میں منعقد کیے جاتے تھے۔ اس موقع پر قربانی اور تحائف زیوس کی بھینٹ چڑھائے جاتے اور ایتھلیٹ اس کے مجسمے کے سامنے قواعد کی پابندی کرنے کا حلف اٹھاتے۔

☆ ہر چند آغاز میں کھلاڑی پیشہ ور نہیں تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ پیشہ ور کھلاڑیوں کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے۔ خاص طور پر ۱۴۶ ق م میں رومیوں کے زیر تسلط آنے اور رومی شہریت کا دائرہ دور دراز علاقوں تک پھیلنے کے بعد ۲۲۸ ویں اولمپکس ۲۱۲ء میں تمام باشندے حصہ لینے کے اہل قرار پائے۔

☆ اولمپکس کے لیے ہر شہر سے بہترین ایتھلیٹ کا چناؤ ہوا کرتا۔ انھیں سخت مشقت اور تیاری کے مراحل سے گزارا جاتا۔ اولمپکس کا اعلان ہونے کے بعد یہ چیدہ کھلاڑی طویل و دشوار گزار مشکل سفری مراحل طے کرنے کے بعد اولمپیا کے مضافات میں واقع ایلس (Elis) پہنچتے جہاں یہ ایک ماہ تک مزید تربیت حاصل کرتے اور پھر حتمی سلیکشن کے بعد خوش نصیب ایتھلیٹ اولمپیا پہنچ کر قواعد کے مطابق حصہ لینے کا حلف اٹھاتے۔

☆ تمام احتیاطی تدابیر اور حلف کے باوجود انسان میں خیر و شر کے ابدی بیج کے زیر اثر کھلاڑی جیتنے کے لیے تمام ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتے۔ بددیانتی کے مرتکب کھلاڑیوں پر جرمانہ عائد کیا جاتا جس کی رقم سے زیوس کے مجسمے تعمیر کیے جاتے جنھیں اسٹیڈیم کی گزرگاہ کے راستے میں نصب کیا جاتا۔ ان مجسموں کے قدموں پر بے ایمان کھلاڑیوں کے نام جلی حروف میں کندہ کیے جاتے تاکہ وہ دوسروں کے لیے نشان عبرت بنیں۔



قدیم یونان کا مشہور سورما، اکیلیز

☆ اولمپکس میں فاتح کھلاڑیوں کو ان کے وطن میں ہیروز کا درجہ دیا جاتا۔ ساری زندگی ان کی پوجا کی جاتی۔ انعام و اکرام کی ایسی بارش ہوتی کہ وہ باقی زندگی مالی آسودگی سے بسر کرتے۔ یہی نہیں ان کے نام کے سکے بھی جاری کیے جاتے جن پر ان کی شبیہ کندہ ہوتی۔ ان کے مجسمے چوکوں میں نصب کیے جاتے اور شعرا ان کے کارناموں پر کلام پڑھتے۔ زیتون سے بھرے مٹکے ان کی نذر کیے جاتے جو اس دور میں سونے سے زیادہ قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ تو فاتح اولمپکس کا شہری ریاست میں واپسی پر، اس کی عظمت اور طاقت کے اعتراف کے طور پر استقبال قلعہ کے روایتی دروازے کے بجائے فصیل شہر توڑ کر کیا جاتا گویا۔

فصیل شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے

کسی بھی باپ رعایت سے میں نہیں آیا

٭ ایتھلیٹکس ہمیشہ ہی سے یونانی معاشرے کا جزو لاینفک رہے۔ ان کا تذکرہ رومی اور یونانی تاریخ دانوں، شاعروں، فلسفیوں حتیٰ کہ عیسائی پادریوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ 5ویں صدی کے تاریخ دان ہپیوس (Hippios) نے اولمپکس کی قدیم ترین کیٹلاگ مرتب کی۔ پانسانیاس (Pausanias) کے مطابق اولمپکس میں مختلف مقابلوں کا اضافہ بتدریج ہوا۔ ہومر کے مطابق "جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کے لیے اپنی فتح مندی کے اس احساس سے زیادہ کوئی کامیابی نہیں جو اس نے اپنے پیروں یا ہاتھوں کی بدولت کھیلوں کے میدان میں حاصل کی ہو۔"

٭ ایکیلیز کے مقابلوں میں چار دیگر کھیلیں شامل تھیں: شمشیر زنی، بھاری پتھر پھینکنا، تیراندازی اور Spearthros۔ یاد رہے تیر اندازی اور شمشیر زنی کبھی اولمپکس کا حصہ نہیں رہے جبکہ جیولن تھرو ہمیشہ اولمپکس کا لازمی حصہ رہے۔

٭ قدیم اولمپک کے حوالے سے لاتعداد افسانوی حکایتیں محض شاعرانہ تخیل اور غلط عام ہیں۔ ان میں سے ایک اولمپکس کے لیے جنگ بندی کے نفاذ کے حوالے سے ہے۔ عام تاثر ہے کہ اولمپکس کے دوران تمام ریاستیں جنگ بندی کر دیا کرتی تھیں حالانکہ جنگ بندی صرف اس حد تک ہوتی تھی کہ کھلاڑیوں اور تماشائیوں کی اولمپیا تک رسائی اور واپسی ممکن ہو سکے۔ عملاً قدیم اولمپکس کبھی کسی جنگ کو روکنے کا باعث نہیں بنیں۔ ایک دفعہ تو اولمپکس کے انعقاد کے دوران ہی مخالف فوجوں نے چڑھائی کر دی اور کشتیوں کے مقابلوں کے دوران دیوتا کے مندر اور اسٹیڈیم کی چھت پر قبضہ کر لیا۔

ایک اور غلط فہمی قدیم اولمپکس میں کھلاڑیوں کے پروفیشنل نہ ہونے کے حوالے سے ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عظیم نامی ناز اولمپین کل وقتی پیشہ ور کھلاڑی تھے جو کھیلوں کے مختلف مقابلوں میں حصہ لے کر اپنے روزگار اور آمدنی کا اہتمام کرتے۔ یہاں ایک تاریخی غلط فہمی بھی طالب اصلاح ہے۔ قدیم یونانی فلسفے کی رو سے کھیلوں کا خمیر عسکری تربیت سے اٹھا ہے لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہومر کا بہترین باکسر ایک ناکام سپاہی ہے۔ اپنے عہد کے چند کامیاب ترین جرنیل مثلاً چوتھی صدی کے ایپامینونڈاس (Epaminondas) نے اپنے جوانوں کو ایتھلیٹکس سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ اگلی صدی میں فائلوپومین (Philopuemen) نامی جرنیل نے تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فوجیوں کے لیے ایتھلیٹکس کی تربیت پر پابندی لگا دی۔

٭ بیشتر قدیم و جدید تاریخ دان قدیم یونان کے ایتھلیٹکس سسٹم کو مثالی قرار دیتے ہیں "صحت مند جسم میں صحت مند دماغ" ایک مقبول عام محاورہ بن چکا ہے۔ چھوٹا معتبر مورخین نے ارسطو کو اولمپکس سمیت چاروں بڑے مقابلوں کا فاتح ہونے کا انتہائی مبالغہ آمیز دعویٰ ضرور کیا ہے لیکن اہل علم اسے تاریخی بدنیتی سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے۔

٭ قدیم یونان کے کھیلوں کے حوالے سے ایک بڑی دلچسپ علمی بحث نے جنم لیا۔ بالادستی جسمانی برتری کو حاصل ہونی چاہیے یا ذہنی صلاحیت کو؟ زینوفینز (Xenophanes) اس نظام اور کلچر پر ماتم کناں ہے جو جسمانی مضبوطی کو عقل پر فوقیت دیتا ہے۔ دراصل یہ حسد یا جلن اس حقیقت کی عکاس تھی کہ چار بڑے مقابلوں میں سے کسی ایک میں جیتنے والے ایتھلیٹ کو معاشرے میں بڑی عزت و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ انھیں ہمیشہ اہم نوعیت کے عوامی اجتماعات میں سب سے آگے کی نشستوں پر بٹھایا جاتا اور سرکاری خرچ پر تاحیات مفت طعام و قیام کا اہتمام کیا جاتا اور بیش قیمت نقد انعامات سے بھی نوازا جاتا جبکہ یونانی معاشرے میں فلسفی ایسے انعامات کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یوں بھی 'حسد میں بسانے کی مرغی

مجھے اُس دکھائی دیتی ہے۔"

☆جسم اور دماغ کی اس جنگ میں ارسطو کی سوچ یہ ہے کہ دماغ، روح اور جسم کا باہمی امتزاج ہی بہترین راستہ ہے۔ اس لیے وہ بچوں کے لیے جمناسٹک کی معتدل تربیت کا حامی ہے۔ اس کے بقول "غیر معمولی جسمانی تربیت انسان کو حیوان کی طرح وحشی بنا دیتی ہے جبکہ غیر معمولی سوچ بچار انسان کو غیر ضروری طور پر کمزور اور نرم بنا ڈالتا ہے۔" ارسطو تو آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہے کہ جسمانی اور ذہنی تربیت گویا ایک دوسرے کی دشمن ہیں اس لیے طالبعلموں کو ایک ہی سال میں جسمانی تربیت اور درسی تعلیم بیک وقت حاصل نہیں کرنی چاہیے۔

☆اولمپکس کی عظمت کو گہنانے میں رومی بادشاہ "نیرو" کا نمایاں کردار رہا۔ یہ وہی تاریخی کردار ہے جس کے حوالے سے محاورہ مشہور ہے "روم جلتا رہا اور نیرو چین کی بانسری بجاتا رہا۔" موصوف کو گھوڑوں کی دوڑ جیتنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ جائز ناجائز کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کی ایک انوکھی خواہش یہ تھی کہ وہ گھوڑوں کی دوڑ، یونانی ایتھنز کی چاروں گیمز ایک ہی سال میں جیتنے کا ریکارڈ قائم کریں۔ اس خواہش کی تکمیل کی خاطر اس نے ۶۷ء کو ۲۱۱ اولمپکس کو ۶۵ء میں ری شیڈول کرانے کے احکامات جاری کر دیے۔ گھوڑوں کی دوڑ کے دوران موصوف رتھ سے گر پڑا۔ بچارے جج کی کیا مجال تھی کہ اسے نااہل قرار دیتے کہ انھیں بہرحال زندہ سلامت گھر جانا تھا۔ سوائے فاتح قرار دے کر رشوت کے ہیرے جواہرات سے دامن بھر لیا کہ

کہاں کا خیر کیسی حرمت لفظ و معنی
میں دنیا میں ہوں اور اسباب دنیا چاہتا ہوں

☆اسی پر بس نہیں خوشامدیوں کے ہجوم میں گھرے نیرو کو یہ شدید غلط فہمی بھی لاحق تھی کہ وہ نہایت سریلے گائیک اور موسیقار ہیں چناں چہ کھیلوں میں موسیقی اور گائیکی کے مقابلے بھی شامل کیے گئے۔ موصوف انتہائی بےسرے اور پست آواز تھے لیکن جج کو اپنی جان عزیز تھی سو وہ اپنے عہد کے تان سین قرار پائے۔ غرض نیرو نے جی بھر کر اولمپکس کے تقدس کو مجروح کیا اور اسے "سرکس" بنا ڈالا۔ آخر کار قدرت کو رحم آ ہی گیا اور موصوف سال کے بعد قتل کر دیے گئے جس کے بعد آسمان نے رنگ بدلا اور نیرو کے جیتی اولمپکس کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔


روم کا شہنشاہ نیرو

☆یوں تو اولمپکس کا بتدریج زوال رومیوں کے ہاتھوں یونان کی فتح سے شروع ہو چکا تھا۔ ۱۴۸ ق م سے وہ بتدریج اپنا روایتی جاہ و جلال و عظمت رفتہ کھو رہے تھے۔ زوال کے محرکات میں اولمپکس کی حقیقی روح کے بجائے ہر قیمت پر جیت کے پجاری پروفیشنلز، رومیوں کی ان کھیلوں میں اپنی برتری ثابت کرنے کی فطری خواہش نمایاں تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ کھیل بہت سے دیوتاؤں کے احترام میں منعقد کیے جاتے تھے جبکہ عیسائیت میں خدائے واحد کا تصور رائج تھا اس لیے کٹر عیسائی بادشاہ تھیوڈوسس اول نے

۳۹۲ء میں یہ کھیل ختم کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ یوں ہزار سال سے زائد عرصے تک جاری رہنے والے اولمپکس اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

☆☆

قدیم اولمپک کھیل کا طلسم ہوش ربا میرا اور مربی بریگیڈیئر عارف صدیقی کا مشترکہ جنون اور خبط ہے۔ ہم گھنٹوں لگ بھگ تین ہزار سال قبل یونان کے جزیرہ نما میں اولمپیا کے مقام سے ۷۷۶ ق م میں شروع ہونے والے اولمپک کھیلوں کے سحر میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کھیلوں کی دلچسپ روداد مشہور شاعر وان پنڈر، ہومر اور ایگر کے ذریعے ہم تک پہنچی جس کا مطالعہ دراصل انسانی ارتقا کی کہانی ہے۔ شفیق، ٹھنڈے، نفیس مرنجان مرنج بریگیڈیئر عارف اس عقیدے کے آدمی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ علم واحد دولت ہے جو تقسیم کرنے سے گھٹتی نہیں بڑھتی ہے۔ بہر حال گزشتہ روز اسی روایت کی پیروی میں بریگیڈیئر موصوف کی عطیہ کردہ انگریزی کتاب "اولمپک کھیلوں کی مختصر تاریخ" جس کے مصنف ڈیوڈ ینگ ہیں، اتوار کو چھٹی والے دن چھاجوں برستی بارش کے رومانی موسم میں لذیذ مرغن برنچ اور گرم لحاف میں دبک کر اس تخلیقی کاوش کے مطالعہ نے وہ لطف دیا کہ ہر سطر پر مہربان دوستی کے لیے دل سے بے اختیار سلامتی اور خیر کی دعا نکلی۔ جی چاہا کتاب کے دلچسپ انکشافات اور اپنی یادداشت سے پرلطف سفر کی لذت میں قارئین بالخصوص نوجوانوں کو بھی یوں لت پت کیا جائے جیسے گلاب جامن شیرے میں! کارلائل نے کہا تھا "بڑا آدمی آسمان سے گرنے والی بجلی کی طرح ہوتا ہے عام آدمی تو ایندھن ہے جو اس بجلی کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ اس کی بدولت وہ بھی آگ پکڑ لے۔" کاش پاکستانی نوجوانوں میں بھی کچھ کر گزرنے کی چنگاری سلگ جائے کہ تازہ خون کی آمیزش کے بغیر زوال لازم ہو جاتا ہے کہ شکار مردہ سزاوار شہباز نہیں۔ اقبال کے بقول.....

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

☆ آپ ﷺ نے مرغ کو گالی دینے سے منع فرمایا کیونکہ وہ مسلمانوں کو نماز کے لیے بیدار کرتا ہے۔

☆ آپ ﷺ (پانی یا دودھ) پیتے وقت تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

☆ آپ ﷺ نے فرمایا، دو مسلمان جس وقت آپس میں ملتے اور مصافحہ کرتے ہیں، جدا ہونے سے پیشتر انھیں بخش دیا جاتا ہے۔

☆ شیطان اس کھانے کو حلال سمجھتا ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔

☆ جو نجومی کے پاس گیا، اور اس سے کوئی سوال پوچھا، اس کی چالیس دن رات کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔

☆ اللہ تعالیٰ غیرت مند ہے اور مومن بھی! اس لیے اللہ کی عزت کا تقاضا یہ ہے کہ مومن حرام کام نہ کرے۔

☆ جو عورت خاوند سے بغیر کسی وجہ سے طلاق چاہتی، اس پر جنت حرام ہے۔

(محمد انور، والٹن، لاہور)

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

بچپن میں ہم یار دوست عمرو عیار کی زنبیل، علی بابا اور مرجینا، رستم و سہراب کی الف لیلوی داستانوں کے تصوراتی سحر کدے میں کھوئے رہتے۔ قدیم اولمپکس اور ان میں اپنے غیر معمولی کارناموں اور کارکردگی سے تماشائیوں کو مبہوت کر دینے والے ایتھلیٹ، پہلوان اور سپارٹا کے جنگجو میری پہلی محبت ہوا کرتے۔ اپنے ۳۲ سالہ اسپورٹس کیریئر کے دوران

جہاں مجھے ۲۸ ممالک میں پاکستان کی نمائندگی، جدید اولمپکس، ومبلڈن ٹینس، ٹور ڈی فرانس سائیکل ریس، پیرس ڈیکار کار ریلی، برٹش اوپن اسکواش، کامن ویلتھ گیمز، ایشیائی کھیلوں اور فٹبال ورلڈ کپ جیسے معتبر ایونٹس کے ذاتی مشاہدے اور ٹیلی ویژن پر ۳۵ کھیلوں کی کمنٹری کرنے کا موقع ملا لیکن ان مصروفیات کی کشش نے قدیم اولمپکس سے لیے میری جستجو اور ذوق کو کبھی مدہم نہیں پڑنے دیا بلکہ ان میں مہمیز لگانے کا باعث بنیں۔

"انسانی تاریخ میں کسی چیز نے مجھے اولمپیا سے زیادہ سوچنے پر مجبور نہیں کیا۔ میری وصیت ہے کہ مرنے کے بعد میرا دل نکال کر اولمپیا میں دفن کیا جائے۔"

کتاب کے مصنف ڈیوڈ سی ینگ نے ماہر ہدایت کار کی طرح آغاز میں کمال مہارت سے ایسے اچھوتے اور انوکھے خیال کو متعارف کروایا ہے جو آگے چل کر قاری کو یوں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ رات ایک ہی نشست میں اس کا مطالعہ کیے بنا نہیں چھوڑتی۔

یہاں ذرا ایک مختلف بحث۔۔۔ تعلق بالخصوص دوڑوں کا پس منظر اور ذوق رکھنے والے قارئین بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ ایک کھلاڑی کو دوڑ کی تیاری کے لیے کن جسمانی اور ذہنی مراحل سے گزرنا پڑتا اور اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ کتنے سال تپتی دوپہروں اور سردی سے کانپتی صبحوں اور درد سے کراہتی راتوں میں وہ کیا سوچتے ہیں۔ تنہا جنگلوں، پہاڑوں، میدانوں اور ریگستانوں میں دوڑتے ہوئے وہ کیا محسوس کرتے ہیں۔ ان سوالوں کا احاطہ Lonliness of distance running نامی کتاب میں اس کمال مہارت سے کیا گیا ہے کہ کھلاڑی کی اندرونی کیفیت کا اندازہ پڑھنے والے کے دلوں کی دھڑکنوں سے اس حد تک ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے کہ دوڑنے والوں کے اعضا میں اٹھنے والے درد کی لہریں تماشائیوں کو اپنے اندر اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔

اب ذرا اس معاملے پر دوڑاک کے ساتھ کوہ پیماؤں کا نکتہ نظر جانتے ہیں۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والے سب سے پہلے دو کوہ پیماؤں ایڈمنڈ ہیلری اور نورگے شرپا نے اپنی اس شاندار کامیابی کا ذکر بالکل مختلف انداز میں کیا۔ نیوزی لینڈ کے ایڈمنڈ نے کہا "ہم نے ایورسٹ کو فتح کر لیا" جبکہ نورگے شرپا نے کہا "میں اور پہاڑ اکٹھے بلندیوں تک پہنچے۔" زیادہ تر دوڑنے والے کھلاڑی اپنے جسموں کو اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح ہیلری نے ایورسٹ کو دیکھا۔

انسان کس طرح اپنی محرومیوں اور کمزوریوں کو اپنی طاقت میں ڈھال سکتا ہے۔ لگے ہاتھوں اس حوالے سے یہ یادگار واقعہ بھی سنتے جائیے۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے تین مرتبہ عالمی باکسنگ چیمپئن محمد علی کو سیف گیمز اسلام آباد میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے دعوت دی تو میں ان کا افسر مہمانداری مقرر ہوا۔ کئی روز ان کی قربت میں گزارنے کا موقع ملا۔ ایک روز کار میں دامنِ کوہ کی سیر کے دوران موقع غنیمت جان کر ان کی حریف باکسر کے خلاف بے پناہ خود اعتمادی کے بارے میں پوچھ لیا۔ بولے: "بچپن بڑی غربت میں گزرا۔ میں نے کئی دو پیسے جوڑ کر سیکنڈ ہینڈ سائیکل خریدی جس پر روزانہ جم ورزش کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک روز جم سے نکلا تو دیکھا ایک تنومند غنڈہ سائیکل چرا کر لے جا رہا ہے۔ قریب کھڑے پولیس والے سے گھبرا کر شکایت کی تو وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر بولا 'ہاتھوں میں جان ہے تو اسے روک لو۔' اس دن کے بعد میں جب بھی باکسنگ کے رنگ میں اترتا ہوں مجھے یقین ہوتا ہے میرا سائیکل اسی حریف نے چرایا تھا۔"

حفاظت

دینِ رحمت کی اعلیٰ ترین انسانی اقدار کے بطن سے پھوٹنے والا ایک ناقابلِ فراموش قصہ

نجمہ ثاقب

نارو ذات کا ہریجن، پیشے کا چمار، ایک پاؤں سے لنگڑا اور آنکھوں کا کچھ بھینگا تھا۔ جب ہندوستان میں بڑی بیماری موذی وبا کی طرح پھیلی، تو وہ بچپنے کی دہلیز پر تھا۔ چیچک نے چہرے پہ جگہ جگہ گہرے گڑھے سے چھوڑ دیے اور سیاہ رنگی جلد کو انچ انچ کے فاصلے سے مسکا کے رکھ دیا۔

چمار تھا، لہٰذا گھر میں داخلہ منع تھا۔ صبح تڑکے خیالی سی "ٹہلی" گندے بھرے ڈیوڑھیوں میں آتا جاتا دکھائی دیتا۔ کھڑے سے کانوں غسل خانوں اور کوڑا دانوں میں سے گند سمیٹتے کن انکھیوں سے ماحول کو آنکتا رہتا۔ کبھی قسمت سے اندرونِ خانہ کسی قصے کی بھنک یا کہانی کی چاپ بھی کان میں آپڑتی۔ تب آسمان پہ تھگلی لگاتا اور جھوٹ سچ یوں ملا جلا کے یکجان کر دیتا جیسے آٹے میں پانی ڈال کر اسے مسوس دیا جاتا ہے۔ اہلِ خانہ دانتوں میں انگلیاں داب کے رہ جاتے اور بات ہوا ہو جاتی۔

باپو جی (گاندھی) نے کھدر پہننا شروع کیا، تو ایک دن کہیں سے ویسی کھدر کا کرتا اڑا لایا۔ شام کو تہبند باندھ، مسلمانوں کی طرح آنکھوں میں سلائی بھر سرمہ ڈال کے لنگڑاتا باہر نکلا تو چونی لال نے چوک پہ دھر لیا۔

"اوئے چوہڑا ہو کے وشنوؤں سی ادائیں دکھاتا ہے۔ تجھے یہاں تہمد کھینچنے کس نے دیا؟ دھوتی کس کے باندھ لے، تیرا دھوبی پیدا ہونے والا ہے۔"

"اوئے پرتاپے۔" اس نے پھر پہلو میں کھڑے پرتاپ سنگھ



کی طرف آنکھ میچتے ہوئے بڑھک ماری۔ ''مہاراج کی سیوا کرو۔''

پرتاپ نے جھٹ کرپان نکال لی۔ نارو اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہڑ بڑا کے تخت پوش سے پیچھے ہٹا، تو کھلی بدرو میں غڑاپ سے گر پڑا۔ بچے بالے اکٹھے ہوئے تالیاں پیٹنے لگے۔ گرتا پڑتا اٹھا، تو کالے کیچڑ کا بھوت بنا ہوا تھا۔ مہاشے نے اپنے جن کے پیچھے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور بولا:

''تو ہزاروں نے بھی آزادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں۔ اب تو راج سرکار جاوے ہی جاوے۔''

لڑکے نعرے لگانے لگے:

''انقلاب۔ زندہ باد۔

سوراج۔ زندہ باد۔''

اس شور ہنگامے میں نارو سنک لیا اور گھر جا کے گرتا ابھرا۔ ہمیشہ کے لیے خودی کی دیوار پہ ڈال دیا۔ کبھی کبھی دل میں ہولا سا اٹھتا، تو حسرت سے اُسے ایک دوسری بار جھٹک جھٹک کے تکتا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ جاتا:

''پنڈت مہاشے کی مرضی ہوتی، تو کسی 'باہمن' کے گھر میں بھی جنم لے سکتا تھا۔ چمار نہ ہوتا، تو من چاہے کپڑے بدن پہ ڈالتا۔ یہ زمین بس شکل کا نیڑھا نہیں ہوتا، تو یہ چھپر یا کچی عورت کی جنسی سے مختلف۔ پرو دیوتاؤں کی دیوتا ہی جانیں۔ گندے ننگے کو سنسار کے قدموں میں کپڑا اپنانا تھا، تو بسا لڈ جمہ ہے وجود میں دل کا ٹوکھڑا کس کا راز بتلایا؟''

ایک دفعہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے اس نے امام صاحب کا وعظ سنا، تو دل میں مسلمان ہونے کی ٹھانی۔ نیچے اترتے اور آخری سیڑھی تک پہنچتے اس نے تصور میں خود کو اجلے کپڑے پہنے، سر پہ دو پلی ٹوپی، ناک پہ تہ دار رومال جمائے برات کا دولہا بنے دیکھا۔ آگے آگے باجے والے، پیچھے دولہا کے سنگی ساتھی اور جلو میں دولہا۔ ساتھ وہ سارے میاں صاحبان جن کے گھر وہ دوپہر کو باقاعدگی سے حاضری دیتا تھا۔ سب سے پیچھے کنبے برادری کے لوگ۔ مگر اس کے کھوٹی دار بہرے نے شیخ جلی کی نوکری ایک ہی ہلّے میں پیچھے گرا دی جب شام کو نارو نے بے لفظوں میں اپنے ارادوں کی بھنک اس کے کان میں ڈالی۔

''کیا جب (غضب) کرے ہے نارو۔ جن نجت وارول کا گو موت تو دن رات سمیٹے ہے، وہ تجھے اپنے ساتھ برج نہیں بٹھاوت ہیں۔ یہ ساری ونج (وعظ) کی باتیں ہیں۔ سب جانت ہیں، تو چمار ہے۔ تجھے کٹھیا پہ کوئی ساتھ نہیں بٹھاوت ہے، عورت کون دے گا؟''

نارو کے خواب تھوڑی دیر میں کرچی کرچی ہو گئے۔ اس نے گاندھی جی اور مسلمانوں کے گھروں کا کوئی ایسا قصہ سوچنے لگا جس میں خیال کی چسکیلی کر دینگا کے محفل کو رنگین بنا سکے۔ مسجد کی جانب سے بھی اس نے گزرنا چھوڑ دیا۔ شام کو فراغت پا کر سرج بابو کے تھڑے پہ بیٹھنے لگا۔ سرج بابو کی بیٹی، کملا کالج میں پڑھتی تھی۔ سرو قد، کھلتی رنگت اور ملیح چہرے کی مالک کنیا اپنے چلبلے پن کے باعث ہم پلہ گھرانوں میں بے حد مقبول تھی۔ شام کو اکثر اپنے ہاں سہیلیوں کی محفل جماتی، تو نارو کو مکان کی پچھلی جانب بن پھلواڑی میں بلا لیتی۔

نارو لمبے ڈنڈے کے سرے پہ بندھے جھاڑو سے خشک پتے سمیٹتا۔ مالی کے کاٹے گرائے جھاڑ جھنکاڑ اٹھاتا اور کوڑے کی ٹوکری باہر کھلی جگہ پہ خالی کر کے دوبارہ تھڑے پہ آ بیٹھتا۔

کملا پتل میں گرم پوریاں کبھی حلوے کبھی ترکاری کے ساتھ بھجواتی۔ کبھی کبھی اسے اندر ہی بٹھا لیتی۔ وہ کسی بنچ پہ چوکڑی مارے جو حیران کرتے کن انکھیوں سے دیویوں کو جھانکتا رہتا۔ اس کی ترچھی نگاہوں کے باعث انھیں مطلق علم نہ ہوتا کہ وہ انھیں تاڑ رہا ہے۔ اگر ذرہ برابر شک ہوتا، تو وہ اسے بے ضرر سمجھ کے جانے دیتیں۔ اور نارو ان کے مدھر چہروں پہ کہانیوں کی شہ سرخیاں جماتے اٹھ جاتا۔

رات کو اپنی کوٹھڑی پہ کروٹ بدلتے وہ ہر پہ سے ایک ایک کہانی کہتا۔ ''کملا دیوی مانو شب برات کا پٹاخہ ہے۔ وقفے وقفے سے چھوٹتی ہے، تو چٹاخ چٹاخ چھوٹتی ہے۔ اور وہ وکیل صاحب کی

لڑکی ثریا... اس سے بچ کر جانو۔ پٹاخے کے ساتھ چھلجھڑی، جیسے جیسے چنگاریاں چھوڑتی ہے۔ ساری محفل کو بستی کا بھیارہ بنائے رکھتی ہے اور کبھی من کے خوریوں ہو جاتی ہے جیسے مٹی کی مورت!

"اور پنڈت نارائن کی "پشپا" ایسی اجلی جیسے گنگا جل کا پوتر پانی۔ ہاتھ لگے نے میلی ہووے۔ ستی ساوتری بن پھرتی ہے، پر گانٹھ کی پوری ہے۔ دیکھنا کسی روز اڑنچھو ہو جائے گی، اور پنڈت ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"اے نارو!" ہریا اپنی کروٹ لیٹے لیٹے بولتا "تو تو شاعر ہو گیا ہے بے۔"

نارو کہتا۔ "تو دیکھے گا، تو تو بھی شاعر ہو جائے گا بے۔"

"ناں۔ ناں۔" ہریے نے دونوں ہاتھ سیدھے اوپر کو اٹھا لیے۔ "چمار کو چماری رہنے دے۔ سالے لعلوں کے خواب نہ دکھا۔"

غالباً چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نارو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پہ جھاڑو دے رہا تھا۔ یہ کوچہ بر سینے کے حصے میں تھا مگر وہ کل شام سے بخار میں پڑا ہوا تھا۔

اب اس کے حصے کا کام نارو ہی کر رہا تھا۔

سیڑھیاں گویا جنگل میں منگل تھیں۔ خوانچہ فروشوں سے لے کر نگے قسمت کا حال بتانے والوں تک، سب نے سیڑھیوں پہ اپنی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ پھل سبزی والے الگ ٹکڑی جمائے بیٹھے تھے۔

وہ جھاڑو کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ بند کیے ایک جانب سے نکالتا، تو دوسری جانب پھنس جاتا۔ چوڑی والے کی ٹوکری کو جھاڑو کی زد سے بچاتے ہوئے، وہ ذرا بھر پیچھے کھسکا تو سیڑھی کی حد ختم ہو گئی۔ وہ پلٹنیے امرود کی طرح لیٹے ڈھلک کے نیچے آیا کہ کسی کا پاؤں غلطی سے بھی اس پہ پڑتا، تو بے چارا کچلا جاتا۔

"ارے، ارے۔ لینا پکڑنا" کی آوازیں اس کے ارد گرد ابھریں۔ پھر دو ہاتھوں نے اسے سہارا دے کے کھڑا کر دیا۔

"بھئی چوٹ تو نہیں آئی۔"

نارو کی دونوں آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

سفید براق اچکن اور گول شیشوں کے سنہرے فریم والی عینک لگائے جس نے اسے تھام لیا، کیا وہ کوئی بھگت مہاراج تھا؟

بچھو کا نے بیل کی طرح بدک کر، وہ پیچھے ہٹا اور اپنے وجود کو ایک ہی جھٹکے میں اجنبی ہاتھوں سے آزاد کر دیا۔

"چمار ہوں جی، ذات کا ہریجن۔"

جسم کے ساتھ اس کی آواز بھی کانپی اور پھٹ سی گئی۔

"تو کیا ہوا بھیا؟ اللہ کی مخلوق تو ہو۔"

انھوں نے جھک کر اس کا جھاڑو اٹھایا۔

"ارے۔ ارے۔" نارو نے لپک کر چھین لیا۔

"تمھیں چوٹ آئی ہے۔ چلو یہاں قریب ہی قاضی کے کوچے میں حکیم عبداللہ ہوتے ہیں۔ ان کے مطب پہ لیے چلتا ہوں۔"

"ناں۔ ناں۔" نارو نے دونوں ہاتھ ماتھے پہ لے جا کے جوڑ دیے۔ "رہنے دیں جی، چلتا ہوں۔ آپ کی بڑی اچھا ہوئی۔"

اس نے لنگڑی ٹانگ کو بدقت گھسیٹنا چاہا اور شرمندہ شرمندہ سا مخاطب کا ہاتھ چھونے سے بچاتے ہوئے جھاڑو تھامے چلنے کو پر تولنے لگا۔

"تکلف چھوڑو بھیا۔ تمھارا ٹخنا زخمی ہے۔ حکیم صاحب کی ایک ہی پڑیا درد رفع کر دے گی۔"

مگر نارو نے سنی ان سنی کر دی اور رخ پھیر کے یوں بھاگا جیسے لمبی قید سے چھوٹا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت وہ ظاہر سے زیادہ معنی کی چوٹ سے چور چور ہوا پڑا تھا۔

کھولی میں آ کے ڈھے سا گیا۔ بار بار بدن کو چھوتا۔ کپڑوں کو تکتا۔ ہاتھوں کو آنکھیں کھول کھول کر تکتا رہا۔ کیسے میلے کچیلے اور غلیظ ہوئے پڑے ہیں۔ انگلیوں کی گرہوں میں میل کی تہیں جمی دیکھ کے اس کا دل پہلی مرتبہ متلایا۔ اس نے انھیں ران پہ رگڑ رگڑ کے دیکھا مگر وہ بدستور جمی رہیں اور بدقت تھوڑی بہت ہی اتر سکیں۔ شام تک ٹخنا پھول کے کپا ہو گیا اور دھیمے دھیمے بخار

سے جسم لو دینے لگا۔ اگلا پورا ہفتہ وہ بستر پہ رہا۔ ہریا ہی اسے روٹی پانی دے دیتا۔ اس نے پوست کے ڈوڈے کا زخم پہ باندھے اور صبح شام اس پہ ٹکور کرتا رہا۔

جس روز زخم قدرے خشک ہوا اور کھرنڈ پنڈا چھوڑنے لگا، تو شہر میں ہندو مسلم فساد کی پہلی لہر اٹھی۔ نارو نے گھڑی دو گھڑی قدموں کو زمین پہ جما کے دیکھا۔ پھر "بابو جی" کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

"ہے ہے کدھر جا رہا ہے بھیا؟ قدم کی ٹھوکھ پہ جما کو ند آنے دینا، ورنہ کھرنڈ نرم ہو جائے گا۔" ہریا اس کے پیچھے لپکا۔

نارو نے جسم کا سارا زور چوٹی سرے والے انگوٹھے پہ ڈالا اور بولا "ذرا کملا جی تک جاتا ہوں۔ آج کل میں ان کے ہاں سال کا آخر ہے۔ کیا سوچتی ہوگی دیوی کہ مرا کہاں چلا گیا۔ جانے کو دو دو ہاتھ اور کام پڑنے پہ منہ چھپا کے بیٹھ گیا۔"

"چپکے ہو نارو!" ہریا بارہ بولا۔ "باہر نکلنے کو دم نہیں اور کھڑے ہو گئے۔ ارے گلی گلی میں کتنا چھنتی ہو رہی ہے۔ صبح کو نکلا تھا، پھر چڑھتے واپس بھی آ گیا۔ لال قلعے کے چوک پہ آگ لگی ہے۔ جوہری بجار کی طرف نکلا، تو مہاشوں نے وہاں لوٹ مچا رکھی تھی۔ مشکل سے راستہ بنا کر نکلا ہوں۔"

"تو پھر تمہارے بریے، نہ ہندو نہ مسلمان۔ بھیڑ کے بیچ سے نکل جائے۔ تجھے کسی نے کیا کہنا تھا؟ اب گندگی کھر دل میں پڑا سڑا ندے گا، تو خلقت تجھے کوسے گی۔"

"خون کی سڑاندر کے لی، تو گند کو راستے لگاتا اور جو لاشوں کو کفن (کفن) نہ ملا، اور وہ پڑے پڑے گودسینے لگیں تو....؟"

"ہے، کیا واقعی ایسی بپتا آن پڑی۔ چلو ذرا چل کے دیکھوں تو....." وہ لاٹھی ٹیکتا باہر کو بڑھا۔

پیچھے ہریا کو ستارہ گیا: "نہ جاؤ نارو۔ بڑی سڑک سے قاضی کے کوچے تک لاٹھیاں چل رہی ہیں۔ تیرا پاؤں زمیں پر ٹھہرتا نہیں، کہیں لڑھک گیا، تو ہمیشہ کو وہیں پڑا رہے گا۔"

مگر نارو نے سنی ان سنی کر دی۔

بستی میں معمول کی چلت پھرت تھی۔ عورتیں جھونپڑیوں کی جھونپڑیوں کے سامنے دو، دو، تین تین کی ٹولیوں میں بیٹھی ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں نکال رہی تھیں۔ بچے کھلی نالیوں کے چوڑے پاٹوں میں اندھا دھند چھڑیاں چلاتے تھے۔ ایک آدھ جوان لڑکی ٹاٹ کے لٹکے پردوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

نارو ایک ٹانگ پہ پھدکتا ان کے درمیان سے گزرتا داہنی طرف کو نکلتی شاہراہ پہ ہو لیا۔ اس نے پھر بڑی سڑک کے بغلچے میں سرج بابو کے مکان کے عین سامنے جا نکلنے کی ٹھانی۔ داہنی سڑک تک تو خیر رہی۔ خاموشی اور سناٹا البتہ اجنبی ضرور تھا۔ مگر ہریے کی زبانی سنی کہانی گپ معلوم ہوئی۔ مگر جونہی بڑی سڑک کا چوراہا دور سے دکھائی دیا، لوگوں کے شنشناہٹ اور شور کے کانوں میں پڑنے سے پہلے فضا میں جلنے کی بو نارو کے نتھنوں سے بری طرح ٹکرائی۔

تجسس کی مارے مجبور ہو کر وہ اپنا بنایا راستہ چھوڑ ادھر کو ہو لیا۔ قریب جانے پہ پتا چلا کہ کسی مسلمان تاجر کی سامان سے بھری "جیلی" ہاتھ لگی ہے۔ اب یار لوگ بیچ شاہراہ اس کی چتا جلائے دل پشوری کر رہے ہیں۔

"اجی آگ تگی سو راکھ ہوئی، تیرے میرے ہاتھ کیا آیا۔" ایک مہاشا جی اپنے ساتھ کھڑے شخص سے کہہ رہے تھے۔ "پیسا ترمال تھا۔ دو چار ہاتھوں میں تھما دیتے تو کسی کا پھاندہ ہو جاتا۔"

قریب ہی سجاشی مندر کے وید جی کھڑے تھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کی لوؤں کو چھوا اور بولے "یہ رشیوں کا راستہ نہیں کھلا پاکھنڈ ہے۔ ستیہ گرہی اور اہنسا کا بلیدان سمجھو۔ سرکاری گماشتوں کا طبقہ بک رہا ہے اور عام آدمی اس پہ تماشہ دکھا رہا ہے۔"

"اجی جانے دیجیے۔" انہی صاحب نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "گلی گلی میں لوٹ پڑی ہے۔ مصری شاہ کے پل پہ کل رات محرم کا جلوس نکلا۔ پانڈوؤں کے جتھے دار پہلے سے تاک

میں بیٹھے تھے۔ جلوس میں آگے آگے شمشیں تھیں۔ پیچھے پیچھے بلموں کے سائے میں ایسی لاٹھیاں چلیں کہ مسلے قاسم کی مہندی میں رنگ کے رہ گئے۔ اب ہٹی سے بازار تک زمین خون اور گوشت کے قتلوں سے لتھڑی پڑی ہے۔"

"یہ پنش بھگتی نہیں ہے بھیا، پھساد ہے پھساد۔ اور پھساد سے شکتی نہیں ملتی، صرف ماس کی بتیا ہوتی ہے۔"

ویدجی کی آواز اونچی ہوئی، تو ہجوم میں سے ڈیک "ڈ" کا ماچا کانچا نکلا۔ ان کے منہ در منہ کھڑا ہو کے اس تیزی سے بولا کہ جوش کی شدت اور اندر کی تحلیل سے تھوک باچھوں سے اڑنے لگی:

"اپنے کو تیسا ہے مہاراج۔ ادھر پنڈی شہر میں ان مسلوں نے جہاد کے نام پہ اچاریوں کا شمشان گھاٹ بنایا ہے۔ بچیلوں کے گھر وہیں تو جلا کر کوئلہ بنا دیا۔ ہماری عورتوں کو مار ڈالا۔ یہ جہاد ہے یا پھساد؟ ہم نے اکبر (اکبراعظم) کو بیٹیاں ضرور دی تھیں، مگر مہابھارت کی عزت تو کیہنے کی پھلی نہیں بنایا کہ جس کا جی چاہے، چھنکا اتار کے رکھ دے۔ اب تو ادھر کوئی اللہ اکبر کا نعرہ بھی لگانے گا، تو اسے اپنے ہی لہو سے وضو کرنا پڑے گا۔"

مجمع تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا:

"ہر ہر مہادیو

جے رام

بندے ماترم، بندے ماترم"

ہجوم پھر آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ ویدجی کانوں کو تھامے اپنی جگہ کھڑے اشلوک پڑھتے رہے۔ انسانوں کی بہتی گنگا میں کسی نے اچانک نارو کا بازو پکڑ کے آگے کو دھکیلا اور بولا "چل بے چمار، تو بھی آج من کی پوری کر لے۔ اگلا محلہ لوٹنے چلے ہیں۔ سامان تو بیا سارا اٹھا چکے۔ اب لڑکیاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ ہر شو ٹھیرا ایک اسٹیل سیدزادی اٹھا کے لایا ہے۔ تو بھی کوئی ہاتھ پاؤں مار اور روٹی کی گھر میں ڈال لے۔"

نارو نے سوچا، کملا ویدی کے ہاں کیا رکھا ہے۔ پھساد کے کارن منگنی بھی نہ جی ہو گی۔ پھر وہاں خالی "وتھ" کے سوا ہے ہی کیا؟ چل بے چمار، آج لمبا ہاتھ مار لے۔ اور وہ سانپ کی طرح رینگتے مجمع کے پیچھے لڑھکنے لگا۔

میاں کے کنوٹ میں سرداروں نے مسلمان جوانوں کا جھٹکا کیا تھا۔ اب وہ بلموں سے لاشوں کو دھکیل دھکیل کر راستہ صاف کر رہے تھے۔ گلی میں داخل ہوئے، تو کئی لڑکے لہو سے پھسل کر زمین پہ آ رہے۔ ان کی پگڑیاں کھل گئیں اور کیس لہرانے لگے۔ کپڑوں پہ لہو نے رنگ چھوڑ دیا۔

نارو اپنی لاٹھی پہ اٹک کے رہ گیا۔ نہ پیچھے ہٹنے کو جی چاہتا تھا، نہ آگے چلنے کی ہمت تھی۔ جب گرتے اٹھتے سب آگے نکل گئے، اور پیچھے کوئی آیا، وہ اکیلا آدمی رہ گیا، تو اس نے خوب جمیان سے لاٹھی زمین پہ جمائی اور ایک مکان چھوڑ اگلے میں گھس گیا۔

باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ دہلیز کے بیچوں بیچ ایک جوان اوندھا پڑا تھا۔ اس کی پشت پہ خنجر گھونپے کا نشان تھا۔ گرد اگرد لہو نے بالے کے پھول کاڑھ رکھے تھے۔

نارو نے لنگڑی ٹانگ پہ پھدک کر لاش پھلانگی اور پیچھے مڑ کے دیکھا۔ گلی خالی تھی۔ آخری اکالی بھی آگے نکل گیا تھا۔ البتہ ان کے نعروں کی آوازیں گلی میں بازگشت بن کے گونج رہی تھیں۔

سامنے ہی دیوان خانہ تھا۔ نارو خون کی لکیروں سے پاؤں بچاتا اسی جانب بڑھا۔ دروازے کے قریب ایک اور آدم زاد بچھوڑی ہڈی کی طرح مڑا تڑا پڑا تھا۔ نارو کو مایوسی ہوئی۔

اس نے اونچی چوکھٹ والے دالان میں جھانکا۔ پھر بڑبڑایا "یہاں تو اٹھا کے لے جانے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ چچ چچ....." وہ خود ہی اپنے پہ ترس کھانے لگا۔ "تیری قسمت کے اندھیرے آج بھی تیرے ساتھ ہیں نارو۔ آج کے دن، تو بورئیے والے بھی راجے بنے پھرتے ہیں، پر تو خالی کا خالی رہا۔"

اسی لمحے اس کی آنکھوں میں کوندا سا پڑا، مانو سوکھے دھانوں پہ بارش کا پہلا قطرہ ٹپکا۔ چارپائیوں کی اوٹ میں وہ سہمی کھڑی تھی۔ اس کی رنگین اوڑھنی میں ادھ چھپے چہرے پہ گڑی دو آنکھوں میں خوفزدہ ہرنی کی سی وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ

چھری دھری سل کی طرح ساعت اسے تکے جا رہی تھی۔

نارو سرمستی کے عالم میں آگے بڑھا، تو وہ دو قدم پیچھے سرک کے دیوار سے لگ گئی اور اس کے چہرے سے اڑتی سرک کر بیٹھ گئی۔

ارے یہ تو ثریا دیوی ہے! نارو نے آنکھیں میچیں، کھولیں، پھر سکیڑیں، پھر کھولیں۔ پتلیاں سے ساتھ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں، جیسے دھیمے دھیمے چنگاریاں چھوڑ رہی ہوں۔

نارو کا دل شوق کا جہان بن گیا اور من آپوں آپ تھر کنے لگا۔ اس نے اپنے میلے اور چیچک زدہ چہرے پہ غلیظ ناخنوں والی انگلیاں پھیریں اور بھونڈی آواز میں چہکا:

"گوری چھپڑ سے توں نہا کے نکلی......"

ثریا کا چہرہ میدے کے چولہے کی طرح سفید پڑ گیا۔

"دیوی جی نمستکار۔" اس نے انگلی سے ماتھے کو دوبارہ چھوا اور دو قدم مزید آگے بڑھا۔ سوچ رہا تھا، اب تو کسی چھین جھپٹ میں بھی اپنا حصہ کسی کو نہ دوں گا۔ جھوٹوں کی مرپانے میری کھولی بھی چاندی کی ٹکڑی بن جائے گی۔

وہ ثریا کو تکتا مزید آگے بڑھا اور ایک ٹھوکر کھا کے گر گیا۔

"بھت تیری...." اس نے گندی گالی دی۔

ٹھوکر نے نیز ھے رش پہ پڑی لاش کو سیدھا کر دیا اور نارو کے ہاتھوں سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ ایک دم نیچے بیٹھا اور بیٹھتا ہی چلا گیا۔

سفید براق اچکن جس پر لہو کا لال کشیدہ تھا۔ گردن اور کندھوں کے درمیان پھنسا گول شیشوں کی عینک کا سنہرا فریم جس کے شیشے غائب تھے۔ دو مہربان ہاتھوں نے نارو کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ تھام لیا۔

"بھگت مہاراج جی؟"

یک بیک نارو کے چہرے پہ سارے شہر کی لوٹ آن پہنچی۔ اس نے خوب نظر ٹکا کے دو لمبے وکیل صاحب کے چہرے کی

ماہر چشم کا مشورہ

ایک رسالے کے مدیر آنکھوں کی شکایت لے کر ماہر چشم کے ہاں پہنچے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ معائنے کے بعد نیا چشمہ تجویز کر دے گا۔ لیکن وہ یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ ان کی آنکھوں کو چشمے نہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مدیر نے اس مشورے پر عمل درآمد کو ناممکن قرار دیا کیونکہ وہ صبح سے شام تک لکھنے پڑھنے کے کام میں لگا رہتا تھا۔ اس پر ماہر چشم نے پوچھا کہ وہ رہتے کہاں ہیں؟

جب انھوں نے بتایا کہ وہ شہر کے آخری سرے پر واقع بستی میں رہتے ہیں، تو اس نے کہا "ٹھیک ہے اپنے گھر جائیے۔ اسی طرح کام کرتے رہیے۔ لیکن ہر گھنٹے کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہاں سے نظر آنے والے دور واقع پہاڑوں کا نظارہ کیجیے۔ دور کی اس نظارہ بینی سے آپ کی تھکی ہوئی آنکھیں تازہ دم ہو جائیں گی۔"

غور کیجیے تو ہر چھٹی ہمیں یہی دعوت دیتی ہے کہ فرصت کے ان لمحات میں دور اندیشی اور دور بینی سے کام لو، آرام کرو اور اپنی روح کو توانا اور سرشار کر لو۔ کاغذ اور اسکرین سے نظر ہٹاؤ، اپنے اندر گونجتے سناٹوں کی خبر لو اور اپنی ذات کے دور ہوتے مرکز سے قریب آنے کی کوشش کرو۔

(انتخاب: میجر (ر) نسیم اختر، دینہ، جہلم)

جانب دیکھا۔ پھر کانپتی لرزتی ثریا کی جانب اور دونوں ہاتھ جوڑ کے ادب سے بولا:

"دیوی جی! ڈریے گا نہیں۔ آپ چاہیں، تو چمار آپ کے گھر پہ تب تک پہرہ دے گا، جب تک اعتبار کا کوئی ہاتھ آپ کو نکال نہ لے جائے۔ یا وہ خود شار ہو جائے! اور چاہیں، تو حفاظت کے ساتھ جان پہ کھیل کے کملا جی کے ہاں چھوڑ دے گا۔ یا جدھر آپ مناسب سمجھیں۔ گلی خالی ہے اور میری لاٹھی کا سہرا خوب چوبدار ہے۔ ایک ہی ضرب میں سامنے والے کی کھوپڑی چورا کر کے رکھ دے اور آواز بھی نہ نکلنے دے۔"



یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے، دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی ہندوستان میں تحریک آزادی زور پکڑ گئی۔ اب پاکستان ایک حقیقت نظر آنے لگا۔ اس دور میں ہندوستانی وزارت دفاع کا سیکرٹری ایک کٹر، متعصب اور پاکستان دشمن شخص سر چندولال تریویدی نامی ہندو تھا۔ یہ بہت ذہین، شاطر اور بااثر انسان تھا۔ وائسرائے اور گورنر جنرل ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن فخر سے بتایا کرتے، پورے ہندوستان میں صرف ایک شخص محکمہ دفاع کا کام سمجھتا ہے اور وہ ہے سر چندولال تریویدی۔ اس شخص نے بہت عیاری سے کام لیتے ہوئے متوقع پاکستان میں واقع اسلحہ ڈپوز سے اسلحہ اور فوجی ساز و سامان بھارتی علاقوں میں منتقل کر دیا۔ نیز مسلمان یونٹیں ملایا، سنگاپور اور جنوبی ہندوستان میں

قومی تاریخ کا تابناک باب

پاک فوج نے جب پاکستان کی لاج رکھی

۱۹۴۷ء میں ہمارے بہادر جوانوں نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا کر لاکھوں مہاجرین کی جانیں ہی نہ بچائیں بلکہ حکومت کو سنبھالا دینے میں بھی پیش پیش رہے

سکندر خان بلوچ



پھیلا دیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۹۴۷ء کے آخر میں محض چند پنجابی مسلمان یونٹیں موجودہ مغربی پاکستان میں موجود تھیں۔

اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی مہاجرین کے قافلے آنے جانے لگے۔ پاکستان زیادہ تر سرکاری ملازمین بشمول افسر ہندو اور سکھ تھے جو بھارت چلے گئے۔ ان لوگوں کی اچانک روانگی سے حکومتی اور نجی دفاتر خالی ہو گئے اور انتظامی مشینری یکدم بے اثر اور ناکارہ ہو گئی۔ سب سے زیادہ پولیس متاثر ہوئی جس میں زیادہ تر سکھ تھے جن کے جانے سے امن و امان بالکل تباہ ہو گیا۔ ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت، خواتین کی عصمت دری اور اغوا کے واقعات رونما ہونے لگے۔ بھارت سے مسلمان مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے آنے لگے۔ ہر قافلہ رستے میں بہت نقصان اٹھا کر پہنچتا۔ عزتیں، جانیں، مال وغیرہ سب کچھ لٹ جاتا۔ کوئی قافلہ آدھا آ پہنچتا کوئی تہائی۔ چند ایک ہی ہوتے جو خیر خیریت سے پہنچتے۔ ہر قافلہ قتل و غارت، لوٹ مار اور عزتوں کی پامالی کی نئی داستان لے کر آتا۔ اس وقت پاکستان میں ایک فعال اور مستعد حکومتی مشینری اور منظم پولیس کی سخت ضرورت تھی..... اور یہ دونوں چیزیں بدقسمتی سے موجود نہ تھیں۔

مہاجرین کو فوری طور پر رہائش، خوراک، طبی امداد اور مکمل دیکھ بھال کی سخت ضرورت تھی۔ پھر ان لٹے پٹے قافلوں کے پہنچنے سے مقامی آبادی میں شدید ردعمل ہوا جس سے سکھوں اور ہندوؤں کی قتل و غارت روکنا ممکن ہو گیا۔ یہ صورت حال کسی طور پاکستان کے حق میں نہ تھی۔ جس دن خون میں لت پت لاشوں سے بھری پہلی مہاجر ٹرین لاہور پہنچی، تو عوام کا شدید ردعمل سامنے آیا۔ پورے ملک میں خوف فسادات شروع ہو گئے۔ اس کے بعد بھارت اور پاکستان، دونوں جگہوں پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بدلہ لینے کا جنون زور پکڑ گیا۔

پیشتر اس کے کہ خدانخواستہ پاکستان اس آگ میں جل جاتا، پاک فوج سے مدد کی اپیل کی گئی۔ فوج نے آ کر معاملات کسی حد تک سنبھالے۔ پھر بھی حکومتی مشینری کو منظم کیا۔ نیز حضرات سے مدد کی اپیل کی۔ سب کے ساتھ مل کر مہاجرین کی رہائش، خوراک، طبی امداد اور مکمل دیکھ بھال یقینی بنائی۔ مہاجرین کے لیے ریلوے اسٹیشنوں اور واہگہ بارڈر پر استقبالیہ کیمپ لگائے۔ بھارت جانے والے قافلوں کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ یوں عوام کے ساتھ مل کر ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔

فوج کا سب سے اہم اور مشکل کام مہاجرین کے قافلوں کو بسلامت پاکستان لانا تھا۔ یہ کام باقی کاموں سے بڑا اور خطرناک تھا۔ اسی زمانے میں پچاس لاکھ سے زیادہ مسلم مہاجرین نے ہجرت کی تھی۔ ان کے راستے میں سکھوں اور ہندوؤں کے منظم اور مسلح جتھے موجود تھے۔ سکھ ریاست پٹیالہ کی فوج نے قسم کھا رکھی تھی کہ مسلمانوں کو زندہ نہیں جانے دینا۔ انھوں نے مسلمانوں کے مختلف دیہات اور شہروں کے محلوں کا محاصرہ کر لیا۔ خواتین کی بے حرمتی کی۔ نوجوان لڑکیاں اغوا کر لیں۔ مسلمانوں کے گھر لوٹ لیے اور یوں مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔

مہاجرین کے لیے انگریز اور بھارتی حکومت نے ریلوں کا بندوبست کیا۔ خوش قسمتی سے پاکستانی حکومت کو بلوچ رجمنٹ کے چند دستے میسر آ گئے۔ بلوچ جوانوں نے مہاجر ریلوں کی حفاظت سنبھالی لیکن ان دستوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ ان لوگوں نے اپنی جانوں اور آرام کی پروا کیے بغیر اپنے مہاجرین کی حفاظت کے فرائض انجام دیے۔ چھوٹی بڑی تقریباً تین سو ریلیں مہاجرین سے بھری آئیں۔ بعض میں سرکاری ملازمین، اہل و عیال اور دفتری سامان وغیرہ بھی ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ۳۵۵ ریلیں بلوچ گارڈ کے بغیر آئیں اور بہت نقصان اٹھایا۔ بقیہ ریلیں پاک فوج کے جوان بحفاظت لے آئے یا بہت کم نقصان ہوا۔ پورے مشرقی پنجاب میں بلوچیوں کا اتنا خوف طاری ہو گیا کہ سکھ مائیں بچوں کو ان کا نام لے کر ڈراتے تھیں۔ بلوچیوں کی مشہوری اور دہشت اتنی پھیلی کہ ایک دفعہ ضلع

امرتسر میں جی ٹی روڈ کے قریب ایک مقامی سکھ اسکول میں اچانک کسی نے شرارتاً نعرہ لگا دیا "بلوچ آ گئے، بلوچ آ گئے۔" منٹوں میں سکھ بچے اور اساتذہ اسکول سے بھاگ کر مکئی کے کھیتوں میں چھپ گئے۔

مہاجرین کے سیکڑوں قافلے بھارت سے پیدل پاکستان روانہ ہوئے۔ جو چند فوجی کمپنیاں یہاں میسر آئیں، ان قافلوں کی حفاظت پر لگایا گیا۔ تین بڑے فرائض سونپے گئے۔ اول قافلوں کو بحفاظت بھارت سے پاکستان لانا، دوم جہاں کہیں شہر یا گاؤں میں مسلمان پھنسے ہوں، ان کو نکالنا اور سوم جن مسلمان خواتین کو سکھ لے گئے تھے، اگر ممکن ہو، تو انھیں چھڑا لانا۔ یہ تینوں بہت مشکل اور خطرناک کام تھے۔ خواتین چھڑانے یا محصور مسلمانوں کو نکالنے کے لیے باقاعدہ جنگ کرنا پڑتی۔ یہ کام ۱۴/اگست کے بعد اور بھی مشکل ہو گیا کیونکہ بھارت علیحدہ ملک بن چکا تھا اور پاکستانی فوجیوں کی کارروائیاں غیرملکی کارروائیاں تصور کی جانے لگیں۔

اس سلسلے میں کچھ فوجی اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور بہت سے جوانوں کو بھارت نے جیلوں میں ڈال دیا۔

پیدل قافلے جن میں بچے، بوڑھے اور خواتین بھی ہوتیں، بعض اوقات تیس یا چالیس میل تک پھیلے ہوئے ہوتے۔ اتنے بڑے قافلوں میں خوراک، پانی، آرام، طبی امداد کا انتظام کرنا اور سب سے بڑھ کر مسلح سکھوں کے حملوں سے حفاظت کوئی معمولی کام نہ تھا۔ ایسے قافلوں کے لیے بے پناہ وسائل کے علاوہ کم سے کم ایک ڈویژن فوج چاہیے تھی لیکن یہاں تو زیادہ سے زیادہ ایک کمپنی یا ایک بٹالین میسر آ سکی تھی۔ یاد رہے کہ قافلے صرف ایک ہی سڑک پر نہیں تھے، بھارت کی طرف سے پاکستان آنے والے تمام راستوں سے مہاجرین آ رہے تھے جن کی حفاظت بہرحال فوج ہی نے سنبھالی تھی چاہے وہ چند آدمی ہوں یا کوئی بڑا قافلہ۔ پھر بدقسمتی یہ کہ تازہ دم مزید فوج بھی میسر نہ تھی۔

لہٰذا مٹھی بھر جوان ہی دن رات قافلوں کے ساتھ چلتے۔ کبھی کھانا نصیب ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ اگر کبھی کھانا ملتا بھی تو سامنے بیٹھے بھوکے بچوں کی موجودگی میں لقمہ حلق سے نیچے نہ اترتا۔ جوان اپنا کھانا اٹھا کر بچوں کو دے دیتے۔ معاہدے کے مطابق اپنے اپنے علاقوں میں راشن کی فراہمی دونوں حکومتوں کی ذمے داری تھی لیکن بھارتی پنجاب نے یہ گھٹیا حرکت کی کہ آٹے میں شیشہ پسوا دیا۔ ایسے شیشہ ملے آٹے سے ہزارہا لوگ سخت بیمار ہو گئے۔ اس کے بعد آٹا بھی پاکستان سے منگوانا پڑا۔



بانی پاکستان پاک فوج کے ایک چاق و چوبند دستے کا معائنہ کرتے ہوئے

فوجی بھی آخر انسان ہیں۔ دن رات کی بے آرامی، مسلسل پیدل سفر، خوراک کی کمی، حفاظت کی ذمے داری، بے جا اموات کا افسوس اور ٹینشن سے وہ بھی بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئے۔ جی ٹی روڈ پر رواں دواں قافلوں کی حفاظت کا فرض ۱۳/فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک کمپنی میجر خداداد خان کی زیرنگرانی انجام دے رہی تھی۔ رپورٹ ملی کہ ۶۰ فی صد جوان بری طرح بیمار ہیں۔

جب کمپنی کی رپورٹ لاہور ڈویژن ہیڈکوارٹر پہنچی، تو ڈاکٹر نے جوانوں کو پندرہ دن آرام کرنے کا حکم دیا جس کے لیے انھیں ڈیوٹی سے فارغ کرنا ضروری تھا۔ کرنل محمد موسیٰ جو بعد میں پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف بنے، لاہور ڈویژن ہیڈکوارٹر

میں اسٹاف آفیسر تھے۔ انھیں حکم ملا کہ موقع پر جا کر میجر خدادا کی کمپنی کو واپسی اور آرام کا حکم دیں۔ لہٰذا کرنل محمد موسیٰ واہگہ بارڈر پہنچے اور کمپنی کو اکٹھا کیا۔ اس وقت جوان تقریباً تیس میل لمبے قافلے کی حفاظت کر رہے تھے۔ کرنل محمد موسیٰ جوانوں کی جسمانی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے جو کمزوری اور بیماری سے پہچانے بھی نہ جاتے تھے۔

کرنل محمد موسیٰ نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کمپنی سے خطاب کیا: "مجھے آپ کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا ہے لیکن اس وقت پاکستان اور ان مسلمان بہن بھائیوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے لیے حکم ہے کہ واپس آ کر دو ہفتے آرام کریں لیکن میں غیر سرکاری طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ عین اس وقت امرتسر کی دوسری طرف لٹے پٹے مسلمانوں کا ایک اور قافلہ روانگی کے لیے تیار ہے۔ وہاں بھیجنے کے لیے میرے پاس ایک بھی سپاہی نہیں ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے آپ آرام کے لیے لاہور آ جائیں یا بہن بھائیوں کی حفاظت کے لیے واپس امرتسر چلے جائیں۔" جونہی کرنل موسیٰ واپس مڑے تمام جوان امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہی جذبہ بقیہ مقامات پر بھی دیکھنے میں آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاک فوج کا جوان کہیں بھی تھا، پوری توانائی سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ مثلاً کچھ خواتین بچوں اور بوڑھوں سے بھرے ٹرک امرتسر سے واہگہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹرک ڈرائیور سکھ تھے۔ وہ سکھ حملہ آور جتھوں سے ملے ہوئے تھے۔ ایک جگہ آرام کے بہانے ٹرک کھڑے کر دیے۔ جہاں نزدیک ہی حملہ آور جتھہ تیار تھا۔ اتنی دیر میں پنجاب بارڈر سیکیورٹی فورس کی میڈیکل برانچ کا ایک مسلمان نائیک کسی طرح وہاں آ پہنچا۔ خوش قسمتی سے یہ شخص مسلح تھا۔ اس نے خطرہ بھانپ لیا۔ فوری طور پر تمام مہاجرین کو نیچے اتارا۔ گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہوا پورے قافلے کو بحفاظت پاکستان لے آیا۔

اسی طرح حوالدار محمد شریف نے ضلع ہوشیار پور کے گاؤں بستی والی میں تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر لیا۔ پھر ان کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا اور تمام لوگوں کو بچا کر پاکستان لے آیا۔ یہ جوان مقابلے میں سخت زخمی ہوا۔ جب اسپتال لایا گیا تو اس کے جسم کا کوئی حصہ ضربوں یا زخموں سے خالی نہ تھا۔ غرض فوجی جوان اپنے خاندانوں اور رشتہ داروں کی سلامتی سے بے پروا ہو کر پاکستان کی خدمت انجام دیتے رہے۔

ریٹائرڈ فوجیوں نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ ضلع روہتک کا قصبہ کلانور مسلمان راجپوتوں کا علاقہ تھا جہاں کافی ریٹائرڈ فوجی موجود تھے۔ جونہی فسادات شروع ہوئے انھوں نے اردگرد کے تمام مسلمانوں کو مخصوص مقامات پر جمع کیا اور پورا علاقہ ایک فوجی قلعے میں بدل دیا۔ سکھوں نے حملوں کی سرتوڑ کوشش کی لیکن ان باعزت راجپوتوں نے کسی کو نزدیک تک نہ آنے دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی علاقوں کے ریٹائرڈ فوجی بھی متحد ہو گئے۔

تحصیل فلور کے گاؤں تلوان میں ریٹائرڈ کیپٹن حبیب اللہ نے اپنا گاؤں قلعے میں تبدیل کر دیا جہاں دور و نزدیک کے بہت سے مسلمانوں کو پناہ ملی۔ چک سعد اللہ ضلع امرتسر میں کیپٹن ریاست چودھری نے بھی یہ قدم اٹھایا۔ یہ ریٹائرڈ فوجی اپنے تمام لوگوں کو بحفاظت پاکستان لے کر پہنچے۔ وہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔ ان لوگوں کی کہانیاں بہت جلد پورے علاقے میں پھیل گئیں۔ لہٰذا سویلین مسلمان بھی متحرک ہو گئے۔ مختلف علاقوں کے مسلمان کسی مرکزی علاقے میں اکٹھے ہوتے گئے اور سکھوں کا مقابلہ کیا تاوقتیکہ فوج انھیں وہاں سے نکال کر لے آئی۔ سرہند کے پٹھان اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بستی پٹھاناں کے مرکزی علاقے میں اکٹھے ہو گئے جہاں سب سے زیادہ مسلمان قافلے لٹتے تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف پیدل قافلوں کو لٹنے سے بچایا بلکہ کئی مہاجر ریلوں کی بھی حفاظت کی۔ ان لوگوں کا اتحاد اور دلیری قابل فخر تھی۔

یہ فوجیوں کی خدمت کا صرف ایک رخ تھا، انھوں نے اپنے پیٹ کی بھی قربانیاں دیں۔ جو کچھ طعام ان میں تھا یا جو کچھ میسر آ سکتا تھا، مہاجرین کے بچوں کو دے دیا۔ جب قائداعظم کی طرف سے مدد کی اپیل کی گئی، تو فوجیوں نے سب سے بڑھ کر مدد کی اور اپنی پوری پوری تنخواہیں دے ڈالیں۔ فوج کی طرف سے یہ مدد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1- 7th ڈویژن ..... 2,74,556.8 روپے
2- 8th ڈویژن ..... 97,737.3 روپے
3- 9th ڈویژن ..... 1,79,479.3 روپے
4- 10th ڈویژن ..... 2,61,013.5 روپے
5- مشرقی پاکستان سب ایریا ..... 30,259.9 روپے

یہ اس دور کے حساب سے بہت بڑی رقم تھی کیونکہ سپاہی کی تنخواہ تب فقط پندرہ سے تیس روپے ہوتی۔ کچھ لوگ قربانی کے جذبے میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ ان کے اپنے بال بچوں کی حالت فاقوں تک جا پہنچی۔ اچانک فوجی اسپتال بیمار خواتین اور بچوں سے بھرنے لگے۔ چھان بین سے پتا چلا کہ کچھ خاندان خوراک کی کمی کا شکار ہو گئے۔ کمانڈر انچیف کو سرکاری طور پر حکم دے کر ایسی امداد بند کرنا پڑی۔

ریل گاڑیوں کے علاوہ پیدل قافلوں کی حفاظت پر مامور فوجی یونٹوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کام کیا۔ مثلاً پروبن ہارس (Probyn's Horse) نے بیاس، اٹاری، موگا، فیروزپور، گنڈا سنگھ کے راستوں پر دو لاکھ چالیس ہزار مہاجرین کو بحفاظت پہنچایا۔ ۳/۱۶ پنجاب نے گورداس پور کے علاقے میں فرائض انجام دیے اور تقریباً ایک لاکھ مہاجرین کو لے آئے۔ ۵/۱۳ فرنٹیئر فورس رائفلز نے نہر اپر باری دوآب کے راستے امرتسر سے لدھیانہ تک کے علاقے سے تقریباً ۶ لاکھ مہاجرین بحفاظت پہنچائے۔ اسی طرح ۳/۱۲ فرنٹیئر فورس نے پورے ضلع جالندھر میں حفاظتی فرائض انجام دیے۔ ان یونٹوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے پلاٹونوں اور گروہوں کی صورت میں چھوٹے چھوٹے راستوں کی حفاظت کی۔

۱۹۴۷ء میں پاک فوج نے مہاجرین کی حفاظت اور حکومت پاکستان مضبوط بنانے کے لیے جو بھی اقدامات کیے، وہ اس کا فرض تھا۔ اس نے اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھائے۔ فوج ہی وہ واحد منظم ادارہ ثابت ہوا جس نے مسائل میں گھرے نوزائیدہ پاکستان کو اپنا خون، اپنے وسائل، اپنی ذہنی اور جسمانی توانائیاں دے کر استحکام بخشا۔ اگر خدانخواستہ فوج اس وقت موجود نہ ہوتی، تو عین ممکن ہے نوزائیدہ پاکستان کا حشر بھی حیدرآباد (دکن) اور گوا جیسا ہوتا۔ جنرل کری آپا جیسے متعصب ہندو فوجی جرنیل جنھوں نے پاکستان ختم کرنے کے لیے پہلے ہی سے تیاری کی ہوئی تھی اور اس مقصد کے لیے مکمل منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ قوم یاد رکھے یا نہ رکھے، فوج نے نہ صرف بے مثال قربانیاں دیں بلکہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر پاکستان کی سلامتی کو یقینی بنایا۔

پاک فوج زندہ باد، پاکستان پائندہ باد۔

چاکلیٹ کھائیے اور دل کو صحت مند رکھیے

برطانیہ میں ہوئی نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ مناسب مقدار میں چاکلیٹ کھانے سے انسان دل کی بیماریوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔ برطانیہ کی فائیو منٹ یونیورسٹی کی جانب سے یہ تحقیق ۲۱ ہزار افراد سے پوچھے گئے سوالات اور ان کی صحت کی جانچ کے بعد سامنے آئی ہے۔ تحقیق کے دوران ان افراد سے طرز زندگی سے متعلق سوالات بھی پوچھے گئے۔ تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ان میں سے بعض افراد چاکلیٹ بالکل نہیں کھاتے جبکہ بعض روزانہ ۱۰۰ گرام تک چاکلیٹ کھانے کے عادی تھے۔ اس طرح یہ تمام افراد اوسطاً ۷ گرام چاکلیٹ کھاتے۔ ان میں سے ۵ فی صد افراد کی صحت کی جانچ سے معلوم ہوا کہ انھیں دل کی بیماریاں لاحق ہونے کے خطرات دیگر کے مقابلے میں ۱۱ فی صد کم ہیں جبکہ فالج کے خطرات بھی کم چاکلیٹ کھانے والوں کے مقابلے میں ۲۳ فی صد کم پائے گئے۔

قائداعظم کے نام

معصوم بچوں کے خط

جوش و جذبے سے معمور تحریک پاکستان کے ایک روشن و اجلے باب کا ناقابل فراموش تذکرہ

راؤ منظر حیات

مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جو کم از کم میری نظروں سے اوجھل رہا۔
یہ معصوم بچوں کا قائداعظم کی خدمت
میں وہ خطیر ہے جو انھوں نے قلم تی کے
زمانے میں ایک ایک پیسا جوڑ
کر بھجوایا تھا۔ ۳۶ بچوں کے
یہ نایاب خطوط اس عظیم
اتحاد کا مظہر تھے جو
مسلمانوں کو
اپنے نایاب





قائد پر تھا۔
انھیں کتابی شکل
میں ڈاکٹر ندیم
شفیق ملک نے محفوظ کیا
ہے۔ یہ کام قابل تحسین ہے اور قابل ستائش بھی۔ میں ان میں سے چند خطوط آپ کے سامنے رکھتا ہوں تاکہ اس وقت کے بچوں کے انداز فکر کا اندازہ ہو سکے۔ نیز یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم نے اپنے ملک کی فکری اساس کو کس بے دردی سے پامال کیا ہے۔ آپ خطوط پڑھتے جایئے، میں نے ان میں کسی لفظ کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔

پہلا خط

مورخہ ۲۹/۴/۴۲

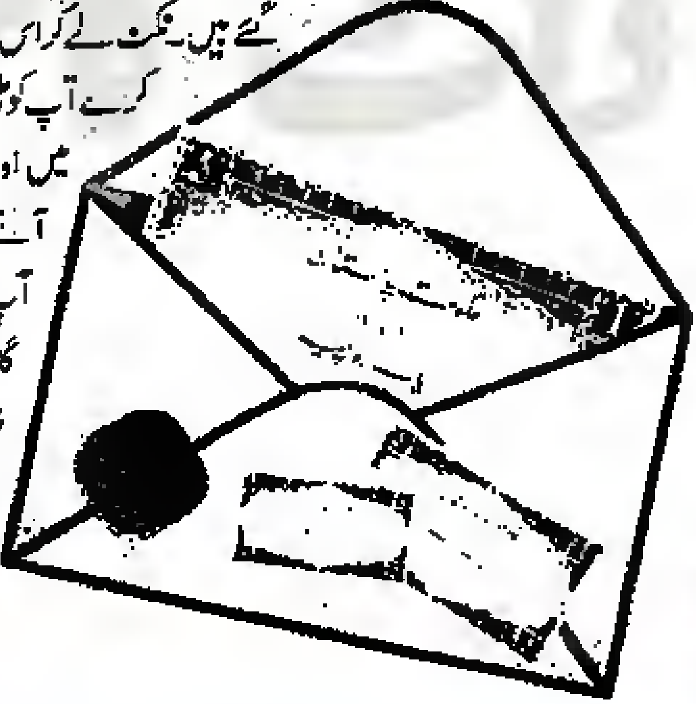
جناب باباجی صاحب۔ حضور جناح صاحب

بعد آداب غلامانہ کے عرض ہے کہ پھوپھی جان بیس دن ہوئے، دوستوں سے کہتے تھے کہ حضور جناح صاحب نے مسلمانوں کے کام واسطے ہر ایک مسلمان، سے چندہ مانگا ہے۔ آگے نہیں مانگا تھا۔ باباجی صاحب، مجھ غلام کو جو پیسہ ملتا ہے، میں نے اکٹھا کر لیا ہے۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ آٹھ آنے جمع ہو گئے ہیں۔ ٹکٹ لے کر اس لفافے میں بند کر کے بھیجے ہیں۔ خدا کرے آپ کو مل جائیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اور بھی پیسے جمع کروں گا۔ اگر یہ آٹھ آنے آپ کو مل گئے، اور بھی بھیجوں گا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ اور جب بڑا ہوں گا اور بھی بہت زیادہ روپے بھیجوں گا۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آداب، راقم، آپ کا غلام،

عزیز الرحمن طالب علم

جماعت پنجم، چشتیہ ہائی اسکول،

امرت سر





دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے!

۴۲/۳/۲۹

حضرت قائداعظم دام ظلکم

السلام علیکم

ہم دونوں بھائی بہن اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ میں درجہ ہشتم میں پڑھتا ہوں اور میری چھوٹی بہن چوتھی جماعت میں تعلیم پا رہی ہے۔ میں نے اخبار منشور میں اپنے محبوب قائداعظم کی اپیل مسلم قوم کے نام جب پڑھی، تو اسی روز سے ہم دونوں بھائی بہن نے تہیہ کر لیا کہ جو پیسے ہمارے والدین ہم کو روزانہ دیں گے، جب کہ ہم اسکول جاتے ہیں، ان کو جمع کر کے اپنے محبوب قائداعظم کے سرمایہ میں جمع کریں۔ آٹھ آنے کے ٹکٹ ناچیز قبول فرمائیں۔ قائداعظم زندہ باد، خادم، قریشی اظہار معین، متعلم درجہ ہشتم، مظفر نگر

تیسرا خط

معرفت منزل، محرم جاہی روڈ، حیدرآباد دکن

محترم قائداعظم! السلام علیکم!

اب سے میں نے اپنے جیب خرچ کو سوچ کے لیے نہیں خرچ کیا تھا۔ لہٰذا وہ پانچ روپیہ میں قومی دفاعی فنڈ کے لیے بھیج رہی ہوں۔ میں ایک اسکول گرل اس سے زیادہ نہیں بھیج سکتی۔ امید ہے کہ ایک لڑکی کے جیب خرچ کی یہ حقیری رقم آپ فنڈ میں شامل کر لیں گے۔ میں وہی لڑکی ہوں جس نے آپ سے حیدرآباد، راک لینڈ گیسٹ ہاؤس میں ۱۰ اگست ۴۱ کو ملاقات کی تھی اور کچھ پاکستان اور مسلم ترقی کے متعلق گفتگو کی تھی۔

فقط، شمیم آراء

چوتھا خط

ملتان، ۱۷ جون ۴۲ء

بخدمت جناب قائداعظم صاحب، السلام علیکم

آپ کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے قومی فنڈ کے لیے ۸ آنے کا پوسٹل آرڈر نمبر اے ۲۷۴۴۳۰ بھیج رہا ہوں۔ یہ میں نے اپنے جیب خرچ میں سے جمع کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ میری حقیر رقم قبول فرمائیں گے۔

آپ کا خادم

سعید اختر، جماعت نہم ایمرسن کالج، ملتان

پانچواں خط

بخدمت حضرت قائداعظم محمد علی جناح صدر مسلم لیگ کل ہند بمبئی

ہمارے اچھے قائداعظم!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ہم یتیموں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ قائداعظم آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں سے مسلم لیگ کے لیے چندے کی درخواست کی ہے۔ یہ ہم کو اخباروں کے ذریعے معلوم ہوا۔ ہمارا بھی خیال ہوا کہ ہم بھی آپ کی خدمت میں کچھ چندہ پیش کریں اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم یتیم ہیں اور ہمارے کھانے پینے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام یتیم خانے سے ہوتا ہے۔ ہمارے ماں باپ نہیں ہیں جو ہم کو ہر روز پیسے دیں۔ پھر بھی ہم نے یہ طے کر لیا کہ آپ کی خدمت میں ضرور کچھ بھیجیں گے۔

اس لیے ہم کو دھیلہ پیسہ جو بھی کچھ بھی جہاں کہیں سے ملا، اس کو جوڑنا شروع کر دیا یہاں تک کے تین روپیہ دو آنے کی رقم جمع ہوئی۔ اب اس کو آپ کی خدمت میں روانہ کر رہے ہیں،

جاپانیوں کی لمبی عمر کا راز

دنیا بھر میں سب سے زیادہ طویل العمر افراد جاپان کے جزیرہ اوکیناوا میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔ پیٹ بھرنے سے پہلے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کم کھانے سے ہم صحت مند رہیں گے۔ ماہرین نے اس خیال کو درست ثابت قرار دیا ہے۔ (انتخاب: میجر (ر) مسز نسیم اختر، ویٹہ)

آپ ان کو قبول کیجیے۔ ضرور قبول کیجیے۔ ہم آپ سے اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو زندہ رکھا اور ہم خوب پڑھ کر جوان ہوئے، تو مسلم لیگ کی بڑے زور سے خدمت کریں گے اور جب ہم کمانے لگیں گے، تو آپ کی درخواست پر بہت سے روپے چندے میں دیں گے۔ آپ ہمارے لیے دعا کیجیے۔

والسلام، ہم ہیں آپ کے دعاگو

یتیم خانہ کے بچے، یتیم بچہ پیٹھ (صوبہ مدراس)

☆☆

خلوص بھرے ان خطوط میں سے کس کو نکالوں، کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں۔ بچوں کے آٹھ دس آنے کے چندے کی باتیں قلمبند کرتے ہوئے روح تک کانپ جاتی ہے۔ ہم لوگ کیا تھے اور کیا بنا دیے گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ معصوم بچے پاکستان آ بھی پائے یا نہیں۔ یہ راستے میں شہید کر دیے گئے یا اغوا کر لیے گئے۔ اگر یہ بچے یہاں پہنچ بھی گئے، تو ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا۔ آج وہ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں۔

مجھے کسی بات کا کوئی علم نہیں البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہماری قوم کا بال بال آج اندرونی اور بیرونی قرضے میں بندھا ہوا ہے۔ ہم کھربوں روپے کے مقروض ہیں۔ یہ کوئی حکومت ادا بھی کر پائے گی یا نہیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو یتیم بچوں کے تین روپے دو آنے کا قرض تک ادا نہیں کر سکتا جو انھوں نے اپنے کھانے پینے اور کپڑوں کے اخراجات سے بچا کر اس ملک کو دیے تھے۔ شاید آپ اتنا بھاری قرض ادا کر سکیں، اس قرض کی ادائیگی میری استطاعت سے تو بالکل باہر ہے، صاحبان! بالکل باہر۔

◆◆◆

پُراسرار مقبرہ

جی ٹی روڈ پر سفر کرتے گوجرانوالہ سے تیرہ چودہ کلومیٹر آگے نکلیں تو ایمن آباد موڑ نامی ایک اڈہ آتا ہے۔ اس اڈے سے جانب مشرق سفر کریں تو چند کلومیٹر بعد ایمن آباد کا تاریخی قصبہ نظر آنے لگتا ہے۔

ایمن آباد آج ایک قصبہ یا چھوٹا سا شہر بن چکا مگر ماضی میں یہ شاہراہ ریشم کی تجارتی گزرگاہ کا اہم مرکز رہا ہے۔ اسی لیے مغل دور میں یہ اورنگزیب کے زمانے تک علاقے کا انتظامی صدر مقام رہا۔ تب گوجرانوالہ آج جیسی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ علاقے کا مغل والی یا گورنر ایمن آباد میں قیام کرتا۔ ان والیوں نے قصبے میں کئی عمارات تعمیر کرائیں جن میں باغات، سرائیں، غسل خانے اور حویلیاں شامل ہیں۔ ان کے آثار ایمن آباد میں جابجا موجود ہیں۔

زمانے کی دست و برد سے محفوظ رہ جانے والے آثار میں سب سے مشہور "عبدالنبی مقبرہ" ہے۔ یہ "کوٹلی مقبرہ" بھی کہلاتا ہے۔ یہ مقبرہ ایمن آباد کی مضافاتی بستی، کوٹلی مقبرہ میں واقع ہے۔ یہ مقبرہ اس لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ کھیتوں کے بیچوں بیچ سنسان جگہ ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ وہاں دور دور تک کسی اور عمارت کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔

کوٹلی مقبرے کا طرز تعمیر لاہور کی مشہور عمارت چوبرجی سے ملتا جلتا ہے۔ چوبرجی دراصل ایک وسیع و عریض باغ کا دروازہ تھا جو اب معدوم ہو چکا۔ جبکہ کوٹلی مقبرے کے عین وسط میں واقع سفید گنبد عیاں کرتا ہے کہ اسے بطور مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

مقبرے کی تعمیر میں سرخ اینٹیں اور گارا استعمال کیا گیا۔ کسی زمانے میں اس پر بھی خوبصورت نقش و نگار تھے مگر اب وہ تقریباً مٹ چکے۔

مغلیہ دور کی اہم کتب تاریخ "ماثر الامرا" اور "شاہ جہان نامہ" میں درج ہے کہ اپنے مصاحب کی وفات کے بعد شاہ جہاں نے اس کے تینوں بیٹوں کو جاگیریں عطا کیں۔ تب چھوٹا بیٹا، عبدالنبی بارہ سال کا تھا۔ ممکن ہے کہ اس لڑکے کو ایمن آباد میں جاگیر عطا ہوئی اور وہیں عبدالنبی کا مقبرہ بھی تعمیر ہوا۔ مگر یہ محض قیاس آرائی ہے، حقیقت سے صرف اللہ تعالیٰ ہی واقف ہیں۔

بہرحال آپ بھی گوجرانوالہ کی طرف رخ کریں، تو ایمن آباد ضرور جائیے۔ تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے مرد و زن اس علاقے میں قدیم تہذیب و ثقافت کے کئی یادگار نمونے پا کر شادکام ہوں گے۔

وہ مر کر بھی زندہ رہی

لاش کی خوشبو

ایک ہندو لڑکی کے قبول اسلام کا روح پرور واقعہ

نوید اسلام صدیقی

زندگی کے چند ماہ ساہیوال شہر میں گزرے۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں دانہ پانی وہاں لے گیا اور نومبر میں ہم لاہور واپس آ گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ کبھی کبھار ہمارے ایک عزیز جن کا نام بھی عزیز تھا، وہاں آ جاتے۔ انھیں ساہیوال کے قریب زمین الاٹ ہوئی تھی۔ یہ زمین اس لیے ملی کہ ان کی آبائی زمین اسلام آباد کے اندر شامل کر لی گئی تھی۔ عزیز صاحب کے ساتھ ان کے دوست شفیق صاحب بھی آتے جاتے رہے۔ انھیں بھی اسی طرح زمین الاٹ ہوئی تھی۔

شفیق صاحب نے ایک رات میرے ہاں قیام کیا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے ''یہ جس مکان میں آپ رہتے ہیں، یہاں بھی ہندو رہتے ہوں گے کیونکہ مکان کے باہر ۱۹۳۹ء اور ہندی کے کچھ الفاظ لکھے ہیں۔'' میں نے کہا ''ہاں، میں نے بھی سنا ہے کہ اس مکان میں ہندو فیملی رہتی تھی۔'' شفیق صاحب کہنے لگے، مجھے یہ دیکھ کر ایک ہندو کا مکان یاد آ گیا ہے جو ہمارے گاؤں میں تھا۔

میں نے پوچھا ''آپ کا گاؤں کہاں ہے۔''

کہنے لگے ہمارا گاؤں، کالام راولپنڈی سے چالیس پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب کی جانب واقع ہے۔ تقسیم ہند کے وقت اس میں ستر اسّی مکانات تھے۔ جن پندرہ گھر ہندوؤں کے تھے۔ گاؤں میں ایک گھر سیدوں کا تھا۔ سید صاحب سکول ماسٹر



تھے۔ مسجد میں امامت کراتے اور خطبہ بھی جانتے تھے۔ ان کے گھر اخبار بھی آتا تھا جو روزانہ شام کو وہ پڑھ کر سنایا کرتے۔ ہندوؤں کا محلہ علیحدہ تھا۔ ایک مکان میں ایک ہندو ٹیچر کرشن لال اہل خانہ کے ساتھ رہتے تھے۔ میں نے تو نہیں میرے بڑے بھائی نے ان سے پڑھا۔ کرشن لال وسیع القلب تھے۔ کسی مذہب سے نفرت نہ کرتے۔ ان کی ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام گلاب دیوی تھا۔ سید صاحب کی ایک بیٹی، رخشندہ، گلاب دیوی کی ہم عمر تھی۔ گلاب دیوی دن میں کئی دفعہ سید صاحب کے گھر کے چکر لگاتی۔ گھر والے کچھ نہ کہتے تھے۔ مسلمان گھرانے میں آنے جانے کا اثر یہ ہوا کہ وہ بتوں سے بیزار رہنے لگی لیکن اپنے گھر میں مصلحت کے تحت خاموش رہتی۔

تقسیم ہند کے وقت اس کی عمر انیس بیس سال ہوگی۔ اس کے ماں باپ نے فیصلہ کیا کہ دہلی چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے جس دن بھارت جانا تھا، اس سے چار پانچ روز قبل گلاب دیوی سید صاحب کی بیوی سے کہنے لگی ''میرے ماں باپ تو دہلی جا رہے ہیں لیکن میں نہیں جانا چاہتی۔ میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاؤں گی۔ اور ادھر آپ کے پاس رخشندہ کے ساتھ رہوں گی۔''

بیگم نے سید صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات اتنی آسان نہیں جتنی بچی سمجھ رہی ہے۔ سید صاحب نے تو بچی سے براہ راست بات کی۔ بچی نے کہا کہ دل میں تو کئی سال سے مسلمان ہوں لیکن اب حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ دہلی جا کر میں اپنے آپ کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ سید صاحب نے کہا کہ وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر یہاں کوئی آزمائش آ گئی تو پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا، میں ہر مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سے جان جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مروں گی تو مسلمان کی حیثیت سے!

قصہ مختصر وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئی اور سید صاحب کے گھر رہنے لگی۔ سید صاحب کرشن لال کے گھر گئے اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ کرشن لال نے کہا ''آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ایک وسیع القلب انسان ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہماری بیٹی نے اسلام قبول کر لیا ہے، مجھے بالکل کوئی اعتراض نہیں۔ اس نے آپ کے گھر ٹھہرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ میرے بڑے بھائی ہیں، مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ دہلی نہیں جائے گی۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ وہ اب بالغ ہے۔ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔ میں اعتراض کرنے والا کون ہوں؟ یہ سب باتیں مجھے منظور ہیں لیکن آپ سے میری ایک التجا ہے۔ ہم اس کے ماں باپ ہیں، جب تک ہم ہندوستان نہیں چلے جاتے، اسے آپ ہمارے پاس رہنے دیں۔ جس دن ہماری روانگی ہوگی میں اسے خود آپ کے گھر لے آؤں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

سید صاحب نے گھر آ کر بتایا کہ کرشن لال سے میری بات ہوئی ہے۔ خلاف توقع اس نے میری تمام بات طیش میں آئے بغیر سنی اور پھر جو باتیں کہی ہیں، مجھے خود اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کرشن لال یقیناً ایک عظیم انسان ہے۔ سیدانی نے کہا کہ آپ بھی ہندو کی بات میں آ گئے۔ ہندو کی یہ نشانی ہے کہ بغل میں چھری منہ میں رام رام۔ خدا کے واسطے گلاب دیوی کو واپس نہ بھیجیں۔

گلاب دیوی نے بھی بڑا شور مچایا لیکن سید صاحب نے کہا، میں وعدہ کر آیا ہوں، اب اسے بھیجنا ہی پڑے گا۔ گلاب دیوی جس کا نیا نام خدیجہ بی بی رکھا گیا تھا، وہ بہت روئی چلائی لیکن سید صاحب نے اسے کہا کہ تم بے فکر ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں لڑکی کی ماں سید صاحب کے گھر گھس آئی اور روتے روتے بیٹی کو چمٹ گئی۔ اس نے سید صاحب کو بتایا کہ باہر ماسٹر کرشن لال کھڑا ہے۔

ماں نے کہا ''بیٹی، تو نے اپنا دھرم چھوڑ دیا ہے لیکن تیرے باپ نے تجھے معاف کر دیا۔ جن ماں باپ نے تجھ کو پالا پوسا، ان کی درخواست ہے کہ تو ہمارے ساتھ گھر چل۔ ہم نہیں چاہتے تیری وجہ سے سید صاحب سے ہمارے تعلقات خراب ہوں۔

ہم خود تجھے ان کے گھر چھوڑ کر جائیں گے۔ میں تجھے وچن دیتی ہوں کہ تو کسی بھی صورت اس گاؤں سے باہر نہیں جاسکے گی۔ بے شک ملک تقسیم ہو رہا ہے لیکن ہم تو اس گاؤں کو بھلا نہیں گے نہ تجھے بھلائیں گے۔ ہم تیرے پاس آتے جاتے رہیں گے۔"

یوں کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ کرشن لال اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

اگلے تمام دن ماسٹر کرشن لال کا گھر بند رہا۔ کسی کو انہوں نے گھر میں گھسنے دیا نہ خود گھر سے باہر نکلے۔ اس سے اگلے دن وہ لوگ منہ اندھیرے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کسی پڑوسی نے گلاب دیوی کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا کہ کل رات لڑکی کا ماموں آیا تھا، وہ لڑکی کو ساتھ لے گیا۔ لڑکی نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ میں نے صرف گھر اور گاؤں کی محبت میں یہاں رہنے کی خاطر مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماموں نے جب اسے سمجھایا تو وہ دہلی جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

سیدانی صاحبہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے سید صاحب سے کہا، قیامت کے دن اگر اس بچی نے آپ کا دامن پکڑ لیا تو آپ اس کو کیا جواب دیں گے؟ سید صاحب کافی دیر سر پکڑ کر بیٹھے رہے۔ روتے بھی رہے کہ کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے؟ کرشن لال نے باتوں میں ان کو چکر دے دیا تھا۔ اب بھارت جا کر کیسے ممکن ہے کہ وہ لڑکی اپنے اسلام کو بچا سکے۔

جلد ہی انڈیا سے مہاجرین کے قافلے آنے شروع ہو گئے۔ کچھ مسلمان خاندان اس گاؤں میں بھی پہنچے اور ہندوؤں کے چھوڑے مکانوں میں آباد ہو گئے۔ کرشن لال کا گھر بھی ایک مہاجر فیملی نے لے لیا۔ چند دن بعد وہ مکان چھوڑ کر راولپنڈی چلے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مکان میں کوئی جن بھوت ہے یا کوئی زندہ روح ہے۔ دن کو اتنا محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کو عجیب عجیب ڈرامے ہوتے ہیں۔ کبھی دروازے خود ہی کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ کبھی ہوا کے عجیب سے جھونکے چلتے ہیں۔ کبھی گھر میں اچانک خوشبو سی پھیل جاتی ہے۔ ایک اور فیملی اس

ذرا مسکرائیے

ایک صاحب ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور بولے "جناب، مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔"

ڈاکٹر صاحب "اچھا! تم کام کیا کرتے ہو؟"

مریض "میں موٹر مکینک ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب "اچھا تو تم میز کے نیچے لیٹ جایا کرو، نیند آجائے گی۔"

(مراسلہ: ازظفر وقاص، راولپنڈی)

مکان میں آئی۔ لوگوں نے انھیں ساری باتیں بتائیں لیکن انہوں نے کہا، ہم کسی جن بھوت وغیرہ سے نہیں ڈرتے۔ لیکن معلوم نہیں کیا ہوا، ایک ہی رات میں نئی خاندان نے بھی گھر خالی کر دیا۔ پھر مکان بند ہی پڑا رہا۔

۱۹۵۴ء یا ۵۵ء میں گورنمنٹ نے لڑکیوں کے لیے گاؤں میں سکول کھولنے کا اعلان کیا۔ محکمہ تعلیم والوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ آپ جگہ کا بندوبست کر دیں، دو استانیاں بچیوں کو پڑھانے آئیں گی۔ گاؤں کے لوگوں نے سوچا کہ کرشن لال کا مکان کافی عرصہ سے بند پڑا ہے۔ اس میں سکول کھولا جاسکتا ہے۔ گاؤں کی خواتین نے سکول مل کر صاف کیا۔ اس میں سفیدی کی گئی۔ استانیوں کے لیے کرسیاں میزیں مہیا کی گئیں۔ دو استانیوں میں سے ایک سینئر اور اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھی۔ اس نے ایک کمرے میں اپنی کرسی اور میز لگوائی۔ باقی دو کمرے جماعت بنا دیے گئے۔

اسکول ٹھیک ٹھاک چل پڑا۔ چھٹا یا ساتواں دن تھا۔ ہیڈ مسٹریس اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ دو خواتین بچوں سمیت اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس بچوں کے داخلہ فارم پر کر رہی تھی۔ اچانک کرسی کے نیچے سے کڑک کی آواز آئی جیسے کوئی لکڑی ٹوٹی ہو۔ ساتھ ہی کرسی کی ایک ٹانگ زمین میں دھنس گئی۔

پھر عجیب قسم کی تیز خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ ہیڈ مسٹریس اور دو خواتین کمرے سے باہر نکل آئیں۔ سب لڑکیاں پڑھائی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گئیں۔ ہیڈ مسٹریس اور سب نے وہ جگہ جا کر دیکھی جہاں کرسی پڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے عجیب و غریب خوشبو نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ ایک لڑکی جا کر سید صاحب کو بلا لائی۔ سارا ماجرا دیکھ کر وہ بھی بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ زمین میں سے خوشبو نکلنے کا چکر سمجھ نہیں آیا۔

سید صاحب نے گاؤں کے چار چھ معتبر آدمیوں کو بلا لیا۔ ایک آدمی کو کہا گیا کہ وہ فرش کی اینٹیں ہٹائے۔ اس نے اینٹیں اکھیڑیں۔ اس کے بعد مٹی آ گئی، تو وہ وہ ہٹائی۔ نیچے ایک ٹوٹا ہوا لکڑی کا پھٹہ نظر آیا۔ پھٹے کے ہٹاتے ہی خوشبو کی شدت ناقابل بیان حد تک بڑھ گئی۔ سیاہ گڑھے میں کوئی کپڑا سا نظر آ رہا تھا۔ وہ کپڑا باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سیاہ موٹی سی چادر ہے۔ چادر کے نیچے کالے سیاہ بال نظر آ رہے تھے۔

لالٹین منگوا کر اندر روشنی ڈالی گئی۔ معلوم ہوا کہ اندر کوئی عورت بیٹھی ہے۔ سبھی لوگ ڈر گئے۔ تب سید صاحب نے کہا ”میرا خیال ہے، ظالم کرشن لال نے گڑھا کھود کر بیٹی کو یہاں زندہ دفن کر دیا تھا۔“ لڑکی کو جو لال جوڑے میں ملبوس تھی، باہر نکال کر چارپائی پر لٹا دیا گیا جو نزدیکی گھر سے منگوائی گئی تھی۔ سید صاحب نے سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ خوشبو لڑکی کے کپڑوں سے آ رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے لڑکی سوئی ہوئی ہے اور ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔ سات آٹھ سال قبل زمین میں اسے دفنایا گیا تھا لیکن سر کے بال اسی طرح کنگھی سے سنورے نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پانچ میل دور تھانہ تھا، وہاں سے تھانے دار صاحب کو بھی بلا لیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ لڑکی کو باقاعدہ غسل دے اور جنازہ پڑھ کر قبرستان میں دفنا دیا جائے۔

جلد ہی پورے علاقے میں یہ بات پھیل گئی۔ تمام قریبی دیہات سے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے لوگ آئے۔ خواتین نے خدیجہ بی بی کا چہرہ دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ خوشبو تو نعش کے قریب جانے والے ہر فرد کو محسوس ہوئی۔

لوگوں نے اندازہ لگایا کہ کرشن لال اتنا چھوٹا سا گڑھا ہی کھود سکا کہ اس میں لڑکی کو بٹھایا جا سکتا تھا۔ اس نے لڑکی کو بے ہوشی کی کوئی چیز کھلا کر گڑھے میں اتار دیا۔ بس یوں سمجھیں کہ زندہ درگور کر دیا۔

٭٭٭

گلاب دیوی کو وفات تقریباً دو ہفتے ہو چکے کہ سید صاحب کو بھارت سے کرشن لال کا خط موصول ہوا۔ اس نے خط میں لکھا ”میں جب سے دہلی آیا ہوں، گلاب دیوی مجھے خوابوں میں دکھائی دیتی رہتی ہے۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ چند دن قبل ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیٹی آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔ آپ اس کا جنازہ پڑھا رہے ہیں اور بہت سارے لوگ صفیں باندھے کھڑے ہیں۔“

خط میں اس نے یہ بھی لکھا کہ جب سے ہم ادھر سے دہلی آئے ہیں، میری بیوی نیم پاگل ہو چکی۔ مجھے دیکھتے ہی قاتل، ظالم، وحشی اور نجانے کیا کیا کہتی رہتی ہے۔ صبح و شام ایک ہی گردان پڑھتی رہتی ہے: ”میری بیٹی زندہ ہے میری بیٹی زندہ ہے۔“

سید صاحب نے جواب میں اسے تفصیل سے سارے حالات و واقعات لکھ بھیجے۔ کرشن لال نے جو دھوکا دیا تھا، اس پر اسے شرم دلائی۔ اسے بتایا کہ آپ کی بیگم سچ کہتی ہیں، شہید ہے۔ وہ زندہ ہے۔ ہماری کتاب مقدس قرآن مجید میں لکھا ہے ”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔“ (سورہ البقرہ آیت ۱۵۴)۔

"میں پاکستان جاؤں گا"..... حکیم محمد سعید نے فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ انسانی مقسوم کی طرح اٹل تھا اور اس فیصلے نے ان گنت انسانوں کی تقدیر بدل دی۔ یہ فیصلہ حکیم محمد سعید نے دلی میں کیا جو ایک نوآزاد ملک کی راجدھانی تھی۔ دلی جو صدیوں حکومتوں کا دارالخلافہ رہا، شہروں کی ملکہ۔ بیک وقت قدیم ترین اور جدید ترین بھی۔ وہی دلی جہاں حکیم محمد سعید پیدا ہوئے۔ جہاں نرم گرم دن گزر رہے تھے۔ کبوتر اڑاتے، پہلوانی کرتے، تعلیم پاتے، حکمت کرتے، انتظامی امور میں بھرپور حصہ لیتے، جلسے جلوسوں اور تقریبات میں شرکت کرتے دن بھرپور انداز میں گزر رہے تھے۔ وہاں ایک بھرپور اور مصروف زندگی گزارتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا۔

ایک نوجوان کا عزمِ مصمم

"میں ناکام نہیں لوٹوں گا"

حکیم محمد سعید دہلوی کی ایمان افروز جگ بیتی جو پُرآسائش زندگی تج کر تہی دامن کراچی پہنچے، تن تنہا کئی مشکلات کا مقابلہ کیا اور ایک شاندار ادارہ کھڑا کرنے میں کامیاب رہے

ستار طاہر



شبانہ روز کی محنت اور سال ہا سال کی جدوجہد کامرانی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ ہمدرد ایک معمولی ادارے سے ایک مستحکم اور مضبوط و خوشحال ادارہ بن چکا تھا۔ روح افزا مشروب کے اشتہارات پہلی بار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں شامل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں کسی مشرقی مشروب کے اشتہار السٹریٹڈ ویکلی میں شائع ہونا تاریخ ساز واقعہ تھا۔

سب کچھ تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پھولوں کا بستر تھا، دولت تھی، شہرت کا آغاز ہو چکا تھا۔ عزت تھی، روایات میں رچی بسی زندگی، مکمل آزادی اور قلم رواں دواں تھا۔ فیصلوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے، وہ سب کچھ وہاں موجود اور نصیب تھا۔ حکیم محمد سعید آزاد و خودمختار شہزادے جیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بڑے بھائی کی ساری محبتیں ساری شفقتیں ان کے لیے تھیں۔ ان کی محبت ایک ضرب المثل بننے والی تھی۔

پھر یہ فیصلہ کیوں ہوا؟ ایک انوکھا فیصلہ جس میں ایک شہزادہ اپنی زندگی کا چلن بدل کر عام آدمی کی طرح محنت اور مشقت بھری زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ جن گلیوں، محلوں، گھروں اور بیرونوں میں زندگی بھرپور انداز سے گزر رہی تھی، انھیں چھوڑ، داغ جدائی دے کر، وہ اکیلا ایک نئے ملک میں وہ شہزادہ کیوں جا رہا تھا۔ یہ کیسا فیصلہ تھا؟

حکیم محمد سعید اوب کا سب جان گرانہیں تھے کہ مشکلات کی طرف کھنچے چلے جاتے، وہ جیتے جاگتے باشعور انسان تھے۔ زندگی کے گرم و سرد، تلخ اور ترش تجربات کا ذائقہ چکھ چکے تھے۔ دراصل وہ اپنی قوت ارادی آزمانا چاہتے تھے۔ بھارت میں اپنے آپ کو امتحان میں ڈال کر وہ اپنی صلاحیتوں اور قوت کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ وہ اپنی تقدیر خود لکھنا چاہتے تھے۔ ایک ایسے ملک میں اپنی صلاحیتوں کا امتحان لینا اور اپنی قوت ارادی آزمانا چاہتے تھے جو نیا اور بے سروسامان ملک اور ایک نومولود بچے کی طرح کمزور تھا۔

تمام دوست، احباب، رشتہ دار حکیم محمد سعید کو سمجھانے آئے۔ لیکن انھوں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا اور پھر ایک لمحہ آیا۔ حکیم محمد سعید کے استاد محترم قاضی سجاد حسین نے ان کے برادر بزرگ کو غم زدہ دیکھ کر کہا: "آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ چند دنوں کا بخار ہے۔ کراچی میں زیادہ دن قیام نہ ہو سکے گا۔ سعید میاں جلد اپنا فیصلہ بدل کر لوٹ آئیں گے۔ جب آرام و آسائش میسر نہ ہوں گے، تو زیادہ دن تک نہیں ٹک سکیں گے۔"

اتفاق سے یہ باتیں حکیم محمد سعید کے کان پڑ گئیں۔ وہ یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے مجھے بتایا: "اس لمحے میں نے اپنے دل میں کہا، میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔ اجنبی دیس، اجنبی شہر میں مجھ پر جو بیتے سو بیتے۔ میں ناکام اور مایوس ہو کر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

جڑیں

حکیم محمد سعید کے والد، حکیم عبدالمجید (۱۸۸۳ء۔۱۹۲۲ء) کی زندگی تجربات کا مرقع تھی۔ رزق و روزی کے حصول کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ادویہ کے خواص میں خاصی دلچسپی لی اور اس میں اس کمال تک مہارت حاصل کر لی کہ انھیں یہ موقع مل گیا کہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ ہندوستانی دواخانے میں ملازمت مل سکے۔ انھوں نے دواسازی کے شعبے میں جہاں نمایاں خدمات انجام دیں، وہاں اسے ایک نیا رخ بھی عطا کیا۔

رفتہ رفتہ ان میں وہ اعتماد اور قوت ارادی پیدا ہوئی جو ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انھوں نے بھی ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ وہ حکیم محمد اجمل خاں کے ہندوستانی دواخانے سے الگ ہوئے اور ہمدرد کی بنیاد ڈالی۔ راقم نے دہلی میں وہ چند فٹ کی دکان دیکھی جہاں حوض قاضی میں ہمدرد کی ابتدا ہوئی۔ اس دکان کو دیکھ کر جب ہمدرد کی اونچی بلند و بالا عمارتوں، مدینۃ الحکمت کراچی، ہمدرد یونیورسٹی تغلق

آج وہ پل کا خیال آیا، تو خدا کی شان، کہ سر کا انداز و ہوا، کہاں ایک چند فٹ کی دکان جہاں ہمدرد کا آغاز ہوا اور کہاں اب پاکستان اور بھارت کے بیسیوں شہروں میں ہمدرد کی عمارتیں! محنت، ہمت اور لگن سے اپنے آپ کو سنبھالنے والوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

کاروبار بہت محدود سرمائے سے شروع ہوا جو ایک سو روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ جب کاروبار میں وسعت پیدا ہوئی تو پھر اسے لال کنوئیں میں اس جگہ منتقل کر دیا گیا جہاں یہ اب موجود ہے۔ اس جگہ ہمدرد کے نئے دور کا آغاز ۲۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو ہوا۔ حکیم عبدالمجید نے شبانہ روز اس پر محنت کی تھی۔ یہ ان کی محنت شاقہ کا ثمر تھا۔ وہ اپنا مشن پورا کر چکے تھے۔ اب اسے آگے بڑھانا، نئی رفعتوں سے آشنا کرنا، فقید المثال بنانا، ان کے ان دونوں صاحبزادوں، حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کا فریضہ تھا۔ قدرت ان سے جتنا کام لے سکتی تھی، لے لیا۔ وہ اسی سال ۲۲ جون کو انتقال کر گئے۔ جب ۲۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو ہمدرد کے نئے دور کا نئے مقام سے آغاز ہوا، تو وہ جس نے ہمدرد کو اپنی روز و شب کی محنتوں سے اس مقام تک پہنچایا تھا، اس افتتاحی تقریب میں شرکت نہ کر سکے کیونکہ وہ بہت علیل تھے۔

شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی اپنی ایک کتاب ''مادر ہمدرد'' میں لکھتے ہیں:

''دواخانہ ہندوستانی کے ایام عروج میں، میں نے ایک صاحب کو دیکھا، دبلے پتلے، میانہ قد، گندمی رنگ کے بہت کم سخن دکاندار۔ وہ افرنجی کی ایک دکان دواخانہ ہندوستانی کے قریب چلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا پہلے دواخانہ ہندوستانی میں پندرہ روپے ماہوار کے ملازم تھے۔ مگر اب انھوں نے خود اپنا کام شروع کیا ہے۔ کسی نے کہا ''حکیم حاجی حافظ عبدالمجید کا دواخانہ کیوں کر چل سکے گا؟'' میں نے ہنس کر کہا: ''وہ تھری ایچ ہیں یعنی ایک ایچ حکیم، دوسرا ایچ حاجی اور تیسرا ایچ حافظ۔ بس جب راجا، نواب، ہز ہائی نس دو ایچ سے بڑے آدمی بن جاتے ہیں، تو یہ تین ایچ سے کیوں بڑے آدمی نہیں بنیں گے۔'' میں نے معترض سے کہا کہ حکیم حاجی حافظ عبدالمجید ارزاں فروش ہیں اور ادویہ ایمانداری اور دیانت داری سے بناتے ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور



میرے شعور کی آنکھ کھلی، تو پتا چلا کہ بعض اصحاب تقریباً روزانہ والد مرحوم (سید قاسم محمود) سے بغرض ملاقات آتے۔ ان میں جناب ستار طاہر بھی شامل تھے۔ وہ مجھے اکثر بچوں کی کتابیں تحفتہً دیتے، اس لیے ان سے ''دوستی'' ہو گئی۔ عموماً ان کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوتا اور وہ کش لگا لگا کر علمی و ادبی باتیں کرتے چلے جاتے۔

ستار طاہر (۱۹۴۰ء......۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء) ایک عمدہ ادیب اور منفرد مترجم تھے۔ قلم کاری واحد ذریعہ آمدن، اس لیے سیکڑوں کتب تخلیق و تصنیف کر ڈالیں۔ انھی میں تالیف کردہ ''حیات سعید'' بھی شامل ہے جس سے اخذ کردہ مضمون قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔

ممتاز ادیب، اشرف صبوحی دہلوی سے ستار طاہر کی یاد اللہ تھی۔ وہ اکثر انھیں عظیم پاکستانی، حکیم محمد سعید (۹ جنوری ۱۹۲۰ء......۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء) کے دلچسپ واقعات سنایا کرتے۔ واقعات سن کر ستار طاہر میں یہ امنگ پیدا ہوئی کہ وہ حکیم صاحب کی سوانح حیات مرتب کریں۔ چناں چہ وہ جانفشانی سے اس منصوبے پر کام کرنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خون جگر سے یہ کتاب تحریر کی اور اسے پاکستانیات ہی نہیں ادبی لحاظ سے بھی شہ پارہ بنا دیا۔ یہ منفرد سوانحی کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی پانچ سال بعد شقی القلب انسانوں نے حکیم صاحب کو بھی شہید کر دیا۔ (س ع م)

کامیاب ہو جائیں گے۔"

مادرِ ہمدرد

"ماں سے بڑھ کر کون نرمی، جفاکشی، سختی، محبت کرنے والا، فیاض، عظیم اور بہادر ہو سکتا ہے۔" چینی کہاوت۔

☆☆

حکیم حافظ حاجی عبدالمجید مرحوم کی خوش نصیب اور ہمہ صفت موصوف اہلیہ کا نام رابعہ تھا۔ حضرت رابعہ بصری کا جو درجہ اسلامی خواتین میں مانا جاتا ہے، یقیناً اس کی برکات کا اثر بیگم اہلیہ حکیم صاحب پر بھی پڑا۔ ۱۹۰۰ء میں بانی دواخانہ ہمدرد کا نکاح رابعہ بیگم سے ہوا۔ اس وقت حکیم حافظ عبدالمجید پندرہ روپے ماہوار کے ملازم تھے۔ اس واسطے مہر بتیس روپے طے ہوا۔ چونکہ بتیس روپے کا مہر شرعی کہلاتا ہے اس واسطے قدرت نے ان کی زندگی کی شہ رگ حیات کو بھی شریعت کا پابند بنا دیا۔

رابعہ بیگم شوہر کی زندگی میں بھی گھر کے سب کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد بھی انھوں نے گھریلو کاموں کے لیے کبھی کوئی عورت ملازم نہیں رکھی۔ ان کے انتظام کا یہ عالم تھا کہ روزانہ ملازم سے سبزی کے نرخ معلوم کراتیں۔ موسم کی جو سبزی سب سے کم نرخ کی ہوتی، وہی منگاتیں۔ مگر اس سے زیادہ قابلِ ذکر اولاد کی سعادت مندی ہے کہ مرحوم کے بچے کبھی یہ نہیں کہتے کہ انھیں فلاں چیز نہیں بھاتی یا یہ کیوں پکائی ہے؟ والدہ جو کچھ پکا کر سامنے رکھتی، بچے خوشی خوشی کھا لیتے۔

بانی ہمدرد کی وفات کے وقت سب سے بڑے لڑکے (حکیم عبدالحمید) کی عمر تیرہ برس تھی۔ اس واسطے ماننا پڑتا ہے کہ ہمدرد کو جو بے نظیر عروج حاصل ہوا، وہ سب مادرِ ہمدرد کی نیک نیتی اور حسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ پودے کے مخالف ہیں، انھیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس پردہ نشین خاتون نے گھر میں بیٹھے بیٹھے اولاد کو تربیت دی اور دواخانے کو بھی اس طرح چلایا کہ وہ دن دونی ترقی ہی کرتا رہا۔

جب دو سالہ حکیم محمد سعید کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے دادا جان، چچا جان اور ماموؤں نے ہمدرد پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ اس وقت یہ ان کی والدہ ہی تھیں جنھوں نے پردے میں رہ کر اس پودے کی آبیاری کی۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

"حکیم حافظ عبدالمجید کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہمدرد کے چاروں طرف فتنے جاگ اٹھے۔ حرص و آز کی ہر آنکھ وا ہو گئی۔ دادا اور چچا دعویدار بنے کہ ہمدرد ان کی ملکیت ہے۔ وہ بہر طور بیوہ مجید اور فرزندانِ ہمدرد کو ہر حق سے محروم کر دینے کے درپے تھے۔ دونوں ماموں جو ہمدرد میں بااختیار کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اب محنت کے صلے میں حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ہمدرد کو اپنے زیرِ نگیں رکھنا چاہتے تھے اور اپنے بااثر ہر ایک کو بے وزن اور بے وقعت رکھنے پر مُصر تھے۔"



حکیم محمد سعید کے والد، حکیم حافظ عبدالمجید

ایسے سازشی اور حرص و لالچ کے ماحول میں اس خاتون نے حالات کا بڑی بہادری اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ مولانا قاضی مشرف علی بدایونی جو ہمدرد کے ایک مخلص کارکن تھے، وہ سہارا بنے۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

"بالآخر ہماری آپا نے دلیرانہ فیصلہ کیا کہ دادا ابا اور چچا جان کا جو حق ہے، وہ انھیں ادا کر دیا جائے اور ماموں حافظ نور محمد کو ایک مؤثر کارکن کی حیثیت سے کام کی دعوت دی جائے۔ ان کا یہ بھی ایک مستحکم فیصلہ تھا کہ ان کی حیثیت قطعی طور پر ملازموں کی سی ہوگی اور ان کا حقِ محنت انھیں ادا کر دیا جائے گا۔ وقت آنے پر عبدالحمید پوری قطعیت کے ساتھ بااختیار ہوں گے۔"

مادر ہمدرد، مثالی خاتون تھیں۔ وہ زندگی بھر بڑی پابندی اور لگن سے نماز کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔ اخلاق کی کوتاہی کسی قیمت برداشت نہیں کرتیں۔ اس معاملے میں وہ بڑی سخت گیر تھیں۔ توازن قائم رکھنے کا ہنر بھی جانتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم سعید کے الفاظ میں "اگر ان میں یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں، تو اباجان کے انتقال کے بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا۔" حقیقت یہ ہے کہ ہمدرد کے قیام میں اپنے عظیم شوہر کی دست راست تھیں۔ خالص روغن بادام کے لیے وہ رات رات بھر بادام توڑ کر گریاں نکالا کرتیں۔ حبوب مقوی معدہ گولیاں سالہا سال اپنے ہاتھوں سے بناتی رہیں۔

زندگی میں انھوں نے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی اور ایک دن پردہ نہ چھوڑا۔ وہ بہت کفایت شعار تھیں۔ دن بھر کی آمدنی لے کر وہ تقسیم کرتی تھیں۔ اس آمدنی سے کچھ پیسے رکھ لیتیں۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ یوں وہ تھوڑی تھوڑی رقم الگ رکھتی رہیں۔ بالآخر وہ وقت آیا جب کاروبار کی توسیع کے لیے ایک عمارت کی خریداری ناگزیر ہو گئی مگر سرمایہ نہیں تھا۔ ایک رات ان کے شوہر تھکے ہارے گھر آئے۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ بیگم نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا:

"سامنے کی دکان خریدنی ہے۔ دلال نے جو رقم بتائی، وہ ہے نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا، کیا جائے۔"

وفا شعار دست راست بیوی سے اپنے شوہر کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ انھوں نے اپنی چارپائی سرکائی، پیچھے کی دیوار کو توڑا، اس میں سے ایک تھیلی نکالی۔ رقم کی گنتی ہوئی، تو دس ہزار سے اوپر چاندی کے روپے تھے۔

یوں کفایت شعار خاتون برسوں جو رقم بچاتی رہیں وہی رقم جوں کی توں شوہر کے حوالے کر دی۔ اس طرح وہ عمارت خریدی گئی جہاں لال کنوئیں پر ہمدرد قائم ہوا۔

حکیم محمد سعید لکھتے ہیں: "وہ زندگی بھر ہمیں انتہائی سستا کھانا کھلا کر جوان کرتی رہیں۔ مشہور تھا کہ رابعہ کے گھر جو پکے، تھوڑا

کہ وہ ترکاری ان دنوں سستی ہے۔ مگر وہ بڑی رقمیں پس انداز کر کے ضرورت مندوں کو خود جا کر خاموشی سے پہنچاتی رہیں۔"

برادرِ محترم

میانہ قدم، گندمی رنگ، گول چہرہ، خندہ پیشانی۔ اسی کے لگ بھگ تھے جب دہلی میں میری حکیم عبدالحمید سے ملاقات ہوئی۔ اب بھی بہت تیز چلتے تھے۔ حکیم محمد سعید کے استاد محترم قاضی سجاد حسین کے گھر مجھے خود لے گئے۔ ان کے تیز قدموں کے ساتھ میرے لیے قدم ملانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے انھیں بے حد سادہ اور انتھک پایا۔ بیس برس پہلے خواجہ حسن نظامی نے ان کے لیے لکھا تھا:

"صبح چار بجے پیدل ہوا خوری کے لیے چلے جاتے اور کئی میل کی چہل قدمی کر کے دواخانے آتے ہیں جہاں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بیمار ہر قوم و ملت کے عورت و مرد ان کے انتظار میں جمع ہوتے ہیں۔"

آتے ہی مطب شروع ہو جاتا۔ مطب سے فارغ ہو کر دوا سازی، دوا فروشی اور باہر کی ڈاک کی روانگی کے انتظامات گہری نظر سے دیکھتے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ میں نے کبھی انھیں لوگوں کے ہجوم سے گھبراتے نہیں دیکھا نہ کبھی انھیں کسی پر خفا ہوتے دیکھا۔

مطب کے لیے جس حاضر دماغی کی ضرورت ہے، خدا نے انھیں سب سے زیادہ دی۔ میں نے بے شمار چھوٹے بڑے حکیموں کو دیکھا ہے کہ بیماروں کے بے موقع اور بے عقل سوالوں سے انھیں غصہ آ جاتا۔ مگر حکیم عبدالحمید کے مطب میں بیٹھ بیٹھ کر ان کے مزاج کو چھلنی میں چھانا، مگر کبھی تیوری پر بل نہیں دیکھے۔ فرشتوں کو بھی کبھی نہ کبھی غصہ آتا ہی ہوگا، مگر حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کو میں نے کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔

دہلی میں اپنے قیام کے دنوں میں راقم الحروف نے حکیم عبدالحمید سے کئی ملاقاتیں کیں۔ میں نے انھیں بے حد مصروف، بے حد خلیق اور بے حد ذہین پایا، لیکن اپنی سادگی اور وضعداری کی بنا پر وہ ایک ایسے عظیم انسان تھے جنھیں اپنی

عظمتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ غالب کا ایک شعر دہلی میں اکثر حکیم عبدالحمید کو دیکھ کر یاد آتا رہا:

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کا تغافل میں جرأت آزما پایا

ایک نیا چیلنج!

حکیم عبدالحمید کا معمول تھا کہ وہ شام سے رات تک عطاری بھی کرتے۔ یہ کرسی جو عطار کے لیے مخصوص تھی، اس پر حکیم محمد سعید بھی ایک عرصے تک بیٹھے۔ رشتے داروں کے نئے ادارے ”ہمدم“ کی تقریب افتتاح کا اس روز لال کنویں بازار میں بہت چرچا تھا۔ جسے دیکھو وہاں جا رہا تھا۔ ہمدرد میں اس شام سناٹا تھا۔ حکیم محمد سعید بیان کرتے ہیں: اس سناٹے میں چند بچے سامنے سے گزرے۔ ان میں سے ایک نے آوازہ کسا: ”ہمدرد میں الو بول رہا ہے۔“

اس آوازے اور سناٹے کے باوجود حکیم عبدالحمید کے چہرے پر پریشانی دکھائی نہیں دی۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے اور وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ رشتے دار حریفوں کا ”ہمدم“ تو کیا کسی اور ادارے کا چراغ بھی ”ہمدرد“ کے سامنے نہ جل سکا۔

لوگوں نے مجھے بتایا کہ حکیم عبدالحمید دہلوی کی شخصیت کا حسن یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکالتے جو اخلاق و خلوص سے عاری ہو۔ وہ کسی کو برا نہیں کہتے۔ کسی کے خلاف دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے۔ دوسری بڑی خوبی جس کا ذکر سب نے کیا، یہ تھی کہ حکیم عبدالحمید دہلوی بہت سادہ انسان ہیں۔ وہ اور سادگی ہم معنی ہیں۔ زندگی کا جو سادہ چلن انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی عملی دور میں اختیار کیا تھا وہ اب تک اس پر عمل پیرا ہیں۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

”وہ ہمیشہ زمین پر سوتے ہیں۔ بستر گرمیوں میں چٹائی اور سردیوں میں ہلکی توشک۔ ان کی غذا سادہ، ان کا دفتر معمولی۔ ان کا اعتکاف خانہ جہاں بیٹھ کر انھوں نے عظیم کارنامے انجام دیے، کچی زمین ایک پرانی میز اور ٹوٹی ہوئی کرسی سے عبارت رہا ہے۔“

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اس قدر پابند وقت تھے، لوگ ان کی آمد و رفت پر اپنی گھڑیاں ملایا کرتے۔ حکیم عبدالحمید دہلوی بھی ایسے ہی وقت کے پابند ہیں۔ ان کی اس عادت کو بھائی حکیم محمد سعید نے بھی اپنایا۔ حکیم عبدالحمید کس حد تک وقت کی پابندی کرتے، اس کی مثال میں ایک واقعہ کافی ہوگا جس کے راوی حکیم محمد سعید ہیں:

دلی کی ایک گرم شام تھی۔ میں اپنے استاد مکرم سجاد حسین صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔ عمر میری یہی گیارہ بارہ برس ہوگی۔ اچانک کمرے کی چق اٹھی اور ایک بزرگ اندر تشریف

وزن میں اضافہ روکیے

تائیوان میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق چینی ادویات میں صدیوں سے استعمال کی جانے والی ایک کھمبی یا مشروم جانوروں کے وزن میں اضافہ روکنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ نیچر کمیونیکیشن نامی رسالے میں شائع ہونے والی تحقیق کے مطابق گانوڈرما لوسیڈم نامی کھمبی معدے میں موجود بیکٹیریا کو تبدیل کر کے وزن میں کمی کی وجہ بنتی ہے۔ محققین نے امید ظاہر کی ہے کہ اس کھمبی کو موٹاپے کے علاج میں بھی استعمال کیا جا سکے گا۔ چینگ گنگ یونیورسٹی کے محققین کا کہنا ہے کہ مذکورہ کھمبی روایتی طور پر طویل عمر اور اچھی صحت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس تحقیق کے دوران انھوں نے ایسے چوہوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جنھیں زیادہ چکنائی والی خوراک کھلائی گئی تھی۔ اس جائزے میں یہ بات سامنے آئی کہ کھمبی استعمال کرنے والے چوہوں کے وزن میں دیگر چوہوں کے مقابلے میں سات گرام کم اضافہ ہوا۔

لائے۔ پوچھا "حکیم صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو موجود نہیں کیا آپ کو وقت دیا تھا؟ میں نے سوال کیا۔"

"جی ہاں مجھے چھے بجے کا وقت دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے آپ تشریف رکھیے۔ اگر چھے بجے کا وقت دیا تھا، تو وہ ضرور تشریف لے آئیں گے۔"

بات صاف تھی، مگر مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے یہ بزرگ خفا ہو گئے اور اچھے خاصے خفا۔ فرمایا: اگر کیا چیز ہے۔ میں جو کہتا ہوں کہ چھے بجے کا وقت دیا تھا، یہ اگر کیا ہوتا ہے؟

ابھی یہ بزرگ خفا ہی تھے کہ چھے بج گئے اور حکیم عبدالحمید اپنے دفتر میں تشریف لے آئے۔ میں نے ان بزرگ کی راہنمائی کر کے حکیم صاحب کے پاس پہنچا دیا۔" یہ بزرگ مشہور شاعر حضرت سیماب اکبرآبادی تھے۔

حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کے والد مرحوم کی دلی تمنا تھی کہ ہمدرد انسانیت کی فلاح و بہبود کا ایک عظیم اور بین الاقوامی ادارہ بنے۔ ان کی بیگم نے اپنے بچوں کو اس راہ سے کبھی ہٹنے نہ دیا اور پھر ۱۹۴۷ء کے آغاز میں ہمدرد کو ذاتی ملکیت سے نکال کر قوم کے لیے ایک وقف بنا دیا۔ ہمدرد (بھارت) اور ہمدرد (پاکستان) اس اعتبار سے بھی دنیا کے منفرد عظیم ادارے ہیں کہ یہ وقف ہیں۔

حکیم محمد سعید کی تربیت میں انھوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ حکیم محمد سعید جو کچھ بنے، اپنے برادر بزرگوار کی تربیت کا نتیجہ ہی تھے۔ انھوں نے بھی اپنے بھائی کو آئیڈیل بنایا۔ ان کی تقلید کی اور اس طرح اپنے لیے نئی دنیا تعمیر کر لی۔ دونوں بھائیوں کی اخوت اور محبت کو الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ دہلی میں حکیم عبدالحمید دہلوی کے کئی رفقا نے بڑے دلچسپ انداز میں بتایا:

"حکیم محمد سعید جب دہلی آتے ہیں، تو دونوں بھائی گھنٹوں کمرے میں بند ہو کر نجانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ دن شام میں اور شام رات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

بھائی کے ساتھ محبت کی ایک مثال اس واقعے سے سامنے آتی ہے۔ دہلی میں کشمیری دروازے کے باہر ایک کوٹھی تھی۔ اس زمانے میں وہاں موٹر کار نیکیشن کا دفتر تھا۔ اسے حکیم عبدالحمید دہلوی نے دو لاکھ ۲۷ ہزار روپوں میں خریدا اور رجسٹری بھی ان کے نام ہوئی۔ حکیم محمد سعید کے ایک دوست نے انھیں کہا "مالک تو تم بھی ہو، پھر اکیلے عبدالحمید کے نام سے جائداد کی رجسٹری کیوں ہوئی؟" حکیم محمد سعید نے مفہوم و مطلب پوری طرح سمجھے بغیر یہی بات اپنی والدہ سے کہہ دی۔ انھوں نے یہ بات بہت احتیاط کے ساتھ حکیم عبدالحمید دہلوی تک پہنچا دی۔ حکیم محمد سعید سمجھے کہ میں نے بات کہہ دی اور بات ختم ہو گئی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی فروخت کر دی گئی اور کچھ منافع بھی ہوا۔ اس کی تمام رقم سے حکیم عبدالحمید نے تمام جائداد حکیم محمد سعید، اپنے چھوٹے بھائی کے نام سے خریدی اور ساری ملکیت بھی ان کے نام کر دی اور کبھی ایک حرف بھی اپنے چھوٹے بھائی سے نہ کہا۔

بھائیوں کی یہ جوڑی، اس دنیا میں حیران کن تھی جہاں دولت اور جائداد کے لیے بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے اور زندگی کے درپے۔ ان کی محبت بے مثل تھی۔ دونوں بھائی ایک جان، دو قالب کی طرح رہے۔

حکیم محمد سعید کے بچپن میں پیش آیا ایک واقعہ انھیں ہمیشہ یاد رہا۔ حافظ سید عمر دراز علی نے حکیم محمد سعید کو حفظ قرآن مجید کرایا تھا۔ ان کا دماغ کچھ کمزور تھا اور کبھی کبھی ان پر صرع (مرگی) کا سخت دورہ پڑ جایا کرتا۔ ایک بار ان کے خلاف کسی نے رپورٹ کر دی کہ وہ بچوں سے فیس لیتے ہیں حالانکہ تعلیم مفت تھی۔ حافظ صاحب کی تنخواہ بند کر دی گئی۔ اب ان کی ضروریات کا سارا دارومدار بچوں ہی پر رہ گیا جو ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید نے اپنی والدہ سے کہا، تو

انھوں نے ان کا وظیفہ غالباً تین روپے ماہانہ کر دیا۔ کچھ نہ کچھ دوسرے بچے بھی دینے لگے، لیکن گزر اوقات مشکل سے ہوتی۔ مرگی کے دورے بھی زیادہ پڑنے لگے۔ حسن نامی ایک طالب علم ان سے پڑھنے آتا تھا۔ ایک دن اسے سبق یاد نہیں تھا، حافظ صاحب نے سزا دے دی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

حسن نے گھر جا کر اپنے والد مقبول سے شکایت کی۔ وہ تشریف لائے۔ انھوں نے حافظ صاحب کو سخت سست کہا اور ایک طمانچہ بھی جڑ دیا۔ وہاں موجود نمازی بہت بے قرار ہوئے۔ مقبول صاحب اس کارنامے کے بعد گھر گئے، تو گھر کی عورتوں نے انھیں حافظ صاحب سے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوئی نذرانہ لے کر معافی مانگنے گئے جسے حافظ صاحب نے قبول کرنے سے انکار کیا اور انھیں معاف کر دیا۔ دوسرے دن مقبول صاحب کی اہلیہ کا اسقاط حمل ہو گیا۔ پورے خاندان نے کہا: ”حافظ جی کے ساتھ زیادتی کی یہی سزا ہے۔“

۱۹۲۷ء میں انھوں نے پہلی بار حج کیا جب ان کی عمر سات برس کے قریب تھی۔ حکیم محمد سعید کو اس حوالے سے ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا: ”اسی کراچی میں جہاں آج میں رہتا ہوں، حج کو جاتے ہوئے (۱۹۲۷ء میں) جب ہمارا قافلہ کراچی میں مقیم ہوا، تو میری شرارتوں پر بخار میں بھتا بھائی جان نے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا تھا اور میرا پیشاب خطا ہو گیا۔ شاید وہ پہلا اور آخری طمانچہ تھا۔“

میدانِ عمل

۹ جنوری ۱۹۲۰ء حکیم محمد سعید کا یوم پیدائش ہے اور ۹ جنوری ۱۹۴۰ء کو انھوں نے ہمدرد میں کام کا آغاز کیا۔ اب وہ مستند طبیب اور صحافت کا آغاز کر چکے تھے۔ دوا سازی میں عملی حصہ، تو انھوں نے بچپن میں اپنی بہنوں کے ساتھ گولیاں بنا کر ہی لینا شروع کر دیا تھا۔ والدہ ماجدہ کی ذات گرامی بھی ان کے سامنے تھی جو رات بھر جاگ کر بادامیوں کی پڑیاں نکالتی۔

پھر ان کے سامنے اپنے عظیم بھائی حکیم عبدالحمید کی محنت شاقہ، تدبر اور جانفشانی کی زندہ مثال موجود تھی۔ اب وہ ان کے شانہ بشانہ ہمدرد کو مثالی اور مضبوط و مستحکم ادارہ بنانے کے لیے میدان عمل میں اتر آئے۔ طبیب بننے کے بعد اب وہ شام کو دواخانے میں بیٹھ کر مطب بھی کرنے لگے جہاں انھوں نے بھی عطاری کی تربیت حاصل کی تھی۔ حکیم عبدالحمید دہلوی نے مجھے بتایا: ”اور پھر ۱۹۴۲ء میں میں نے میاں سعید کو سب کچھ سونپ دیا۔“


حکیم محمد سعید لیبارٹری میں مصروف ہیں

مکمل اختیارات سنبھالنے کے بعد وہ پچھے ماہ تک ہمدرد کی عمارت سے باہر نہیں نکلے۔ رات دن کام کرتے۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کیے۔ ہمدرد کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ انتہائی مہارت سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ دواؤں کی پیکنگ پر جھنجھتے، تو ماہر کارکن کو بہ اد دیتے۔

حکیم محمد سعید نے مجھے بتایا کہ وہ امام غزالی سے بہت متاثر تھے۔ امام غزالی نے بھی جس کا جو نظریہ پیش کیا ہے، وہ اس کے عامل رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اپنی عملی زندگی سے وہ

چھ مہینے جن میں انھوں نے ان تھک کام کیا، چنے والے پانی کے سوا کچھ نہیں پیا۔ یوں انھوں نے اپنے اندر کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔

ان تھک محنت کی وجہ سے والدہ محترمہ نے انھیں "جن" کا خطاب دیا جو کام کرنے سے تھکتا ہی نہیں تھا۔ بڑی ہمشیر کہتی تھیں: "جو کام نہیں ہوتا، وہ اس جن کے حوالے کر دو، ہو جائے گا۔"

حکیم محمد سعید نے ہمدرد کے کاروبار، مصنوعات اور انتظام کو انقلاب آشنا کیا۔ جدید انداز میں پبلسٹی کا کام شروع ہوا جس کا طب مشرق کی دنیا میں کوئی رواج تھا نہ تصور۔ انھوں نے السٹریٹڈ ویکلی جیسے معتبر جریدے میں پورے صفحے کا رنگین اشتہار دیا۔ ۱۹۴۲ء میں السٹریٹڈ ویکلی کے ایک صفحے کا نرخ دو ہزار سات سو روپے تھا۔ تب ہمدرد کی تیس سے زیادہ اہم مصنوعات ایجاد ہو چکی تھیں۔ طبی دنیا میں تشہیر کا سب سے خوب صورت، بامعنی اور کارآمد آغاز حکیم محمد سعید کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک ہمدرد ایشیا میں دواسازی کا سب سے بڑا کارخانہ بن چکا تھا۔

محبت..... رومانس..... ہاں، حکیم محمد سعید کے دل پر بھی کیوپڈ کا تیر لگا۔ وہ دہلی میں تھے۔ جوان رعنا اور طبیب بن چکے تھے۔ تب نیوزی لینڈ کی ایک خاتون علاج کے لیے ان کے پاس آئیں۔ حکیم محمد سعید کو اچھی لگیں اور انھوں نے اپنے دل میں محبت کی کسک محسوس کی۔

حکیم محمد سعید اس بات میں زیادہ کھلے نہیں تاہم میرے سوال کا جواب بھی نہیں ٹالا۔ مجھ بات بھی اس طرح پوری کر دی کہ اختصار کے باوجود مجھے کسی تفصیل کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ اس غیرملکی خاتون سے شادی کے خواہاں تھے، لیکن خاندانی روایت، والدہ اور بڑے بھائی کا احترام، محبت سے بھی کہیں زیادہ اہم اور عزیز تھا۔ محبت کی یہ داستان ادھوری رہی۔ وہ خاتون بھی شادی کے لیے آمادہ تھیں، لیکن حکیم محمد سعید نے انھیں سمجھا دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یوں محبت کا یہ قصہ تمام ہوا۔

حکیم محمد سعید کی شادی ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ شریک حیات ان کی خالہ زاد تھیں اور نام نعمت بیگم تھا۔ وہ بہت ایثار پیشہ خاتون ثابت ہوئیں۔

جب حکیم محمد سعید کراچی آئے اور ہندوستان کی شہرت چھوڑ کر پاکستانی بنے، تو شریک حیات ان کے ساتھ تھیں۔ ڈھنگ کا ٹھکانا تھا نہ دہلی جیسی آسائشیں اور مسائل کا پہاڑ سر پر کھڑا تھا۔ تمام مسائل میں وہ کسی شکایت کے بغیر شوہر کے ساتھ تکلیفیں برداشت کرتی رہیں۔ وہ جن کو ہر چیز فراواں میسر تھی، اب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ صابر و شاکر اور خدمت گزار بیوی نے حق رفاقت ادا کر دیا۔ کاروبار اور قیام ہمدرد کے لیے زیور کی ضرورت پڑی۔ نیک بیوی نے تمام زیور خاوند کے سپرد کر دیا حالانکہ خاوند نے اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ اب یہ شاید کبھی واپس نہ ملے۔ اس خاتون نے زندگی بھر نہ زیور مانگا نہ پہنا۔ اگر انھوں نے کبھی کہا تو جواب دیا: "جو زیور پہننا تھا پہن لیا، اب ضرورت نہیں رہی۔"

اس نیک، صابر اور خدمت گزار بی بی نے اپنے باہمت شوہر کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یقیناً ان سے زیادہ شاید ہی کوئی اور اتنا خوش ہوگا کہ انھوں نے عظیم شوہر کی کامیابیوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کامرانیوں میں ان کا ایثار بھی شامل تھا۔

حکیم محمد سعید کی اہلیہ نعمت بیگم نے اڑتیس برس تک ایسا حق رفاقت ادا کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ زندگی بھر انھوں نے خاندانی اور گھریلو معاملات اس انداز سے سنبھالے رکھے کہ حکیم محمد سعید کو اس طرف سے کبھی کوئی فکر نہ ہوئی۔

ان کے ہاں تین بیٹیاں تولد ہوئیں۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے خود حکیم محمد سعید کی مرحوم اہلیہ انھیں مشورہ دیتی رہیں کہ دوسری شادی کر لیں، لیکن انھوں نے ہمیشہ اس مشورے کو مسترد کر دیا۔ بیگم کے انتقال کے بعد بھی دوسری شادی نہیں کی۔ ان کی بیگم مثالی وفادار اور خدمت گزار بیوی تھیں۔ حکیم

محمد سعید نے مجھے بتایا:

"نعمت بیگم کے ساتھ میری رفاقت کوئی اڑتیس سال رہی۔ مجھے ایک شب بھی ایسی یاد نہیں کہ وہ مجھے سلائے بغیر سوئی ہوں۔ وہ بیمار ہونا نہیں جانتی تھیں، اس لیے ناغے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں میرا طرزِ زندگی بدل گیا۔ میں راتوں کو گھر دیر سے آتا، کبھی بارہ ایک بھی بج جاتا۔ گھر سے جاتا، تو انھیں بتا دیتا کہ میرا انتظار نہ کرنا، آرام سے سو جانا۔ وہ پختہ وعدہ کرتیں، میں مطمئن ہو جاتا۔ مگر جب رات گئے گھر آتا، تو دیکھتا کہ وہ مصروفِ عبادت ہیں اور میری منتظر۔ میں کھانا نہ کھا کر آتا، تو وہ کھلاتیں۔ نماز عشاء ادا کرتا اور وہ مجھے سلا کر پھر سوتیں۔

***

وہ پہلی بار جولائی ۱۹۸۱ء کو بخار میں مبتلا ہوئیں۔ بخار ایک ٹخنے کے معمولی پھوڑے کی وجہ سے تھا۔ میں نے ان کو اسپتال بھیج دیا بلکہ ڈاکٹر بقائی صاحب عید سے دو دن پہلے لے گئے کہ چاند رات کو آ جائیں گی۔ مگر وہاں سے ایسی گئیں کہ چودہ روز میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ ۱۸ اگست ۱۹۸۱ء کو دن دو بجے اللہ کو پیاری ہوئیں۔"



محترمہ نعمت بیگم

سعدیہ بیٹی

حکیم محمد سعید ایک باپ بھی رہے، ایک بیٹی کے باپ۔ سعدیہ ان کا نام ہے جو اب بیگم راشد منیر احمد ہیں اور تین بیٹیوں کی ماں۔ بیٹی کی تربیت و پرورش میں حکیم محمد سعید نے اپنے اصولوں کو سامنے رکھا جو قدرے سخت تو ہیں، لیکن زندگی کو صحیح سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

سعدیہ راشد منیر ایم اے عمرانیات ہیں۔ انھیں اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ والدہ بہت نرم خو تھیں اور اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتیں۔ ان کی آمد سے پہلے گھر کا کام ختم کر لیتیں تاکہ حکیم صاحب کے سکون میں کوئی خلل نہ پڑے۔ حکیم صاحب کی خوشنودی اور سکون کا پورا خیال رکھتیں۔

گھریلو اخراجات کے لیے کبھی پیسے نہ مانگے۔ مگر حکیم صاحب نے بھی تنگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ گھر میں کار تھی، لیکن حکیم صاحب اپنی بیٹی کو بس سے اسکول بھیجتے۔ سعدیہ صاحبہ نے بتایا:

"وقت کی پابندی اور تربیت کے سلسلے میں بہت سخت تھے۔ چھوٹی عمر ہی سے آنے جانے پر وقت کی پابندی لگا دی گئی۔ پانچ بجے کا نوٹس تھا کہ اس سے پہلے گھر میں موجود ہونا چاہیے۔ اسی طرح رات کو سونے اور صبح جاگنے کے اوقات بھی طے تھے۔

وہ محبت کا اظہار زبانی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ سوتے میں پیار کرتے۔ سوتے میں ہاتھ لگ گیا، تو ہاتھ بڑی آہستگی سے اٹھا دیا۔ وہ تاثر سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔"

حکیم صاحب نے اپنی بیوی سے کبھی کوئی شکایت کی نہ بیٹی سے۔ دال میں نمک تھا، نہیں تھا، شکایت نہیں کی۔ جو کھانے کو مل گیا، کھا لیا۔ کبھی بیٹی یا بیگم کو تکلیف نہ پہنچائی۔ بیٹی کی تربیت اور آرام کا پورا خیال رکھا، لیکن بگاڑا نہیں۔ محبت کا اظہار زبان نہیں تاثرات سے کیا۔

سعدیہ کو اچھی طرح یاد ہے جب وہ بچپن میں زینے سے گر گئیں۔ دانتوں سے خون بہنے لگا، تو انھوں نے دیکھا کہ والد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر وہ سخت سزا بھی دیتے تھے۔ ایک بار سعدیہ نو سے بارہ بجے والی فلم دیکھنے چلی گئیں، تو انھوں نے چھے ماہ کے لیے فلم دیکھنے پر ہی پابندی لگا دی۔

۱۹۸۰ء میں سعدیہ صاحبہ نے ہمدرد میں شمولیت اختیار کی۔ انھوں نے حکیم صاحب کی تصنیف "میڈیسن ان چائنا"

کی پروف ریڈنگ کی۔ ہمدرد نونہال کے لیے بھی کام کیا۔ معمول کی خط کتابت کی۔ حکیم صاحب کی سیکرٹری بھی رہیں۔

دنیا بدل رہی تھی

پاکستان کے قیام کو انسانی تاریخ میں معجزہ ہی کہا جائے گا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم جدوجہد، قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں خواب سے حقیقت بن گئی۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں کہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے اس تاریخی جلسے میں شریک تھے جس میں مسلم لیگ کے پرچم تلے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ قائداعظم کی تقریریں سننے کا بھی انھیں اتفاق ہوا۔ ان دنوں سیاسی حالات اور اتار چڑھاؤ کی وجہ سے قائداعظم اکثر دہلی میں رہتے تھے اور وہیں ایک کوٹھی خرید لی۔ اس لیے مختلف جلسوں اور مواقع پر حکیم محمد سعید نے قائداعظم کو دیکھا اور سنا۔

حکیم محمد سعید نوجوان اور گرم جوش تھے۔ حالات کا بغور جائزہ لیتے۔ وہ ساری صورت حال سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتے تھے۔ مسلمانوں نے جس طرح برصغیر میں اپنی قوت اور حیثیت کو تسلیم کرایا، یہ ایک عظیم کارنامہ تھا جس پر مسلمانوں کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ حکیم محمد سعید اس احساس تفاخر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں رکھ سکے۔

پاکستان آنے کا فیصلہ کیا بھارت سے فرار تھا؟ نہیں! اس فیصلے کے پس منظر میں کئی اسباب کارفرما تھے۔ حکیم محمد سعید بھارتی حکومت کے وفادار نہیں رہ سکتے تھے اور منافقت ان کے مزاج میں نہیں۔ اس لیے انھوں نے آرام و عیش کی زندگی چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ اب وہ پاکستان کے لیے جینا چاہتے تھے۔ پاکستان کو مضبوط، مستحکم اور خوشحال بنانے میں اپنا گراں قدر حصہ ڈالنا چاہتے تھے۔

تعمیر نو۔ جہانِ نو

فیصلہ ہو چکا تھا اور روانگی کی گھڑی آ گئی۔ ۹ جنوری ۱۹۴۸ء، دہلی پالم کے ہوائی اڈے پر حکیم عبدالحمید اپنے چھوٹے بھائی کو خدا حافظ کہنے موجود اور بہت اداس تھے۔ وہ اور دونوں بھائیوں کے مشترکہ احباب اور عزیز جتنا سمجھا سکتے تھے، سمجھا چکے۔ فیصلہ اٹل تھا۔

وہ لمحے یقیناً حکیم محمد سعید کے لیے بہت کربناک تھے۔ شاندار ماضی وہ چھوڑنے والے تھے۔ حال غیر یقینی تھا اور مستقبل دھندلا۔ دل میں عزائم تھے، بے پناہ عزائم مگر آئے ہاتھ خالی تھے۔

کراچی ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ بچپن میں بھی وہ ایک بار کراچی آئے تھے۔ اس کے بعد بھی دو ایک بار کراچی آنا ہوا، لیکن تب قیام عارضی تھا۔ اب انھیں اس شہر میں مستقل آباد ہونا اور وہیں قسمت آزمائی کرنی تھی۔ انھوں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ جب تک وہ کامیابی کی رفعتوں کو نہ چھو لیں دہلی واپس نہیں جائیں گے۔

حکیم محمد سعید نے بتایا:

"چونکہ ہمدرد ہندوستان وقف بنا دیا گیا تھا، سو اس کے ذرائع کو شرعاً و اخلاقاً پاکستان منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک مکان کراچی میں کرائے پر لیا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایک ہندو جو دہلی جا رہا تھا، اس سے وہ رقم لی جو بھائی جان نے اسے لوٹائی۔ یوں کراچی میں رہنے کا ٹھکانا بنا۔ گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ تکیے تک نہ تھے جو بعد میں نے نہالچوں سے تیار کیے گئے۔"

اب شہر کراچی تھا اور حکیم محمد سعید۔ انسان کے پاس اگر صلاحیتیں ہوں تو بہت تھوڑے سے وسائل موجود ہونے ضروری ہیں۔ کوئی سواری نہیں تھی، پیدل کراچی میں گھومنا شروع کیا۔ تلاش یہ تھی کہ کوئی جگہ مل جائے، تو دواخانہ کھول لیں۔ دواخانہ شروع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ مہینا بھر سخت کشمکش رہی۔ کوئی بات بن نہیں رہی تھی۔ جوتوں کے تلے گھس گئے اور ان میں سوراخ بن گئے۔ گھنٹوں میلوں پیدل چلتے

حالانکہ دہلی میں اپنی پیکارڈ کار تھی جو وقتی اس زمانے میں رئیسوں کی سواری تھی۔

حالات نے بہت کچھ سکھایا اور بہت کچھ آزمایا۔ ان دنوں حکیم محمد سعید نے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ صبح ان کے لیے موٹا پراٹھا پکایا کریں۔ فرمائش کے پیچھے یہ عجلت اور ضرورت کارفرما تھی کہ سارا دن وہ پیدل چلتے تھے، سو بھوک جلد لگ جاتی۔ اس لیے انھوں نے موٹے پراٹھے کی فرمائش کی تاکہ دیر میں ہضم ہو اور بھوک بھی دیر سے لگے۔

ہر لمحہ مصروف رہنے والے انسان کی زندگی کا یہ نادر دور تھا کہ وہ ڈیڑھ پونے دو ماہ بے کار رہا۔ اس بے کاری میں بھی مصروفیت تھی کہ پورا کراچی شہر چھان مارا۔ معمولی ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر یہ مرد آہن بھارت میں بڑی جائداد چھوڑ کر آیا تھا۔ اس جائداد سے حکیم عبدالحمید نے یہ عظیم کام کیا کہ انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسلامک سٹڈیز قائم کر دیا۔ حکیم عبدالحمید کو علم تھا کہ بھائی کچھ لے کر نہیں گیا۔ حالات کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے نونہال گرائپ واٹر کی دس ہزار شیشیاں کسی کے ہاتھ کراچی بھجوا دیں۔


محترمہ سعدیہ راشد

اب دکان کی ضرورت مزید بڑھ گئی۔ نونہال گرائپ واٹر کی شیشیاں خود بیچنے نکلے۔ کراچی کا کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ پیدل نہ گھومے ہوں۔ ایسے حالات میں ان کی ملاقات ایک پارسی سیٹھ سے ہوئی جس کا نام ڈنشا تھا۔ اس نے حکیم محمد سعید کی پریشانی بھانپ لی اور پوچھا: ''کیا بات ہے، بہت پریشان لگتے ہو؟''

حکیم محمد سعید نے مدعا بیان کیا کہ انھیں ایک کمرے کی ضرورت ہے اور وہ پگڑی نہیں دے سکتے۔ ڈنشا نے انھیں پچاس روپے ماہانہ پر کمرا دے دیا اور پگڑی نہیں لی۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں: ''یہ اس کا احسان تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔'' انھوں نے ساڑھے بارہ روپے کرائے پر فرنیچر لیا۔ جب دکان تیار ہو گئی، تو طب کا کام شروع کر دیا۔

اب دوسرا مسئلہ درپیش تھا۔ دواسازی کے لیے بھی جگہ چاہیے تھی۔ پہلے سوچا کہ قصر پر اس کا آغاز کیا جائے، لیکن یہ تو مناسب تھا اور نہ ممکن! کراچی میں اسپیکر سندھ اسمبلی سید میراں محمد شاہ سے ان کی گہری دوستی تھی۔ انھوں نے کہا، جو کام ہو مجھ سے کہنا۔ جناب سید میراں محمد شاہ کی دوستی اپنی جگہ اور حکیم محمد سعید کی اصول پرستی اپنی جگہ۔ بہرحال حکیم محمد سعید کہتے ہیں: ''سید میراں محمد شاہ نے انھیں کسی دوسرے کے پاس جانے نہیں دیا۔'' یہ ان کا احسان تھا، ناقابل فراموش احسان!

آرام باغ روڈ پر سول اسپتال کے قریب ایک دھرم شالہ تھا۔ سوچا کہ یہ جگہ مل جائے، تو وہاں دواسازی کا کام شروع ہو سکتا ہے۔ پوچھ پاچھ سے معلوم ہوا کہ یہ کام میئر جمشید نسروانجی مہتا کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وہی اس کے انچارج تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے گئے، تو ایک گھنٹے قطار میں بیٹھنا پڑا۔ حکیم محمد سعید اپنی باری پر ملے۔ ساتھ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے شمارے لے گئے تھے جس میں ہمدرد کی مصنوعات کے اشتہارات شائع ہوا کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید نے انھیں یہ شمارے دکھائے اور اپنے شاندار ماضی کا ذکر کیا اور کہا:

''آپ تعاون کریں، تو میں اس انداز سے پاکستان میں بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔''

میئر بہت خوش ہوئے۔ یوں دواسازی کے لیے جگہ ملنے کی سبیل پیدا ہو گئی۔ سارا ماجرا سید میراں محمد شاہ کو بھی بتا دیا

گیا، کیوں کہ اس سلسلے میں انھوں نے حکیم محمد سعید کی بہت اعانت کی تھی۔

دھرم شالہ کی بالائی منزل پر اب تک ہندو آباد تھے۔ انھیں نچلی منزل مل گئی۔ یوں ایک اور مشکل آسان ہو گئی۔ مگر مسائل کے انبار تھے۔ اب یہ بھی تو مسئلہ تھا کہ دوائیں بنیں گی تو بکیں گی کہاں سے؟ حکیم محمد سعید بتاتے ہیں: "فریر روڈ پر ایک کھدر کی دکان تھی۔ اس زمانے میں، میں خود کھدر پوش تھا۔ وہاں گئے تو انھیں بتایا گیا کہ دکان مل سکتی ہے لیکن پورے مال سمیت لینی ہوگی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے قیمت بتائی گئی۔

نونہال گرائپ واٹر کی شیشیاں وہ بیچ چکے تھے، اس لیے دکان لے لی گئی۔ اب یہ سکون حاصل ہو گیا کہ ایک جگہ دوائیں تیار ہوں گی تو انھیں فروخت کرنے کا مقام بھی میسر آ گیا۔ جلد ہی کام کرنے والے ساتھ مل گئے۔ مشین بھی مل گئی۔ یوں کام شروع ہوا۔ حکیم محمد سعید نے بتایا: "جس مشین نے دواسازی کا کام شروع کیا، وہ آج بھی محفوظ ہے۔"

چینی کا حاصل کرنا بھی بڑا مسئلہ تھا۔ ہزاروں من چینی استعمال کرنے والے کے لیے صرف دس سیر چینی ملنے کے لیے منظور ہوئی کہ راشن بندی تھی۔ حکیم محمد سعید نے مہنگے داموں چینی خرید کر کام چلایا۔ کچھ ایسے لوگ اس زمانے میں ملے جو پیسے کھا کر ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ ایسے لوگوں کا ذکر سرسری کرتے اور آگے نکل جاتے۔

روح افزا کی پہلے دن ۳۲ بوتلیں تیار ہوئیں۔ حکیم محمد سعید کا بیان ہے: "گلاب کیوڑہ اور عرقیات سے بازار مہک اٹھا۔ لوگ خود بخود آ گئے۔ بیک وقت ساری بوتلیں بک گئیں۔"

لیکن جب تک یہ کام شروع ہوا، اس سے پہلے کے دن بہت اذیت ناک تھے۔ ڈیڑھ پونے دو سال تک وہ ایسے حالات سے گزرے کہ دو وقت کا کھانا ملنا بھی غیر یقینی ہو گیا۔ جوتے گھس گئے۔ روزانہ شیروانی دھوتے۔

ایسے دنوں میں انھیں خیال آیا کہ روزگار کی کوئی سبیل

سخاوت اور بہادری

ایک حکیم سے کسی نے پوچھا کہ سخاوت اور بہادری میں سے کون سی چیز بہتر ہے؟ حکیم نے جواب دیا۔ "جس میں سخاوت ہے، اس کو بہادری کی ضرورت نہیں۔"

بہرام گور کی قبر پر لکھا ہوا ہے کہ سخاوت کا ہاتھ طاقت و بازو سے بہتر ہے۔ حاتم طائی نہیں رہا لیکن اس کا نام ہمیشہ نیکی میں مشہور رہے گا۔ مال کی زکوٰۃ نکالتا رہ، کیوں کہ مالی انگور کی بے کار شاخیں کاٹ پھینکتا ہے تو انگور زیادہ آتا ہے۔

(شیخ سعدی شیرازی، انتخاب: فراز احمد سلیم، لاہور)

کرنی چاہیے۔ عبداللہ ہارون یتیم خانے کے ایک اسکول میں ملازمت کا ارادہ کیا۔ وہاں حاضری دی، بتایا کہ حافظ قرآن ہوں۔ ان سے قرآن پاک سنا اور پھر کہا گیا کہ جگہ خالی نہیں۔

کراچی کوتوالی (سول اسپتال کے قریب) ایک اسکول تھا۔ حکیم محمد سعید وہاں بسلسلہ ملازمت گئے تو چوکیدار نے اندر جانے سے روک دیا۔ چوکیدار نے کہا کہ وہ جس خراب حالت میں ہیں، اس میں ہیڈ ماسٹر سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اسکول میں کپڑے پر دھبا تک ہوتا تو طالب علم کو داخلہ نہیں ملتا تھا۔ غریب لوگوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ حکیم محمد سعید نے تیل اور پانی سے جوتے صاف کیے، پالش نہیں تھی اور نہ کروانے کی ہمت تھی۔ بہرحال ہیڈ ماسٹر سے ملاقات ہوئی۔ انھیں وہاں بھی ملازمت نہ ملی اور پھر زمانہ بدلا۔ حکیم محمد سعید بتاتے ہیں:

"اسی اسکول میں سیرت کے ایک جلسے میں مجھے بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ اب اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ وہی اسکول جہاں بغیر پالش کے جوتے پہننے والوں کو اندر آنے نہیں دیا جاتا تھا، اب گندا اور ابتر ہو چکا تھا۔ میں نے

اس کے لیے فرنیچر بنوا کر دیا۔ مسجد کو ایئر کنڈیشنڈ کروایا۔"

حالات بدل رہے تھے۔ کام چل نکلا لیکن ابھی بہت سی دشواریوں کا سامنا تھا۔ ایک بار پولیس نے سارا سامان مطب سے نکال کر ہندوؤں کو اندر بٹھا دیا۔ ڈی ایس پی سے حکیم محمد سعید نے کہا کہ یہ غیر قانونی حرکت ہے۔ بہر حال یہ معاملہ بھی ختم ہوا۔ ڈی ایس پی کا اصرار تھا کہ اس نے قانون کی پاس داری کی ہے۔

اللہ کی قدرت کہ وہی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، حامد حسین بعدازاں ہمدرد میں بہ حیثیت پروٹوکول افسر ملازم ہوئے جنھوں نے مطب کا سامان زبردستی باہر پھنکوا دیا تھا۔ مگر حکیم محمد سعید ان کا اس لیے بہت احترام کرتے کہ انھوں نے قانون کی پاسداری کی تھی۔

مطب میں استحکام پیدا ہوا۔ لوگوں کی لمبی قطاریں لگنے لگیں۔ وہی جمشید نسروانجی مہتا جنھوں نے انھیں جگہ دلوائی تھی، وہ بھی ایک دن قطار میں بیٹھے دکھائی دیے۔ اپنی باری پر اندر آئے۔ نبض دکھائی، نسخہ لکھوایا اور دوائی لیے بغیر چلے گئے۔ دراصل وہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ کیا کام صحیح چل رہا ہے۔ کام کی رفتار دیکھ کر مسرور ہو کر چلے گئے۔

مسئلے زیادہ اور بے پناہ تھے۔ کام کا چل نکلنا باعث تسکین نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ تو ہمدرد کی پاکستان میں تعمیر نو اور نئی بستیاں آباد کر رہے تھے۔ اب بڑی فیکٹری کے لیے کراچی کی نئی بستی میں جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو کا آغاز ہوا۔ نواب محمد اسماعیل کے بڑے صاحب زادے، جی۔ اے مدنی نے اس سلسلے میں خاص اعانت کی۔ ان دنوں کراچی میں نئی سوسائٹیاں بن رہی تھیں۔ انہی میں ناظم آباد بھی شامل تھی۔ فیکٹری کا نقشہ بنا۔ اب تعمیر کا مرحلہ تھا۔ بیوی سے اس کا زیور لیا۔ بھلی مانس نے سارا زیور دے دیا۔ حالانکہ انھیں کہہ دیا گیا تھا کہ یہ اب دوبارہ نہیں بن سکے گا۔

زیور لے کر حکیم محمد سعید اپنے دوست، حاجی عبداللہ بنگالی کے ساتھ جوتا مارکیٹ گئے اور سناروں کے پاس فروخت کر دیا۔ یوں ہمدرد کی فیکٹری ناظم آباد میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد ہمدرد کی توسیع اور نئے نئے منصوبوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ یوں حکیم محمد سعید نے پاکستان میں ہمدرد کی تعمیر نو کی اور اپنی بستی محنت اور دیانت سے بسائی۔

حالات بہتر ہوئے، تو حکیم محمد سعید نے اپنے بھائی حکیم عبدالحمید کو بھی وہ سب کچھ لوٹا دیا جو پاکستان میں انھوں نے ان کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ حکیم محمد سعید کہتے ہیں: "میں نے



باقاعدہ اسٹیٹ بینک کے ذریعے پیسے واپس کیے۔"

وہ شخص جس نے اپنی محنت سے نئی دنیا تعمیر کی اور ہمدرد کو بین الاقوامی شہرت سے ہمکنار کر دیا، پاکستان میں اس کی اپنی ذاتی کوئی جائداد نہیں تھی۔ جو مکان تھا، اپنی بیگم کو دے دیا۔ جب بیگم کا انتقال ہوا، تو اپنی بیٹی سعدیہ کو دے ڈالا۔ ان کے اپنے نام پر پاکستان میں ایک انچ زمین بھی نہیں! جس کا کوئی گھر نہیں، اس نے ملک میں شہر علم بنانے کی منصوبہ بندی کی اور ایک دن اُسے تعمیر کرتے سرخ رو ہوا۔ ◆◆◆



اس نے جُن ہی لیا

جیون ساتھی

مغرب کے کثیرالنسل معاشرے میں بسے
ایک پاکستانی باپ کو جب عجب
"سرپرائز" سے دوچار ہونا پڑا

حفیظ کاشمیری

بس سے اترتے ہی وہ دیوانہ وار اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگا۔ ابھی وہ ٹکٹ بوتھ تک پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ نیچے کھڑی ریل اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ وہ ٹکٹ لینے کے بعد جب جلدی سے نیچے دوڑ رہا تھا، تو دوسری اسٹیشن میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ ریل پکڑنے کے لیے سیڑھیاں اتنی تیزی سے چلانگنے لگا، جیسے کوئی شخص اسے جان سے مار دینے کے لیے اس کا تعاقب کر رہا ہو یا پورے شہر کی پولیس اس کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ ہانپتا کانپتا ہوا جب ریل کے قریب پہنچا، تو اس کے دروازے تقریباً بند ہو چکے تھے۔ پہلی کے بعد یہ دوسری بھی اس سے چھوٹ رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ کندھے پر لٹکے تھیلے پر ڈالی اور پھر جلدی سے چھتری نکال اس کے اگلے سرے کا کونا کار کے بند ہوتے دروازوں کے بیچ پھنسا دیا۔ دروازہ تیزی سے کھل کر پھر کھٹاک سے بند ہو گیا۔ مگر دروازہ تیزی سے کھلنے اور بند ہونے کے درمیان اس نے نہایت مستعدی سے اپنا جسم دروازے میں پھنسا لیا۔ دروازہ ایک دفعہ پھر کھلا اور کھٹاک سے بند ہو گیا۔ اب وہ ڈبے کے اندر مگر ابھی تک ہانپے جا رہا تھا۔ سر پہ ہیٹ، اوورکوٹ، نیچے کوٹ اور پھر سویٹر زیب تن کیے سڑک سے لے ریل تک وہ اتنی تیزی سے بھاگ کر پہنچا تھا کہ اس کا وجود نقطۂ انجماد کے پسینہ سر سے لے کر ٹخنوں تک بہہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی کیفیت سے قطعاً بے نیاز اس بات پر مطمئن تھا کہ اس نے ریل پکڑ لی تھی اور اب وہ گھر جلد پہنچ جائے گا۔

پاکستان سے نیویارک منتقل ہوئے اسے لگ بھگ پچیس برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ روز اوّل ہی سے گھر سے کام اور واپس وہ ریل ہی پر سفر کرتا تھا۔ اب وہ اس کی روزمرہ زندگی کا باقاعدہ حصہ بن چکی تھی۔ پہلے دن جب اس نے



سفر کیا، تو دیکھتے ہی دیکھتے چار پانچ ریلیں چھوٹ گئی تھیں۔ پھر اندر داخل ہونے کے لیے وہ میٹرو کارڈ کا استعمال بھی ٹھیک طرح سے نہیں کر پایا۔ مشین کے اندر اپنا میٹرو کارڈ بار بار ڈالتے دیکھ کر ایک خاتون نے اس کی مدد کی تھی۔ لیکن وہ خاتون نہایت چالاکی سے عین اس کے پیچھے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ مشین نے جونہی "جانے" کا اشارہ دیا، وہ بھی اسی کرائے میں پیچھے پیچھے گھومتے ہوئے چرخے میں سے اندر داخل ہوگئی۔

اس بن مسافروں کے ایک ریلے نے جب یک دم اپنی چھتریاں کھول کر اسٹیشن سے باہر نکلتے وقت سیڑھیوں سے اوپر کی طرف تیزی سے باہر نکلنا شروع کیا، تو وہ سب کو اپنی طرف دوڑ کر آتے دیکھ کر واپس نیچے کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ اس خوف سے کہ وہ سب اس پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ مگر یہ اس وقت کی بات تھی، جب وہ نیا نیا آیا تھا۔ ان ہی دنوں جب عقب سے کسی خاتون نے چلا کر کہا تھا "میں حاملہ ہوں، مجھے راستہ دیجیے۔" تو وہ اس سرعام اعلان پر بہت حیران ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ لوگ کام کاج سے لوٹ کر گھر واپس جا رہے تھے۔ ریل کھچا کھچ بھری تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کوٹ کا ایک کونا ابھی تک کار کے دروازے کے بیچ اٹکا ہوا تھا۔ ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر اس نے کوٹ دروازے سے مکمل طور پر آزاد کرا لیا اور آگے کھسک گیا۔ ڈبے کے درمیان ایک نوجوان تھیلا اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ پھنسائے کھڑا کتاب پڑھنے میں محو تھا۔ ایک سیٹ پر نوجوان لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے کندھے پر سر رکھے مزے سے سو رہی تھی۔ ڈبے کے آخری حصے کے ایک کونے میں رکھی ٹرالی میں چار پانچ چھوٹی گٹھریاں، ایک پرانا سا پیکٹ، چھوٹے ڈبے، پرانی سی لحاف اور اسی طرح کی چیزیں لدی ہوئی تھیں۔ قریب ہی ایک بے گھر شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے دو زانو میں منہ دیے پڑا سو رہا تھا۔

سامنے والی نشست پر بیٹھا ایک شخص ہر اسٹیشن پر گاڑی رکتے وقت آنکھیں کھول کر باہر کی طرف دیکھتا اور پھر بند کر لیتا۔ شاید بیچارا ایک نوکری سے فارغ ہو کر دوسری پہ جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ریل کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اگلا اسٹیشن آنے والا ہے۔ اس نے حسب معمول ادھر ادھر نشستوں پہ بیٹھے مسافروں پہ سرسری سی نگاہ دوڑائی۔ ایک شخص نے جب اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کیں، تو وہ سمجھ گیا اس کی نشست خالی ہونے والی ہے۔ وہ چپکے سے اس کی جانب کھسک گیا۔ جونہی وہ مسافر اٹھا، دائیں بائیں دیکھے بغیر وہ اس خالی نشست پر براجمان ہو گیا۔ بیٹھتے ہی اس کی نگاہیں ڈبے میں کھڑی ایک ادھیڑ عمر عورت سے ٹکرائیں جو معنی خیز اور سوالیہ نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس نے آدھا جسم اوپر اٹھا کر ادھیڑ عمر عورت کو بیٹھنے کی پیش کش کی۔ خاتون نے زیر لب مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

دن بھر کی تھکاوٹ اور ریل میں مسلسل کھڑا رہنے کے باعث اسے اپنا جسم بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بیگ گلے سے اتار کر گود میں رکھا اور پشت سے ٹیک لگا آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے بند ہوتے ہی فوراً نیند اس پر غالب آ گئی۔ آنکھ لگنے کے بعد وہ ماضی کی دنیا میں اتنا کھویا کہ نشست پر صرف اس کا دھڑ ہی رہ گیا۔ وقفے وقفے سے اس کے گلے اور نتھنے سے نکلنے والی آوازیں ہی ریل میں اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ ریل پٹڑی پر جتنی تیزی سے دوڑ رہی تھی، نیند کے عالم میں اس کی یادیں اتنی ہی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔ بچپن میں وہ اپنے گھر سے اسکول اور واپسی کا دس میل والا فاصلہ ہر روز پیدل طے کرتا تھا۔ واپسی پر ہاتھ میں کتابوں کا بنڈل، سر پر مویشیوں کا چارا، کبھی گھر کا سودا سلف اور کبھی جلانے کی لکڑیوں کا بنڈل ہوتا۔ اس کے باوجود گھر پہنچ کر کھیلنے کے لیے اس کے جسم میں کافی توانائی بچ جایا کرتی۔

ہر صبح اسکول جانے سے پہلے مویشیوں کو کھولنا، ہل جوتنا اور کبھی کدال سے زمین کھودنا اس کے مختلف فرائض میں شامل تھا۔ پھر اسکول سے واپس آ کر ہر روز شام ہونے سے پہلے شیدو کے ناڑے سے پانی ڈھونا بھی لازمی ہوتا۔ وہ ناڑا (نلکا) اس کے پڑوسی، شیدو کی زمین کی حدود میں واقع تھا۔ اس لیے سب اسے شیدو کا ناڑا ہی کہتے۔

ناڑے سے پانی بوندوں کی صورت ٹپکتا تھا۔ وہ بوندیں اتنی چھوٹی اور باریک ہوتی تھیں کہ آنکھ سے نکلے قطرے ان بوندوں سے بڑے لگتے۔ ان چھوٹی چھوٹی لکیر نما بوندوں کو دیکھ کر اسے لگتا تھا، جیسے دھرتی کا سارا پانی خشک ہو گیا ہے۔ چناں چہ صرف دو کنستر پانی بھرتے ہوئے اسے رات ہو جایا کرتی۔ شیدو کا ناڑا یاد کر کے وہ نیند میں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اسکول واپسی پر سودا سلف لانا، زمین کھودنا، مویشیوں کو چارہ دینا اسے مشکل نہ لگتا۔ وہ یہ سارے کام کھاتے پیتے، پھرتے کر لیا کرتا۔ لیکن شیدو کے ناڑے والا کام خاصا جان جوکھم کا ثابت ہوا۔

اسکول سے لوٹتے ہی ماں اس کے ہاتھ میں دو بڑے کنستر تھما دیتی۔ وہ بغیر کچھ کہے سے کنستر ہاتھوں میں لٹکائے ناڑے کا رخ کرتا۔ ناڑے پہنچ کر کنستر نلکے کے نیچے رکھ اسکول کی کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جاتا یا پھر قریبی جنگلات کے بڑے بڑے سایہ دار سبز درختوں اور کھلا آسمان دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا۔ پہاڑ، گھنے جنگلات، کھلا آسمان اور چاند ستارے اسے بہت ہی دلکش لگتے۔ پتھر پہ بیٹھے بیٹھے وہ اسی سوچ میں گم رہتا کہ یہ سب کچھ کیسے کب اور کیوں وجود میں آیا؟

نگاہیں ادھر ادھر دوڑانے کے دوران نلکے سے کنستر میں گرنے والی بوندوں سے پیدا ہونے والی ٹپ ٹپ کی آوازیں ارد گرد کی خاموشی اور سکوت توڑتی۔ یا پھر قریب ہی رہنے والی جھلی جو اس کے وہاں بیٹھے ہوئے کئی بار اپنے آپ سے باتیں کرتے آتی اور خاموشی توڑتے ہوئے واپس گھر چلی جاتی۔ وہ جھلی کو بچپن سے ہی جانتا تھا۔ روز اول ہی سے چشمے پر بار بار چکر کاٹنے کا وہ عادی ہو چکا تھا کہ نہ تو اس کی طرف توجہ دیتا تھا اور نہ ہی باتیں سمجھ پاتا جو جھلی اپنے آپ سے کرتی رہتی تھی۔ جھلی بھی چشمے پہ اس کی موجودگی سے بے نیاز باتیں کرتی آتی اور لگاتار بولتے ہوئے واپس چلی جاتی۔

پتھر پر بیٹھے بیٹھے خیالات میں کھوئے رہنے کے دوران جب ٹپ ٹپ کی آوازیں آنا بند ہو جاتیں، تو وہ سمجھ جاتا کہ کنستر اب بھرنے والا ہے۔ وہ فوراً اس کی جگہ دوسرا کنستر لگاتا اور پھر خیالات میں گم ہو جاتا یا کتاب پڑھنے لگتا۔ دونوں کنستروں کے بھرتے بھرتے رات ہو جایا کرتی۔ وہ پھر ڈنڈا نما بہنگی تھام لیتا جس کے دونوں سروں پر پانی سے لبالب بھرے کنستر لٹکے ہوتے۔ رات کے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر جب وہ غیر ہموار پگڈنڈی سے نیچے اترتا تو اس کی زبان اور کندھوں کی ہڈیاں باہر نکل آتیں۔ اب امریکا میں اس کی چھوٹی بیٹی چھیڑنے کے لیے جب اسے پیار سے "چھوٹو ڈیڈی" کہتی، تو وہ فوراً بہنگی کو کوسنے لگتا جسے کندھے پہ ڈالے وہ بچپن میں پانی ڈھوتا رہا تھا۔

ہمیشہ یہ سوچ کڑھتا رہا کہ بچپن میں دونوں کندھوں پہ بہنگی کے ذریعے پانی کا بوجھ اٹھانے سے اس کا قد چھوٹا رہ گیا۔ ابھی تک وہ نیند ہی کے عالم میں دھیمے دھیمے سانس لے رہا تھا۔ بیٹی کا خیال آتے ہی تبسم لبوں پہ پھیل گیا۔ بچوں کے معاملے میں وہ بہت خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ جب وہ امریکا آیا، تو اس کے دونوں بیٹے خاصے سمجھدار تھے۔ لیکن بیٹی بمشکل پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ اس بات سے نہایت مطمئن تھا کہ امریکا جیسی جگہ میں رہتے ہوئے بھی دونوں بیٹوں نے اس کی منشا اور مرضی کے مطابق شادیاں کی تھیں۔

اسے بڑا اطمینان تھا کہ اگر بیٹوں نے شادیاں رچاتے وقت اس کی خواہشات کا احترام کیا ہے، تو بیٹیاں تو بیچاریاں ہوتی ہی بے زبان ہیں۔ پھر بیٹی شادی کے معاملے میں اس کی

مرضی کے خلاف کیسے جا سکتی ہے؟ وہ بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں اس کے زیادہ قریب تھی۔ وہ جاسنے تکتی اور دیر تک خواب یا محو خیال رہتا کہ بھاری قدموں کی ٹھپ ٹھپ آوازوں سے ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور سر کو دائیں بائیں دو تین بار جھٹکا دیا۔ ایک ٹیم تیم سیاہ فام ایک ڈبے سے دوسرے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ دو تین پولیس آفیسر اس کے تعاقب میں تھے۔ اب اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں اور قدرے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک اور کالا ٹوپی پہنے اور جین پتلون میں ملبوس تبلیغ کیے جا رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اب یسوع مسیح کا ظہور ہوا چاہتا ہے اور دنیا ختم ہونے والی ہے۔ سامنے والی نشست پر ایک یہودی کالا ہیٹ پہنے نیویارک ٹائمز کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے برابر بیٹھی ایک نیم ننگی عورت مسلسل کچھ اول فول بکے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ریل کی رفتار آہستہ آہستہ ہونی شروع ہوئی جب اگلے اسٹیشن پر رکی، تو پانچ سڈول جسم کے نوجوان سیاہ فام لڑکے اچھلتے کودتے ریل میں سوار ہو گئے۔ وہ آناً فاناً نہایت ہی پھرتی اور منظم طور پر ڈبے کی درمیان والی جگہ میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ دولڑکے ہاتھ پاؤں فرش پر مضبوطی سے جما لڑکوں کر کے جھک گئے۔ باقی تین یکے بعد دیگرے ان کے اوپر سے نہایت مہارت کے ساتھ پھلانگ گئے۔ پھر تین نے ایک دوسرے کی گردنوں میں اپنی اپنی ٹانگیں پھنسا اس طرح قلابازیاں کھانی شروع کیں کہ تینوں کے اجسام آپس میں جڑے ہوئے لگتے۔ کرتب دکھانے کے بعد ان لڑکوں نے تمام مسافروں سے جی کھول کر داد وصول کی۔

وہ سیاہ فام لڑکوں کے داخل ہوتے ہی ان کے مظاہرے دیکھنے تیار ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ان کا یہ کرتب دیکھ کر ہمیشہ محظوظ ہوتا۔ جب بھی لڑکوں میں سے کوئی ڈبا یا اپنی ٹوپی پھیلائے مسافروں کے بیچ میں سے گزرتا، تو وہ بلاناغہ اس میں ایک دو ڈالر ڈال دیتا۔ اس کے برعکس کسی بھکاری کو وہ کبھی کوئی پیسا نہ دیتا۔ جب سے اس نے ریل کے ذریعے سفر کرنا شروع کیا تھا، اس طرح کے مشاہدے اور مظاہرے اسے تقریباً ہر روز ہی دیکھنے کو ملتے۔ بلکہ اسے نیویارک کا سارا کلچر اور تہذیب دیکھنے کو مل جاتی۔ اس کی رائے میں جیسے نیویارک پورے امریکا کا عکس تھا، اسی طرح ریل سارے نیویارک کی زندگی کی آئینہ دار تھی۔

کام کاج کرنے کے بعد گھر لوٹتے ہوئے ریل میں جب اسے اس قسم کے ہلکے پھلکے شو دیکھنے کو ملتے، تو دن بھر کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ دماغی تھکاوٹ میں بھی کافی کمی آتی۔ ایسے کرتب اس کی طبیعت خوشگوار اور پُرمسرت اثر چھوڑ جاتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا۔ مگر آج تو وہ زیادہ ہی خوش اور پرجوش تھا.... اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لڑکا تلاش کر لیا تھا۔ لڑکا برسرِروزگار، باادب اور مہذب اور سب سے بڑھ کر ہم مذہب اور ہم وطن تھا۔ گویا اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو وہ کسی لڑکے کے اندر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بیٹی کے لیے ہر طرح سے موزوں تھا۔

اس نے بیٹی کے کان میں یہ بات ڈال بھی دی تھی اور لڑکے سے کسی بہانے فون پر ایک دو بار بات بھی کرا ڈالی۔ جب دونوں بیٹوں نے باپ کی منشا کے مطابق شادیاں کی تھیں، تو بھلا بیٹی کو باپ کے انتخاب پر کیا اعتراض ہوتا؟ اس نے اگلے دن لڑکے کو گھر پر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ یہ سوچ کر بہت مطمئن اور خوش تھا۔ کل کی دعوت کے بعد وہ دونوں کو کچھ دنوں کے لیے ایک دوسرے سے ملنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کرے گا تاکہ اس مقدس فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جائے۔ اب اگلا اسٹاپ اس کا تھا۔ گاڑی کے اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

کمر کے ساتھ تھیلا لٹکانے اور ہاتھ میں چھتری تھامے

جب وہ اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا، تو اُسے امید تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بنّی اسٹیشن کے باہر کار لیے اس کی منتظر ہوگی۔
آج وہ بنّی سے ملنے کے لیے زیادہ ہی بے چین اور بے تاب تھا۔ چاہتا تھا کہ کار میں بیٹھتے ہی لڑکے کے بارے میں اُسے بتا دے جو کل دعوت پر آنے والا تھا۔ اس طرح وہ اسے نہایت خوشگوار "سرپرائز" دینا چاہتا تھا۔

اپنے خیالات میں محو جب وہ اسٹیشن سے باہر نکلا، تو سڑک کی دوسری جانب حسب معمول بنّی اپنی مخصوص جگہ پر کار میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن خلاف معمول آج بنّی نے باپ کے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھولا کیونکہ اس کے ساتھ اگلی نشست پر ایک گورا لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"ڈیڈی ان سے ملیے یہ جمی ہیں۔" بنّی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پیچھے باپ کی طرف گردن گھماتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اور ڈیڈی ان کا گھر مختلف مذاہب امتزاج سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی ماں مسلمان ہیں، باپ یہودی ہے اور یہ...... یہ......" بنّی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "ان کا کوئی مذہب نہیں۔ سب سے بڑا سرپرائز میں آپ کو یہ دینا چاہتی ہوں کہ میں نے انھیں اپنا جیون ساتھی منتخب کر لیا ہے۔" اس نے ساری باتیں ایک ہی سانس میں بلا توقف کہہ ڈالیں۔ ◆◆◆

موبائل فون: ہائی بلڈ پریشر کا باعث بن گیا

آج کل ہر شخص موبائل فون استعمال کرتا نظر آتا ہے۔ زندگی کی مصروفیات کے ساتھ یہ ہر شخص کی ضرورت بن گیا ہے۔ تاہم امریکی ماہرین کا کہنا ہے، موبائل فون کے مسلسل استعمال سے بلڈ پریشر یا بلند فشار خون میں وقتی اضافہ ہو سکتا ہے۔ جرمنی میں ہونے والی ایک حالیہ تحقیق میں ماہرین نے ۱۰ افراد پر ایک تجربے کی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کے مطابق ان افراد کے دائیں کان میں موبائل فون کی ۹۰۰ میگا ہرٹز والی لہریں دی گئیں۔ ان لہروں کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے وقفے وقفے سے جاری رکھا گیا۔ تمام افراد موبائل فون پر بات نہیں کر سکتے تھے۔ صرف ان کے کانوں تک ۹۰۰ میگا ہرٹز لہریں پہنچائی جاتی ہیں۔ ۳۵ منٹ تک الیکٹرومیگنیٹک گرمائش ان افراد کے کانوں میں جاتی رہیں۔ ۳۵ منٹ کے دوران ان تمام افراد کا بلڈ پریشر عام سطح سے اوسطاً ۸ ملی میٹر مرکری بڑھ گیا۔

ایک صحت مند شخص کے لیے بلڈ پریشر کا وقتی بڑھ جانا اتنا خطرناک نہیں۔ مگر جو افراد ہائی بلڈ پریشر کے مریض اور دن میں اوسطاً ۳ سے ۴ گھنٹے موبائل فون سنتے ہوں، ان کے لیے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ اگر ۳۵ منٹ موبائل فون کا استعمال بلڈ پریشر کو ۸ ایم ایم بڑھاتا ہے، تو ۳ گھنٹے موبائل فون کا روزانہ استعمال بلڈ پریشر میں تقریباً ۴۰ ایم ایم تک اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

دراصل کانوں کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والی موبائل فون کی برقی مقناطیسی شعاعیں دماغ میں موجود خون کی نالیوں کو وقتی طور پر تنگ کر دیتی ہیں۔ اس سے خون کے دباؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ برقی مقناطیسی شعاعیں دماغ تک جاتی رہیں، تو یقیناً خون کی نالیوں کو مستقل تنگ کر دیتی ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق جہاں تک ہو سکے، موبائل فون کم استعمال کیجیے۔ خصوصاً ہائی بلڈ پریشر کے شکار مریض سیلولر فون پر مختصر بات کریں۔

(انتخاب: ڈاکٹر فرزانہ جمیل، دوبئی)



صرف خوش نصیب کو ملتی ہے

آزادی کی دولت

جالندھر سے آنے والے ایک لڑکے کی سبق آموز یادیں جسے پاک وطن پہنچنے کا اعزاز نصیب ہوا

غزالہ ارشد

پاکستان کا قیام جن شہدا کی قربانیوں اور نیک نیتی کے نتیجے میں وجود میں آیا، وہ آج بھی اس کی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، ایسے افراد جو قیامِ پاکستان کی یادیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، اب شاذونادر ہی ملتے ہیں۔ جن کی آنکھوں نے ہجرت کے مناظر دیکھے ان سے ملنا اور پھر انھیں محفوظ کر لینا میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ ایسے لوگوں سے مل کر ان کے احساسات اور جذبات یکجا کر لیے جائیں۔ بجائے کب یہ ہم سے بچھڑ جائیں اور ہم اس سرمائے سے محروم رہیں۔

نئی نسل اس کرب و غم سے واقف نہیں جو اس ملک کی تخلیق میں ہمارے بزرگوں نے برداشت کیے۔ ان تک بزرگوں کے تجربات اور مشاہدات پہنچانے کے لیے ان داستانوں کو ضرور ضبط تحریر میں لانا چاہیے۔ ڈاکٹر حسین مرزا کا شمار بھی ان اہم ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے پاکستان بنتے دیکھا۔ ڈاکٹر حسین مرزا یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو ضلع جالندھر کے ایک گاؤں "چٹی" میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ان کی عمر گیارہ برس تھی۔ اس کے ذہن میں اس وقت کی واضح تصاویر موجود ہیں۔ آئیے ان کی کہانی انھی کی زبانی سنتے ہیں۔

٭٭

جالندھر کے گاؤں چٹی میں میری پیدائش ہوئی۔ مجھے یاد ہے، جب میں پانچ برس کا ہوا تو میری پھوپھو مجھے پہلے دن اسکول چھوڑنے گئیں۔ میرے ہاتھ میں تختی تھی اور میرا بستہ پھوپھو نے اٹھا رکھا تھا۔ ماسٹر نے مجھے ٹاٹ پر باقی بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا، اس لیے



اسکول پہنچ کر بہت خوشی ہوتی۔ میری جماعت میں زیادہ تر ہندو اور سکھ بچے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی مگر اس کے باوجود ہم میں مذہبی تعصب نہ تھا۔ ہم باہم مل کر پڑھتے، کھیلتے اور خوشی سے وقت گزارتے۔

ایک روز ایک سکھ بچے سے لڑائی ہوگئی۔ میں نے اسے بہت مارا اور پھر ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا۔ لیکن ابا سے کہا کہ ماسٹر نے مجھے مارا ہے، اس لیے اسکول نہیں جاؤں گا۔ ابا مجھے زبردستی ساتھ لے کر چلے۔ راستے میں انھیں سچ بات بتادی۔ ابا نے مجھے اس بات پر شاباش دی کہ میں نے سچ بولا اور آئندہ زندگی میں بھی سچائی اپنائے رکھنے کی تاکید کی۔ ان چھوٹی موٹی باتوں کے باوجود سکھ اور ہندو ہمارے دوست تھے۔

میرا شمار اسکول کے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ چوتھی جماعت میں وظیفے کے امتحان کے لیے بچوں کا چناؤ ہوا، تو ماسٹر نے مجھ سے پوچھا ”کیا تمھارا باپ زمیندار ہے؟“

میں نے معصومیت سے کہا ”نہیں وہ تو راج کا کام کرتے اور مسجدوں کے منار بناتے ہیں۔“ یوں بڑے باپ کا بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے میرا انتخاب نہ ہوسکا۔ اتفاق سے اس سال کوئی بچہ بھی وظیفہ حاصل نہ کرسکا۔ بعد میں ماسٹر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ذاکر تمھیں ضرور لے جانا چاہیے تھا۔“

اب میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بڑا نام ہی کام آتا ہے۔ لہٰذا فیصلہ کرلیا کہ مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔ میرے والد صاحب بھی مجھے بابو بنانے کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ کہتے ”بیٹا اگر تمھیں بابو بننا ہے، تو پھر انگریزی اسکول میں پڑھنا ہوگا۔“ وہ اسکول گھر سے بہت دور تھا لیکن بابو بننے کے شوق میں اسی میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب بہت خوش تھے کہ میرا بیٹا انگریزی پڑھ رہا ہے۔ انگریزی تب بھی ترقی کا زینہ تھی اور بدقسمتی سے آج بھی ہے۔ میں مشینوں میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور ہر مشین کو بہت غور سے دیکھتا۔ بعد میں میرا یہی شوق مجھے مکینیکل انجینئر بنانے میں معاون بنا۔

پاکستان کی تحریک ان دنوں زور پکڑتی جارہی تھی۔ ہم کچھ باتیں سنتے لیکن زیادہ سمجھ میں نہ آتا کہ پاکستان کیوں بنایا جارہا ہے۔ ایک روز میں اپنی والدہ کے ساتھ بازار سے گزر رہا تھا۔ وہاں سکھوں کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں چمکدار تلواریں تھیں اور وہ سب شراب کے نشے میں مدہوش مسلمانوں کے خلاف سخت نازیبا الفاظ استعمال کررہے تھے۔ پھر کرپانیں دکھا دکھا کر لوگوں کو اشتعال دلانے لگے کہ جہاں مسلمان نظر آئیں، ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔

میرے معصوم ذہن کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ مسلمانوں سے اس قدر نفرت کا اظہار کیوں کیا جارہا ہے؟ ماں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا اور راستہ بدل دوسری گلی سے مجھے لیے تیز تیز چلتے گھر پہنچ گئی۔ میں بار بار ماں سے پوچھتا کہ سکھ مسلمانوں کو گالی کیوں دے رہے تھے؟ وہ مسلمانوں کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟ لیکن ماں جواب دینے کے بجائے مجھے سب کچھ بھول جانے کی تاکید کرتی۔ میرے دل پر یہ منظر نقش ہوگیا۔ دل میں سکھوں کے خلاف گرہ لگ گئی اور میں بھی انھیں اپنا دشمن سمجھنے لگا۔

ایک روز والد صاحب جالندھر سے منار تعمیر کرنے کے بعد گھر آئے تو بہت پریشان تھے۔ وہ آہستہ آہستہ امی کو بتانے لگے کہ پاکستان بن گیا ہے۔ جالندھر میں مسلمانوں کا قتل عام ہورہا ہے۔ میں تب بھی نہ سمجھ سکا کہ اگر پاکستان بن گیا ہے تو پھر مسلمانوں کو قتل کیوں کیا جارہا ہے۔ اسی وقت میرے ذہن میں سکھوں کا وہی گروہ آگیا اور میری نفرت پھر تازہ ہوگئی۔ ابھی تک ہمارے علاقے میں قتل و غارت کا آغاز نہ ہوا تھا۔ لیکن ہر طرف خوف کی فضا تھی اور لوگ بہت سہمے ہوئے تھے۔

ایک صبح میرے اسکول جانے والے ساتھی مجھے لینے آئے۔ ان میں ایک لڑکا ہندو تھا اور ایک سکھ۔ میں نے اپنا

بستہ اٹھایا اور ان کے ساتھ نکل پڑا۔ جب ہم اسکول کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ اسکول کو سکھوں نے گھیرا ہوا ہے اور اپنی کرپانیں لہرا رہے تھے۔

ہمیں دور ہی سے دیکھ کر ہمارا ایک استاد جو ہندو تھا، ہماری جانب لپکا اور ہم تینوں کو پچھلے دروازے سے اسکول کے اندر لے گیا۔ استاد نے بتایا "دراصل پاکستان بن گیا ہے۔ تم مسلمان وہاں جا رہے ہو۔ حیرت ہے تمھارے باپ نے تمھیں اسکول کیسے بھیج دیا؟ بس اپنا بستہ یہیں چھوڑو اور فوراً گھر بھاگ جاؤ۔" میرے دوستوں کو ہدایت کی کہ میرے ساتھ چلیں اور ایک طرف ہندو ہو، دوسری طرف سکھ۔ مجھے درمیان میں رکھا جائے۔ تب شدید خوف کی لہر میرے اندر اتر گئی۔ بھاگتے بھاگتے ہم گھر پہنچے۔ خیریت سے پہنچ کر ماں سے لپٹ گیا اور بہت رویا۔ ماں بھی گھبرا گئی۔ وہ بھی سیاسی حالات سے زیادہ واقف نہ تھی مگر اتنا جان گئی کہ اب مسلمانوں کی جانیں محفوظ نہیں۔

وہ آخری دن تھا، اس کے بعد میں اسکول نہ جا پایا۔ محلے کے مسلمان میٹنگ کرتے لیکن فیصلہ نہیں کر پائے کہ بھرے پرے گھر چھوڑ کر کیسے جائیں اور کہاں؟ پھر ایک رات ایسا ہوا، سب نیند کی آغوش میں تھے کہ یکایک کونے والے گھر سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ سب لوگ سہم کر اٹھ بیٹھے۔ اماں نے آیات کا ورد کرتے ہوئے بچوں کو گود میں چھپا لیا۔ ابا حالات کا جائزہ لینے اوپر چھت پر گئے اور جھانک کر نیچے دیکھنا چاہا تو ابا کے ہندو دیلدار دوست کی آواز آئی "مرزا! فوراً نیچے چلے جاؤ۔"

ابا ڈرے ہوئے نیچے آ گئے۔ اندر سے تمام دروازے کھڑکیاں بند کر کے سب ہاتھوں میں چھریاں اور لاٹھیاں لے کر بیٹھے رہے۔ صبح کے قریب چیخ پکار کا سلسلہ ختم ہوا۔ ایسی خوفناک آوازیں تھیں کہ اللہ توبہ! لگتا تھا، انسانوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ وہ انتہائی خوفناک صبح تھی۔ معلوم ہوا کہ اس گھر میں موجود تمام مسلمانوں کو سکھوں نے انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا۔

ابا کے دوست دیلدار صاحب اگلے روز گھر آئے اور ہاتھ جوڑ کر ابا سے کہنے لگے "کل رات تو میں نے آپ کو بچا لیا اب میں آپ کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ آپ اپنے بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے فوراً نکل جائیں۔" انھوں نے پھر اپنے دو ملازم ہمارے ساتھ روانہ کیے اور کہا، یہ دونوں آپ کو رسول پور گاؤں تک پہنچا دیں گے۔

ہم نے گھر اسی طرح چھوڑا، باہر تالا لگایا اور ہمسائے کو چابی دے کر کہا، ہم کسی عزیز کے جا رہے ہیں، واپس آ کر چابی لے لیں گے۔ رسول پور تک ہم خیریت سے پہنچ گئے۔ وہاں ابا کے دوست آباد تھے۔ انھوں نے ہمیں پناہ تو دے دی لیکن خوف کا وہی عالم تھا اور کسی کی جان محفوظ نہ تھی۔ سکھوں کے حملوں کی لگاتار خبریں آ رہی تھی۔ عورتوں کو بے عزت کیا جا رہا تھا۔ بچوں کو نیزوں میں پرو دیا جاتا۔ رسول پور پر بھی سکھوں کے حملوں کی خبریں گردش کر رہی تھیں لہٰذا رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

سب نے مل کر طے کیا کہ تلونڈی کی طرف چلا جائے۔ تلونڈی کا میئر ابا کا دوست تھا۔ پھر اس کا بیٹا فوج میں تھا۔ وہاں سے فوج کی قیادت میں نکلتے تو محفوظ رہتے۔ تلونڈی پہنچ کر فوجی بیٹے کا انتظار ہونے لگا کہ وہ فوج کا ٹرک لے کر آ جائے۔ لیکن اس انتظار میں روز بروز حالات خراب ہوتے گئے۔ مرد، بچوں اور عورتوں کو رات کے وقت انگیٹھیاں دے کر چھت پر چڑھا دیتے اور خود لاٹھیاں، اسلحہ لے کر نیچے پہرہ دیتے۔ بالآخر سب نے فوجی ٹرک کا انتظار کرنے کے بجائے جالندھر کی طرف کوچ کا ارادہ کیا۔

جیسے ہی ہمارا قافلہ ایک ندی کے کنارے پہنچا، سکھوں کے ایک غول نے حملہ کر دیا۔ خوش قسمتی سے اس سے پہلے کہ وہ کوئی نقصان پہنچاتے، فوجی ٹرک ہماری مدد کو پہنچا۔ سکھ اسے دیکھ کر بھاگ گئے۔ فوجیوں نے ہمیں وہ ندی عبور کرائی۔ پانی

کی گہرائی زیادہ تھی، کچھ افراد اس میں ڈوب گئے۔ آج تک وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے جب چند عورتوں کو میں نے ڈوبتے دیکھا لیکن کوئی انھیں نہیں بچا سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کے اوپر ان کا سامان تیرنے لگا۔

قافلے کے افراد جو ندی پار کر گئے، انھیں ایک کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس گاؤں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ انھوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ وہاں مجھ پر یہ تلخ حقیقت واضح ہوئی کہ اب ہم کبھی اپنے گھر واپس نہیں جا سکتے۔ اب ہمیں صرف پاکستان ہی میں پناہ مل سکتی تھی۔ مجھے پاکستان سے محبت محسوس ہونے لگی۔ میں دعا کرنے لگا کہ ہم خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔ باقی لوگوں میں بھی اس کے متعلق بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ سب لوگ مل کر پاکستان سے وابستہ خوش آئند تصورات باندھتے۔ بالآخر سب جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ کچھ لوگ بیل گاڑیوں میں سوار ہوئے، کچھ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔

سب خوش اور پُرامید تھے کہ بس جالندھر ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہے۔ سنا یہ گیا تھا کہ کسی انگریز نے ایک ریل کا بندوبست کیا ہے جو مسلمانوں کو لیے پاکستان جائے گی۔ تقریباً ایک ہفتے ہم جالندھر میں ریلوے پھاٹک کے قریب بے یار و مددگار ریل کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ اسی دوران میں ایک مقام پر ابا کا اس سکھ سے بھی سامنا ہوا، جسے ہم اپنے گھر کی چابیاں دے کر آئے تھے۔ ابا نے اس سے کہا "ہم بہت سارا سامان چھوڑ کر آئے ہیں، کچھ تو اس کے بدلے میں دے دو۔" ہمارے پاس کچھ بھی زادِ راہ نہ تھا۔

اس نے بڑی بے نیازی سے کہا "مرزا جی! اب آپ رب کے حوالے، جان بچ گئی بس اسے غنیمت سمجھیں۔"

پھاٹک کے اردگرد بیٹھے ہمیں دو ہفتے گزر گئے مگر ریل نہ آئی۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ ہر جانب سے سکھوں کے غول حملہ آور ہوتے محسوس ہوتے۔ غرض اس دوران شاید ہی کوئی پورا نیند سویا ہو۔ کوئی خدا ترس انسان کھانا تقسیم کر دیتا، تو کھا لیتے ورنہ لوگوں کی جیبوں میں اتنا پیسا بھی نہ تھا کہ وہ زندگی برقرار رکھنے کے لیے طعام کا اہتمام کر سکتے۔ ایک اور مصیبت یہ آئی کہ ایک بیل میرا پاؤں کچلتے گزر گیا۔ شدید تکلیف کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے بھی محروم ہو گیا۔

اس دوران یہ اطلاع ملی کہ پاکستان جانے والی ایک ریل کو سکھوں نے لوٹ لیا۔ اس میں سوار تمام افراد شہید کر دیے گئے۔ یہ ہولناک خبر ہمارے حوصلے پست کرنے کے لیے کافی تھی۔ پہلے جو ریل امید کی کرن تھی، اب وہ موت کے پروانے میں بدل گئی۔ سب ریل میں بیٹھنے سے کترانے لگے۔ ایسے لگتا جیسے وہ ریل اب ہمارے لیے نجات بن کر نہیں آ رہی بلکہ ہماری مقتل گاہ ہے۔ ابا جی لوگوں سے مل کر آتے تو روتے ہوئے ہمیں پیار کرتے اور یہی کہتے "ہمارے آخری ایام چل رہے ہیں۔ نجانے کب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

دو ہفتے بعد ریل آئی۔ لیکن اس کی آمد جس خوشی کا اشارہ تھی، وہ بدل چکا تھا۔ سب تابی سے سوار ہونے کے بجائے ہر شخص خوف کے ساتھ ریل میں سوار ہوا جیسے اپنی مقتل گاہ میں داخل ہو رہا ہو۔ ابا نے مجھے اور میری بہن کو بالائی نشست پر سامان کے ساتھ اس طرح بٹھایا کہ ہم چھپ گئے۔ امرتسر اسٹیشن پر سکھوں کے حملے کا بہت خطرہ تھا۔ جتنی دیر ریل وہاں رکی رہی، سب کے خون خشک تھے اور آنکھیں خوف سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ سب آیاتِ قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ آخر قدرت کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا۔ ریل آہستہ آہستہ امرتسر اسٹیشن سے رینگنے لگی۔ جب اسٹیشن سے باہر نکلی، تو سب نے کھل کر سانس لیا اور جان میں جان آئی۔ اب اتنی امید ہو گئی تھی کہ ان شاءاللہ خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں گے۔

پاکستان کی سرزمین چھوتے ہی سب اللہ کے حضور سربسجود ہو گئے۔ آنکھیں شکر کے احساس سے لبریز ہو گئیں۔

یوں محسوس ہوا جیسے ایک مہرباں وجود نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ لاہور چھاؤنی کے ایک کیمپ میں تمام مہاجرین کو ٹھہرایا گیا۔ وہیں ایک ضعیف جوڑا آپس میں باتیں کر رہا تھا۔ ان کی عمر اسی (۸۰) سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن آنکھوں میں روشنی اور چہرے پر خوشی و اطمینان لیے وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: "یہ پاک لوگوں کا پاک وطن ہے۔ شکر ہے ہم یہاں پہنچ گئے۔ اب یہاں اللہ ہی کا نام لیا جائے گا اور اللہ کی کے حکم پر سب چلیں گے۔"

ان کی یہ باتیں اور چہرے کی چمک میں آج تک نہیں بھول پایا۔ احساسِ تشکر سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اللہ نے ہمیں آزادی کی کتنی بڑی دولت سے نوازا ہے۔ یہ ہمارا وطن پاکستان ہے جہاں اب ہر شخص خوشحال ہوگا۔ مجھے ہندوستان میں چھوڑا ہوا اپنا گھر، سامان اور اپنے دوست وغیرہ بھی اس ملک کے مقابلے میں اچھا نہیں لگا۔

پاکستان میں قیام کی الگ داستان ہے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ تعلیم کے بغیر وطن کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا میں نے تعلیم حاصل کرنے پر بھرپور توجہ دی۔ میں انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن میرے پاس پیسے کی کمی تھی۔ میرا یہ خواب ایک معزز ہستی، بشیر الٰہی صاحب کی مدد سے پورا ہوا جنھوں نے میری مالی معاونت کی۔ آج تک میں دل سے ان کے لیے دعا کرتا اور اپنی ہر نعمت اور خوشی میں انھیں حصے دار سمجھتا ہوں۔ آج میں امریکا میں قیام پذیر ہوں۔ رزق حلال کی تلاش میں یہاں آنا مقدر ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے وطن کے لیے جو مجھ سے ہو سکتا ہے، خدمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پاکستان میں ایسے بچوں کے لیے مستقل وظائف مقرر کیے ہیں جو پیسے کی کمی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر پائیں۔ آمدن کا ایک حصہ ان کے لیے مختص ہے۔ ان بچوں سے صرف یہ وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی میں کسی ایک بچے کو پڑھائیں گے۔

بڑھاپا

مت اپنی جوانی میں برے کام کرو تم
قائم سدا اسلامی اصولوں پہ رہو تم
صبح جلدی اٹھو، رات کو سو جائیے جلدی
اس کام میں لگتی ہے نہ پھٹکری اور نہ ہلدی
تم سادگی اپناؤ، غذا سادہ ہی کھاؤ
صبح اٹھ کر کرو غسل بھی اور سیر کو جاؤ
ہیں جتنی نمازیں وہ ادا وقت پہ کیجیے
پھر ان کا صلہ حشر کے میدان میں لیجیے
ہر ایک برائی سے بچو، نیک بنو تم
ہر نشے سے، ہر جرم سے پرہیز کرو تم
تم آج جوانی کی اگر قدر کرو گے
سکھ چین سے کل اپنے بڑھاپے میں رہو گے

(سرور انبالوی، انتخاب: محمد خلیل چوہدری، دینہ، جہلم)

امریکا کی سرزمین پہ اللہ کے گھر کی تعمیر کی اور ندائے اسلام کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی۔ مسلم بچوں کی دینی تعلیم کے گھر ہی سے سنڈے اسکول کا اجرا اور رمضان میں گھر ہی میں نماز تراویح کا اہتمام کیا۔ جب مسجد مکمل ہو گئی تو وہاں نماز تراویح اور حفظ قرآن کی تعلیم دی جانے لگی۔ اب تک بہت سے حافظ قرآن تعلیم مکمل کر چکے اور سرزمین امریکا پر اپنے انوار سے روشنی پھیلا رہے ہیں۔

☆☆

جناب ڈاکٹر معین مرزا بلند خیالات اور پختہ ارادوں کے انسان ہیں۔ ہر دن کو اللہ کی عطا اور انعام سمجھتے ہیں۔ روزانہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اس روز کی نیکیاں کرنے والوں میں ان کا نام بھی شامل ہو جائے۔ ہم بھی ان کے لیے دعاگو ہیں۔

◆◆◆





نہ بکنے والا نہ جھکنے والا

ہمارا دیانت دار قائد

پاکستانی حکمرانوں کو صراطِ مستقیم دکھانے والے بانیٔ پاکستان کے سبق آموز واقعے

پروفیسر سعید راشد علیگ

مطلوب الحسن سید نے جو قائداعظم کے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک پرائیویٹ سیکرٹری تھے، قائداعظم سے ایک فوجی افسر کی ملاقات کا دلچسپ اور فکرانگیز واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک ممتاز مسلم لیگی لیڈر بمبئی میں رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی برطانوی فوج میں افسر اور برما میں تعینات تھے۔ وہ چھٹی پر کچھ دنوں کے لیے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ ایک رات دونوں بھائی رات کے کھانے پر قائداعظم کے ہاں آئے بات چیت کے دوران نوجوان فوجی افسر نے قائداعظم سے کہا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اقتصادی طور پر قابلِ عمل نہیں ہوگا۔"

قائداعظم نے ان سے پوچھا "تم بتاؤ تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

نوجوان فوجی افسر نے فوراً کہا "ہمارے نزدیک تو پاکستان یقیناً اقتصادی طور پر قابلِ عمل ہوگا۔"

قائداعظم نے پوچھا "کیا تم یہ محض خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو۔"

فوجی افسر نے کہا: "ہم تو فوجی افسر ہیں ہمارا کام تو صرف حکم ماننا ہے سوچنا نہیں۔"

اس پر قائداعظم نے فرمایا:

"اگر کبھی میری فوج ہوئی اور اس پر میرا کنٹرول ہوا تو میں سب سے پہلے تمھیں فوج سے نکال دوں گا۔ کیونکہ میری آرمی میں بے دماغ لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"



قائداعظم کا قول پاکستان کی مسلح افواج کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی سے پہلے تاجِ برطانیہ کے وفادار سپاہیوں اور افسروں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ صرف دلیر ہوں، حکم

مائیں اور دماغ سے نہ سوچیں۔ جنگ کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ سوچنا لازمی نہیں تھا۔

لیکن آزادی کے بعد آزاد نظریاتی مملکت کی مسلح افواج کے لیے بہادر ہونا، دلیر ہونا، وفادار ہونا بھی ضروری ہے اور روشن دماغ اور روشن ضمیر ہونا بھی، کیونکہ وہ اس مملکت خداداد کی جغرافیائی سرحدوں کے بھی محافظ ہیں اور نظریاتی سرحدوں کے بھی۔ انھیں زمین کے ایک ٹکڑے ہی کی حفاظت ہی نہیں کرنی بلکہ یہ ٹکڑا جن تصورات اور عقائد کی حفاظت اور نشوونما کے لیے بنا ہے، ان کی حفاظت کرنا بھی افواج پاکستان کا مقدس فرض ہے۔

عظیم ترین مدبر

لندن میں قانون کی تعلیم کے ادارے اور بھی بہت سے تھے لیکن ان میں داخلہ لینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل کراچی بار ایسوسی ایشن کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے خود اس امر کی وضاحت کی۔ انھوں نے فرمایا:

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اکرم ﷺ کی جن کا شمار دنیا کے عظیم مدبروں میں ہوتا ہے، بہت عزت تھی۔ ایک دن میں اتفاق سے لنکنز ان گیا۔ اس کے صدر دروازہ پر دنیا کے نامور قانون سازوں کے نام کندہ تھے اور سرفہرست رسول اللہ ﷺ کا نام نامی تھا۔ میں اس ادارے سے متاثر ہوا اور میں نے اس میں داخلہ لے لیا۔"

جزئیات پسندی

قائداعظم کی نظر مملکت کے بڑے سے بڑے امور سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک رہتی تھی۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری ایس ایم یوسف نے لکھا ہے:

"قائداعظم اصولی طور پر اس وقت تک کسی مسودہ قانون پر دستخط نہیں کرتے تھے جب تک وہ اس کے ہر لفظ پر بخوبی خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ وہ انتظامیہ کو چوکس رکھتے تھے اور کسی کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ علالت، خرابی صحت یا دیگر رکاوٹیں انھیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی تھیں۔"

اصول پرستی کی قدر

نرس کے تقرر پر وہ راضی نہ ہوتے تھے لیکن ٹمپریچر وغیرہ لینے اور دوا پیش کرنے کی خدمت پر وہ ایک لیڈی کمپاؤنڈر مقرر کرنے پر راضی ہو گئے۔ ایک بار قائداعظم نے اس سے اپنا ٹمپریچر پوچھا۔ اس فرض شناس لیڈی کمپاؤنڈر نے یہ کہہ کر معذرت کی "میں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر آپ کو ٹمپریچر نہیں بتا سکتی۔" اس کے بااصول انکار پر قائداعظم ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوئے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ وہ خود بااصول اور ڈسپلن کے پابند انسان تھے۔ جو باقاعدگی اور ڈسپلن سے کام کرے، اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔

ضرورت کے بغیر خرچ نہیں

زیارت کی بڑھتی ہوئی ٹھنڈک میں قائداعظم کے شب خوابی کے ریشمی کپڑے ناکافی تھے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے گرم پاجامے پہننے کا مشورہ دیا۔ قائداعظم نے کہا:

"میرے پاس گرم پاجامے نہیں ہیں۔ کیوں نہ گاڑھے کے بنائے جائیں۔"

ڈاکٹر نے کہا سوتی مناسب نہیں رہیں گے اس لیے میں نے خود ہی کراچی سے بیس گز وائل منگوانے کا اہتمام کیا ہے۔"

قائداعظم نے فرمایا: "ڈاکٹر سنیے، میری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کچھ مزید خریدنا چاہیں تو دوبارہ غور کر لیا کریں کہ اس کے بغیر کام چل سکتا ہے یا واقعی اس کی ضرورت ہے۔"

قائداعظم کسی چیز کو بے جا صرف کرنے کے قائل نہ تھے، خواہ وہ پیسا ہو، وقت ہو یا توانائی۔ اسی احتیاط یا اعتدال کی وجہ سے وہ زندگی میں اتنے بہت سے کام کر سکے۔ جب ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے اصرار کیا کہ واقعی گرم کپڑے کی ضرورت تھی تو مسکرا کر

فرمایا، اچھا تو ٹھیک ہے۔ ان کی افتادِ طبع ہی ایسی تھی کہ وہ بے دلیل کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ دلیل سے وہ بات بھی قبول کر لیتے جو انھیں طبعاً مرغوب نہ ہو یا جسے وہ عادتاً پسند نہ کرتے ہوں۔ مثلاً نبض سے دیکھ بھال کرانا انھیں پسند نہ تھا لیکن جب ڈاکٹر نے اس کی ضرورت پر زور دیا، تو انھوں نے اسے بھی قبول کر لیا۔

مسئلہ کشمیر سے دلچسپی

وہ چند دنوں سے خاص طور پر کشمیر کے خیال میں غلطاں و پیچاں تھے۔ ایک بار تیز بخار اور بے چینی کے عالم میں، مس جناح نے انھیں اس مسئلے کے متعلق بڑبڑاتے سنا۔ ایک بار نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ یہ کہتے سنے گئے:

"کشمیر کمیشن کو آج مجھ سے ملنا تھا، وہ اب تک کیوں نہیں آئے، کہاں چلے گئے؟"

کشمیر ان کے لاشعوری ذہن میں رچا ہوا تھا۔ وہ آخری سرکاری کاغذات، جن پر انھوں نے بعد مشکل اپنے دستخط ثبت کیے، اقوام متحدہ میں نمائندہ پاکستان کے اختیارات کے بارے میں تھے۔

قائد کا وصفِ خاص

قائداعظم کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت جو انھیں برصغیر کے تمام سیاست دانوں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے، وہ ان کی دیانت ہے۔ ذاتی اور سیاسی بھی، ہر سطح پر ان کی دیانت بے نظیر و بے مثال تھی۔ ان کی عظمت کا یہ ایک عجیب رخ تھا کہ وہ فراست ہی نہیں، دیانت میں بھی جواب نہیں رکھتے تھے۔

وہ باضمیر انسان اور سچے سیاست دان تھے۔ لوگ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہمعصر بھی ایسا ہی کرتے تھے لیکن وہ ان میدانوں میں بھی جائز کو جائز ہی سمجھتے۔ ان کا واسطہ انگریز اور ہندو، دو ایسی طاقتوں سے تھا جو کسی خانے بند نہیں تھیں۔ لیکن قائداعظم پھر بھی سیاسی جنگ میں کبھی معیار سے نہیں اترے۔ جو سوچا وہ کہا، جو صحیح سمجھا وہ کیا، جو وعدہ کیا پورا کیا۔

بمبئی میں ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک تین سال کا عرصہ ان کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ مقدمے تقریباً نہیں ملتے تھے۔ اُدھر خرچ جاری تھے اور خاندان کی کفالت بھی ان کے ذمے تھی۔ روپے کی اشد ضرورت تھی۔ اس زمانے میں بعض وکلاء نے کمیشن پر مقدمے دلانے کی پیش کش کی لیکن انھوں نے ان تجویزوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ایم اے اصفہانی نے اپنی کتاب میں ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ انھوں نے کہا:

"میں بھوکا مر جانے کو اس طرح کی تجاویز قبول کرنے پر ترجیح دوں گا۔"

اصفہانی نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کلکتے کی ایک نشست کے لیے مخالف امیدوار نے زرِ ضمانت لے کر بیٹھ جانے کی پیش کش کی۔ چند سو روپوں کی بات تھی۔ عبدالرحمن صدیقی اور اصفہانی دونوں پیسے دینے پر راضی تھے۔ قائداعظم نے سنا تو حکم دیا کہ انتخاب لڑا جائے اور مخالف امیدواروں کی دست برداری کو کسی قیمت پر نہ خریدا جائے۔ یہ پیسوں نہیں اصول کی بات تھی۔ بعد ازاں انھوں نے اصفہانی سے کہا:

"بیٹا! سیاست میں اخلاقی دیانت، نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اگر تم عوام کی زندگی میں کسی غلطی کے مرتکب ہوئے، تو بہت زیادہ ایسے انسانوں کو نقصان پہنچاؤ گے۔ جو تم پر انحصار رکھتے ہیں۔"

بعض اوقات انسان کی بڑائی کا اندازہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب "قائداعظم میری نظر میں" لکھا ہے:

"جب وہ ان کے گھر کلکتے میں ٹھہرے تھے، تو غیر ضروری بتیوں کو گل کر دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔"

اصفہانی نے کہا "آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔"

ان کا جواب تھا "روپے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر روپیہ

عوام کا ہو، تو اور بھی گناہ ہے۔"

پاکستان بننے کے بعد ایوان صدر میں بھی اکثر غیر ضروری روشنیوں کو گل کرتے دیکھے گئے۔ اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے:

"تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو منی آرڈر آتے تھے، ان کی دو آنے اور چار آنے رسیدوں پر بھی وہ خود دستخط کرتے تھے۔"

نیازمندوں کے عرض کرنے پر کہ یہ خدمت کسی اور سپرد کر دی جائے چونکہ اس میں ان کا قیمتی وقت صرف ہوتا ہے، انھوں نے جواب دیا:

"بات رقم کی مقدار کی نہیں جذبے اور اصول کی ہے۔ جتنا جس کے پاس ہے، وہ پاکستان کے لیے دے رہا ہے۔ میں خود دستخط کر کے اس کے جذبے کی قدر کرنا اور اسے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا پیسا پیسا میرے علم میں ہے اور محفوظ بھی۔"

دلچسپ واقعات

بنیادی طور پر قائداعظم سنجیدہ دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی سنجیدہ نوعیت کی تھیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر بھی یہی ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ اور متین انسان ہیں۔ سنجیدہ وہ ضرور تھے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت کا پہلو یہ بھی تھا کہ مناسب اور موزوں مواقع پر وہ ہنستے بھی تھے۔ سلجھے مذاق سے لطف اندوز بھی ہوتے۔ خود بھی کبھی کبھی دلچسپ واقعات اور لطیفے سناتے۔

ایک مرتبہ قائداعظم لاہور میں اپنے ایک عزیز دوست اور متحدہ لیگی رہنما، ملک برکت علی کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شریک تھے۔ کھانے کے بعد جو فیرنی پیش کی گئی، اس میں غلطی سے چینی کے بجائے نمک مل گیا تھا۔ جو مہمان فیرنی کا چمچہ منہ میں ڈالتا، منہ بناتا۔ میزبان پریشان اور شرمندہ تھے۔ قائداعظم میزبان کے آڑے آئے۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور مہمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"حضرات! نمکین فیرنی پر متعجب نہ ہوں۔ ملک صاحب آپ کو اپنے گھر کا زیادہ سے زیادہ نمک کھلانا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان کا نمک حلال کر سکیں۔"

ان کی ظرافت اور حاضر جوابی حریفوں کے لیے طنز کی تلوار بن جاتی تھی۔ ایک دفعہ کسی مقدمے میں بحث لمبی ہو گئی۔ قائداعظم کی عادت تھی کہ وہ تفصیل سے پورا تجزیہ کرتے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ جھنجھلایا ہوا تھا، چمک کر بولا:

"مسٹر جناح! میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سنتا ہوں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔"

قائداعظم نے برجستہ جواب دیا: "جناب والا! آپ کے دونوں کانوں کے درمیان والی جگہ خالی ہے۔"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ قائداعظم ایک مقدمے میں بڑے اعتماد اور قدرے جارحانہ انداز سے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔ بھڑک اٹھا۔ تنبیہ کے لہجے میں بولا: "مسٹر جناح! نہ بھولیے آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں۔"

قائداعظم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "جناب والا! آپ کے سامنے بھی کوئی تھرڈ کلاس وکیل بحث نہیں کر رہا۔"

ایک اور مقدمے میں ایک بدخو غلط جج نے کہا: "مسٹر جناح! زور زور سے نہ بولیے میں سن نہیں رہا۔"

قائداعظم نے کہا: "غور سے سننا آپ کا کام ہے، میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں۔"

لیکن قائداعظم کی حاضر جوابی اور طنز کے اصلی جوہر سیاسی میدان میں کھلتے تھے۔ تب وہ اپنی برجستہ گوئی اور طنز کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے۔ کانگریسی لیڈر موہن لال چند گاندھی نے مہاتما کا روپ دھار رکھا تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کے نام سے معروف تھے۔ ان کے روحانی کمالات کا بھی ہندوؤں میں بڑا چرچا تھا۔ یوں تو وہ تمام ہندوستانیوں کا لیڈر ہونے کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے خالص ہندو تھے اور ہندو مفادات کے کٹر محافظ! قائداعظم گاندھی کی منافقت کا

حال جانتے تھے کہ یہ بھی سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ دونوں سیاست کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے اور دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ گاندھی کے کسی چیلے نے اخبارات میں یہ خبر چھپوائی کہ کل شام مہاتما جی اپنے آشرم کی کٹیا میں پرارتھنا کر رہے تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ کٹیا میں آ گیا۔ مہاتما جی نہ اس سے ڈرے نہ انھوں نے اس کی پروا کی، برابر پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد ایک دو دفعہ چکر لگائے اور جیسے چپکے سے کٹیا میں داخل ہوا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر چلا گیا۔ بس پھر کیا تھا کانگریسی حلقوں، ہندو جاتی اور نیشنل پریس نے مہاتما گاندھی کی کرامت کے طور پر اس خبر کی خوب تشہیر کی۔ وقت بے وقت و جہ بازار میں، عام جلسوں اور نجی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس دوران ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے قائداعظم سے پوچھا: "آپ نے سانپ اور گاندھی جی کی خبر اخبارات میں پڑھی ہے؟"

آپ نے فرمایا: "ہاں پڑھی ہے۔"

صحافیوں نے سوال کیا: "آپ کا کیا خیال ہے، یہ حقیقت ہو سکتی ہے یا محض پراپیگنڈہ سٹنٹ؟"

جواب ملا: "ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو۔"

ایک من چلے رپورٹر نے پوچھ لیا: "قائداعظم، سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کیا توجیہہ کریں گے؟"

قائداعظم مسکرائے۔ آنکھوں میں ظرافت کی چمک پیدا ہوئی اور کہا: "پیشہ ورانہ اخلاق کی بات ہے۔" (ترجمہ: کیڑے اپنے جیسے جان دار کو نہیں ڈسا کرتے)

اس سیاسی طنز کا جواب نہیں! جو لوگ گاندھی کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں، وہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔

جون ۱۹۳۷ء میں قائداعظم پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے لاہور تشریف لائے۔ اس وقت مسلم لیگ بالکل منظم نہیں تھی اور صوبے پر یونینسٹ پارٹی چھائی ہوئی تھی۔ قائداعظم کی ریل رات کو پہنچی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ جیسے ہی قائداعظم نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا، سارے ریلوے اسٹیشن کی روشنی چلی گئی۔ مجلس استقبالیہ کے ارکان گھبرا گئے۔ تبھی قائداعظم نے اپنی گرج دار آواز میں برجستہ فرمایا: "دیکھا! لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہو گیا۔"

واٹس ایپ کا نیا حیرت انگیز فیچر

واٹس ایپ نے اپنے ۸۰ کروڑ سے زائد صارفین کے لیے ایک نیا فیچر متعارف کرایا ہے جس نے اس سروس میں سرچ کے فنکشن کو ڈرامائی حد تک بہتر بنا دیا ہے۔ اینڈرائڈ موبائل فون پر اس ایپلیکیشن کا ۲.۱۲ یا اس سے بہتر ورژن استعمال کرنے والے صارفین محض الفاظ سے اپنی پوری میسج ہسٹری کو سرچ کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے واٹس ایپ صارفین کسی ایک بات چیت کے مخصوص فقرے یا کی ورڈز کی سرچ کر سکتے تھے۔ تاہم اب نئی یونیورسل سرچ کے ذریعے صارفین پوری آرکائیو، ایکٹو چیٹس اور گروپ بات چیت کو بیک وقت کھنگال سکتے ہیں۔ اس نئی سرچ سروس کے لیے چیٹس ٹیب پر نیوی گیٹ کریں اور پھر اوپن کنورزیشن لسٹ کو اوپن کریں جس کے بعد مینیو کے اوپر ایک سرچ بار ظاہر ہونے لگے گی۔ بس وہاں سرچ کے الفاظ کو ٹائپ کریں جیسے موبائل نمبر یا کچھ بھی۔ ایسا کرنے پر واٹس ایپ کی جانب سے ایپ ہسٹری میں اس سے ملتے جلتے الفاظ کی ساری ہسٹری سامنے آجائے گی۔

(انتخاب: سعدیہ اسلم، منانواں، مظفر گڑھ)



یہ ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کی ایک پُرخطر شام تھی۔ ضلع جالندھر میں تحصیل نکودر کے مسلمان دیہات... میانوال مولویاں، خان پور، سیدپور، سنگووال، میانوال، دراعیاں، جلی وال میں آباد مسلمانوں کو تاحال یہ امید تھی کہ دریائے ستلج تک کے علاقے پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان دیہات میں جلی وال ایک پرانی ندی (وینیں) کے پار سکھ ریاست کپورتھلہ کی سرحد پہ واقع انگریزی عملداری کا آخری گاؤں تھا۔

یہ چھوٹا سا گاؤں شیعہ مسلمانوں کا مسکن اور چالیس گھرانوں مشتمل تھا۔ چاروں اطراف سکھوں کے دیہات سے گھری آبادی تھی۔ چونکہ اس گاؤں کی دفاعی پوزیشن بہت کمزور تھی لہٰذا سکھوں نے تقسیم کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے اسی میں لوٹ مار کا منصوبہ بنایا۔ سکھوں کی پشت پناہی ملسیاں (مشہور شاعر عرش ملسیانی کی جنم بھومی) اور شاہکوٹ جیسے بڑے قصبوں کے ہندو بنیئے کر رہے تھے۔

انھوں نے مربوط و منظم اسکیم بنا کر پورے علاقے کے مسلمانوں کو ختم کرنے کی خاطر سکھوں کو شہ دے رکھی تھی اور املاک لوٹ کر راتوں رات امیر بن جانے کا لالچ بھی دے رکھا تھا۔ انھیں

اور طبلِ جنگ بج گیا

مٹھی بھر اسلامیوں نے جب مسلح سکھوں کو دن میں تارے دکھلا دیے... ایک یادگار داستان

نبی احمد لودھی



اطلاع مل چکی تھی کہ لدھیانہ، گورداسپور، فیروزپور، امرتسر سمیت ریاست کپورتھلہ بھی بھارت میں شامل ہو گی تاکہ جموں و کشمیر کی مسلمان ریاست پر غاصبانہ قبضہ جمانے کا راستہ صاف ہو سکے۔ مقامی ہندوؤں اور سکھوں کا خیال تھا کہ کمزور دفاعی پوزیشن کے باعث نلی وال میں مسلمان آبادی کا صفایا علاقے کے تمام مسلمانوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دے گا۔ یوں یہ کیفیت مزید لوٹ مار اور قتل و غارت کے لیے راستہ ہموار کرے گی۔

شام ہوتے ہی مسلح سکھوں نے نلی وال پر دھاوا بول دیا۔ وہاں کے دلیر مسلم مردوں اور عورتوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرے مسلمان دیہات کو حملے کی اطلاع دینے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ نقاروں پر چوٹ پڑی اور یکے بعد دیگرے تمام قریبی مسلمان دیہات میں بھی نقارے بجائے جانے لگے۔ مقابلے میں سکھوں کے دیہات سے سنکھ (ناقوس) کی مکروہ آوازوں کا شور و غوغا بلند ہوا۔ چند منٹ کے اندر اندر فضا میں نقاروں کے دھماکوں اور سنکھ کی آوازوں میں معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ نقاروں کا سلسلہ تحصیل نکودر کے دیہات نلی، تلونڈی، سلامت پور اور شاہ پور تک پھیل گیا۔

جلد ہی پچیس پچیس نوجوانوں پر مشتمل دستے میانوال مولویاں پہنچنے لگے جو تب مسلمانوں کے تمام دیہات کا انصرامی مرکز (کنٹرول سنٹر) تھا۔ وہاں سے مسلح دستے حسب ضرورت میدان جنگ کی طرف روانہ کیے جاتے تھے۔ ادھر میانوال مولویاں کا اپنا ہراول دستہ بھی نلی وال کے مسلمانوں کی مدد کے واسطے روانہ ہوا۔ میں بھی اس ہراول دستے میں شامل تھا۔

میں اس وقت تلونڈی اسلامیہ ہائی اسکول میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ (اسی تلونڈی میں پاکستان کے شریف النفس وزیراعظم چودھری محمد علی پیدا ہوئے) میرے پاس اپنے سب انسپکٹر ماموں، عطا اللہ خان (مرحوم) کی کرچ (یعنی سیدھی تلوار) اور مقامی لوہاروں کا تیار کردہ ایک برچھا تھا۔ جبکہ ہراول دستے میں شامل دوسرے جانبازوں میں سے امان اللہ خان، اسد اللہ خان اور فاروق احمد خان کے پاس کارتوس والی ایک یا دو نالی والی ۱۲ بور کی بندوقیں تھیں۔ دو نوجوانوں، نور احمد لوہار اور عزیز احمد کمہار کے پاس توڑے دار دیسی ساخت کی توپیں تھیں۔ انھیں گاؤں کے واحد راجپوت لوہار خاندان سے تعلق رکھنے والے احمد اللہ اور حبیب اللہ نے بہ مہارت نلکوں کے پائپ سے تیار کیا تھا۔

میں نے گھر سے روانہ ہوتے ہوئے اپنی بڑی بہن سے صرف اتنا کہا "ہماری کامیابی کی دعا کرنا۔ اگر خدانخواستہ سکھ بعد میں گاؤں پر حملہ آور ہو جائیں اور ہمارا دفاع ناکام رہے تو یاد رکھنا، عزت کی موت ذلت کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک خنجر اپنی بہن کے حوالے کیا اور خود دوڑ کر ہراول دستے میں شامل ہو گیا۔

نلی وال جاتے ہوئے ہراول دستہ راہ میں آنے والے مسلم گاؤں، جب خان پور پہنچا تو وہاں گلیوں میں عورتوں اور مردوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ بعض خواتین اور بچے کچے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے اونچی آواز سے مجاہدوں کی سلامتی اور کفار کی شکست کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اسی دوران ایک بوڑھی عورت اپنے گھر سے بجلی کی پھرتی سے باہر نکلی اور ہراول دستہ کو روک لیا۔ ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکی بہت سے کھیس اور چادریں اٹھائے ہوئے تھی۔

اماں نے بڑی شفقت سے دستے کے تمام نوجوانوں کی بلائیں لیں اور نہایت درجہ پیار میں ڈوبے الفاظ میں کہنے لگی "ماں صدقے، ماں واری، میرے بچو! اللہ تمھارا نگہبان ہو۔ مائیں بہنیں تم پر قربان۔ پرانے زمانے میں بہادر سروں پر خود اور جسم پر زرہ بکتر پہنا کرتے تھے۔ آج ان کافروں نے تمھیں نہتے اور تن برہنہ گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ تمھیں اتنی فرصت بھی نہیں دی کہ اپنی حفاظت کا تھوڑا بہت انتظام کر کے نکلتے۔ میں تمھارے جوش و جذبے پر قربان، یہ چادریں اور کھیس اپنے سروں اور سینوں کے گرد لپیٹ لو تاکہ کچھ محفوظ ہو جاؤ۔ یہ تمھیں یہ بھی یاد دلاتے رہیں گے کہ تمھاری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی ناموس تمھارے دم قدم سے ہے۔"

یہ کہہ کر اماں چادریں اور کھیس بیٹی کے ہاتھ سے لے کر نوجوان مجاہدوں کے سروں اور سینوں کے گرد لپیٹنے لگی۔ عجیب

منظر تھا۔ ایسا سماں چشم فلک نے شاید ہی دیکھا ہو! آج بھی جب وہ منظر یاد آئے تو آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں۔ نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر اور پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کی صداؤں اور اسلام زندہ باد کے پرجوش نعروں نے پوری فضا پر ایک مستی طاری کر رکھی تھی کہ ہر دیکھنے والا آبدیدہ اور کیف و سرور میں سرمست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فرشتے بھی ہفت آسمانوں پر مجاہدوں کی سلامتی و کامیابی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کاش وقت کا دھارا وہیں رک جاتا۔

ہمارا ہراول دستہ خانپور سے ہوتا نمازی پور اور بادشاہ پور پہنچا۔ آگے ندی تھی۔ وہ اللہ کا نام لے کر پانی میں اتر گیا۔ شوقِ شہادت اور کفار سے پنجہ آزمائی کی دھن میں پانی یوں مسخر ہوا جیسے وہ جذبۂ صادق کے سامنے سرنگوں ہو کر خشک ہو گیا ہو۔ ندی کے دوسرے کنارے پہنچ کر دستے میں شامل ایک سابق فوجی، نور محمد خان نے توجہ دلائی کہ دیسی ساخت کی توپوں کو ایک بار چلا کر ضرور دیکھ لینا چاہیے تاکہ میدان کارزار میں توپچی پورے اعتماد کے ساتھ انھیں داغ سکیں۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی اطراف و اکناف کا جائزہ لینے میں اب مدد کر رہی تھی۔ سکھوں کے ایک بڑے گاؤں کی جانب منہ کر کے توپوں میں چھرے اور بارود بھر انھیں ٹھونک کر تیار کیا گیا۔ چلنے پر توپوں کے دہانوں سے ایسی خوفناک گرج پیدا ہوئی کہ کان پھٹنے کو آ گئے۔ ویرانے میں درخت کی چوٹی توپوں کا نشانہ بنی تھی، وہ دشمنوں کے سروں کے مانند ٹوٹ کر نیچے آ رہی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ ایک فلک شگاف نعرۂ تکبیر بھی توپوں کی گھن گرج کے ساتھ بلند ہوا جس سے کئی ولی کے مسلمانوں کو کمک پہنچنے کا یقین ہو گیا۔

دوسری جانب دشمنوں کے دیہات میں بھی سنکھ بجنے کی آوازیں تیز تر ہو گئیں۔ نقاروں پر بھی پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ چوٹ پڑنے لگی۔ ہراول دستہ اب کافی ہوشیاری سے قدم اٹھا رہا تھا۔ دشمن کے علاقے میں اس پر کسی بھی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ بندوق بردار دستے کے دو سپاہیوں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ صرف توپچیوں کی حفاظت کریں۔ کئی ولی اب قریب تھا۔ نقارے کی آواز گونج رہی تھی لیکن گرد و نواح میں دشمن کی کارروائی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ دستہ نعرے لگاتا جونہی کئی ولی سے باہر واقع کھلے میدان میں پہنچا تو چار پانچ جوانوں نے اچانک اٹھ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

دستے کے لوگ انھیں سن کر حیرت میں ڈوب گئے کہ ان نعروں میں چند نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ چونکہ سبھی نے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اس لیے ان کی پہچان مشکل ہوئی۔ خواتین نے مردانہ لباس بھی پہن رکھے تھے۔ ہمارے دستے میں شامل ایک شخص نے ذرا رعب دار آواز میں پوچھا ''کون ہو تم؟''

ایک باریک نسوانی آواز نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا ''تمھاری بہنیں، مائیں اور بیٹیاں! اسلام کی بیٹیاں اور آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰﷺ کی غلام'' چلے آؤ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ ہم اپنے محسن مجاہدوں کا استقبال کرنے آئی ہیں۔ دشمن ہم اور ہمارے طبلِ جنگ سے گھبرا کر میدان چھوڑ بھاگا ہے۔''

دستے کے لوگ ابھی تک حیرت زدہ تھے کہ وہ جنھیں کانوں اور دیکھتی آنکھوں کیا سن اور دیکھ رہے ہیں۔ مزید استفسار پر انکشاف ہوا کہ سکھوں نے حملہ کیا تو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ گاؤں کے تمام مرد و زن، بوڑھے جوان اور بچے سروں پر پگڑیاں باندھے، لاٹھیاں، نیزے اور بھالے اور کلہاڑیاں اٹھا باہر نکل آئیں۔ یوں دشمن کو یہ تاثر دے سکیں کہ سیکڑوں افراد سروں پر کفن باندھے اس گاؤں میں موجود ہیں۔ حسب توقع سکھ حملہ آور یہی سمجھے کہ ضرور یہ مسلمان پہلے سے مقابلے کی تیاری کر چکے اور اب طبلِ جنگ سے کمک بھی پہنچ چکی۔ لہٰذا وہ الٹے پاؤں دم دبا کر بھاگ نکلے۔

جلد ہی ہراول دستے کے پیچھے مزید دستے وقفے وقفے سے کئی ولی پہنچنے لگے۔ چند گھنٹوں میں وہاں جامِ شہادت نوش کرنے کی تمناؤں میں چھپا ہزاروں سیکڑوں پروانوں کا جمِ غفیر جمع ہو گیا۔ ہر کھلا میدان نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے

لگا۔ علی وال کی بیٹیاں اب دودھ کی بالٹیاں لیے نمودار ہوئیں اور ہر کسی کی خوشامد کرنے لگیں کہ ایک گلاس ضرور نوش کیجیے۔ گاؤں کے بوڑھے ہمارا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتے اور معذرت بھی کرتے جا رہے تھے کہ رات کے اس سمے وہ مہمانوں کی کما حقہ خدمت نہیں کر پائے۔

آدھی سے زائد رات بیت چکی تھی پو پھٹنے کا وقت قریب تھا لیکن امدادی دستوں کا سلسلہ ابھی جاری اور تانتا بندھا ہوا تھا۔ اب تمام مجاہدین نے علی وال والوں کو مشورہ دیا کہ وہ گاؤں خالی کر کے میانوال مولویاں آ جائیں۔ اول یہ مسلم ریاست کے وسط میں آباد تھا۔ دوم گاؤں کے اکثر لوگ پولیس یا فوج میں ملازم ہونے کی وجہ سے جنگی چالیں چلتے اور سمجھتے تھے۔ چنانچہ علی وال کے لوگ آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کے ساتھ اپنے گھر بار چھوڑ ہمارے گاؤں پہنچ گئے۔ اب بادشاہ پور سرحدی گاؤں کی حیثیت اختیار کر گیا، اس لیے وہاں کے لوگوں میں بھی بے اطمینانی پھیل گئی۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو میانوال پہنچا دیں اور خود ندی کو حفاظتی سرحد بنا کر ڈٹ جائیں۔

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کا دن انھی انتظامات میں گزر گیا۔ ادھر نقارے اور سنکھ بھی بجتے رہے۔ سکھوں کے جنگجوؤں کا اجتماع "موے وال کھیریاں" اور مسلمانوں کا اجتماع "خان پور" گاؤں میں ہوا۔ مسلمانوں کی قیادت کے فرائض میانوال مولویاں کے ریٹائرڈ پولیس افسر محمد عالم خان مرحوم (سابق ڈی آئی جی پولیس فاؤنڈیشن شفیق احمد خان کے والد)، علاقے کے سفید پوش بزرگ حافظ یار محمد خان (مرحوم) راقم کے ماموں فیض اللہ خان (مرحوم) پولیس آفیسر اسد اللہ خان (مرحوم) اور عنو وال (راجپوتوں کے گاؤں) کے سردار احمد علی خان (مرحوم) نے انجام دیے۔

شام کے قریب موے وال کھیریاں کی جانب سے تین سکھ گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں سفید جھنڈے لیے خان پور پہنچے۔ مسلمان راہنماؤں کی جانب سے ان کی پوری حفاظت کا حکم صادر کیا گیا۔ ان سکھوں نے صلح کی درخواست پیش کی اور اپنی طرف سے امن و امان قائم رکھنے کی یقین دہانی کرائی۔ گوروجی کی سوگندیں اٹھا کر یقین دلایا کہ وہ عہد کی پابندی کریں گے۔ فیصلہ ہوا کہ ہم مسلمانوں کو واپس ان کے گاؤں بھیج دیں، وہ واپس جا کر سکھوں کو منتشر کر دیں گے۔ فیصلے پر عمل درآمد ہو گیا لیکن رات کو چند سکھوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے بادشاہ پور پر رائفلوں اور دیگر ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اچانک حملہ کر دیا۔ گاؤں کی حفاظت پر مامور مقامی مجاہدوں میں سے پانچ شہید ہو گئے۔

نقارے پھر بجنے لگے اور ناقوس کی منحوس آواز بھی فضا کو مسموم کرنے لگی۔ تب گاؤں کی حفاظت و امداد کے لیے بھیجے گئے دستوں نے متحرک ہو کر سکھوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران گاؤں کی آبادی اپنے ڈھور ڈنگر اور اہل و عیال لیے پانچ مجاہدوں کے لاشے اٹھائے میانوال پہنچ گئی۔ طبل جنگ پھر بجنے لگا تھا، اس لیے خانپور میں پھر سے نوجوانوں کا اجتماع پھر شروع ہو گیا۔ اگلے دن سکھوں کا ایک گروہ سفید جھنڈے لیے حاضر اور معافی کا خواستگار ہوا۔ پانچ شہدا کے اعزہ کو منہ مانگا خون بہا دینے کا عندیہ بھی ظاہر کیا گیا۔ قریب تھا کہ صلح ہو جاتی لیکن میانوال اراعیاں کے ایک جوشیلے نوجوان، چودھری محمد اسلم نے دوسرے پھر سے مجاہدوں کو ساتھ ملا کر اعلان کیا "اب صلح کا وقت ختم ہو چکا۔ سکھ تین مرتبہ عہد شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ پانچ شہیدوں، عزیز کمہار اور دوسرے نوجوان زخمیوں کے خون کی قسم! اب جب تک ہم ہر شہید کے عوض ایک سکھ گاؤں خاک و خون میں نہلا کر پیوند خاک نہیں کر دیتے، ہمیں ہمارا اللہ اور تاریخ معاف نہیں کرے گی۔"

دھوکا

ایک دیہاتی غلہ منڈی گیا اور بوریاں دیکھنے لگا۔ ایک بوری میں چینی بھری ہے مگر اس کے اوپر نمک لکھا ہے۔ اس نے قریب کھڑے دکاندار سے اس انہونی کے متعلق پوچھا، تو وہ کہنے لگا: "مکھیوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایسا لکھا ہے۔"

(فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

چودھری اسلم نے پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ جوشِ شجاعت میں متعدد گھڑسوار اور پیدل دستے ان کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہو گئے۔ نعرۂ تکبیر سے گرد و اطراف گونجنے لگے۔ چودھری اسلم نے اسی وقت موہلے وال ٹھیریاں کا رخ کیا۔ ان کی برق رفتاری دیکھنے کے قابل تھی۔ پیدل دستے بھی ساتھ بھاگتے ہوئے بجلی کی تیزی سے میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسلم کی جرأت دیکھ کر تمام نوجوانوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ اب مسلمان راہنماؤں نے بھی تمام دستوں کو میدان جنگ کی جانب کوچ کا حکم دے دیا۔ نقاروں کی چوٹ پہ جوشیلے نوجوان نعرۂ تکبیر بلند کرتے دشمن کے گاؤں پر ٹوٹ پڑے۔

میں بھی اس حملے میں شامل تھا۔ سکھوں نے موہلے وال سے باہر نکل کر شاہکوٹ ملسیاں سے لوہیاں، فیروزپور کی طرف جانے والی ریلوے لائن کو دفاعی مورچہ بنایا اور خوب مقابلہ کیا۔ ہماری توڑے دار توپوں نے بھی اپنے جوہر دکھائے۔ وہ ایک وقت میں پانچ دشمنوں کو ڈھیر کرتی رہیں۔ جو نوجوان توپچیوں کی حفاظت پر مامور تھے، ان میں سے امان اللہ خان کی بندوق کا بٹ توپچی کے ہاتھ سے توپ چھوٹنے کے باعث ٹوٹ گیا۔ دراصل توپ میں زیادہ بارود ڈالنے کی وجہ سے ایسا زوردار دھماکا ہوا کہ یہ وار بارہ سکھوں کو وہیں ڈھیر کر گیا۔ امان اللہ خان نے بندوق پھینک دی۔ لیکن نور احمد لوہار نے وہ اٹھائی اور ہاتھ کی ہتھیلی سے بٹ کا کام لیتے ہوئے فائر کیا تو ایک سکھ گھڑسوار کو ڈھیر کر دیا۔

اب دیگر بندوق بردار مجاہدوں نے مل کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ سکھوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پھر کیا تھا، اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور اگلے گاؤں پر یلغار شروع ہوئی۔ لیکن سکھ عموماً خود ہی گاؤں خالی کرتے چلے گئے۔ چودھری اسلم کی سرکردگی اور قیادت میں سکھوں کے پانچ گاؤں خاکستر کیے گئے۔ پھر مزید کارروائی اگلے دن یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء پر ملتوی کر دی گئی کیونکہ رات بہت گزر چکی تھی۔

مسلمان مجاہدین شاداں و فرحاں فتح یاب ہو کر واپس ہوئے۔ چودھری اسلم نے پورے لشکر کی دعوت کا اہتمام کیا۔ میدان میں سیکڑوں چارپائیاں بچھی تھیں اور دیگیں چڑھا دی گئی تھیں۔ بکرے ذبح ہوئے۔ مجاہدین اپنے اپنے کارنامے اور مشاہدات ایک دوسرے کو سنا رہے تھے کہ اچانک شکست خوردہ سکھوں نے مجتمع ہو کر شب خون مار دیا۔ اس حملے میں تین نوجوان شہید ہوئے۔ جیسے ہی دوسرے مجاہدین مقابلہ کرنے اٹھے، سکھ فرار ہو گئے۔ اگلے دن یہ افسوس ناک خبر ملی کہ جالندھر، لدھیانہ، فیروزپور، پٹھانکوٹ، گورداسپور اور امرتسر بھارت کا حصہ بن چکے کیونکہ سکھ راہنماؤں نے پاکستان میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

اب ہم مسلمانوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ اسی روز ایک ہوائی جہاز جلے سکھ دیہات کا جائزہ لینے پہنچ گیا۔ بلوچ رجمنٹ کی ایک ٹکڑی بھی جیپ پہ سوار میانوالی مولویاں پہنچی۔ انھوں نے ہمارے راہنماؤں کو مشورہ دیا کہ وہ چونکہ تھوڑی تعداد میں ہیں، اس لیے سب مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ ہجرت کر کے پاکستان چلے جائیں۔ بصورت دیگر ان کی اطلاع یہ تھی کہ بڑے پیمانے پر قتل و غارت کا منصوبہ بنایا جا چکا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح تین شہیدوں کو سپردِ خاک کرنے کے بعد ہجرت کا فیصلہ کیا جا رہا تھا کہ ایک نیا مسئلہ سامنے آ گیا۔ سکھوں کے تباہ شدہ دیہات سے چند نوجوان کچھ سکھ لڑکیوں کو پکڑ لائے تھے۔ انھوں نے کسی عورت کے ساتھ ناروا سلوک کرنے سے گریز کرتے ہوئے ان سے شادی کی اجازت طلب کی۔ ہمارے بزرگوں نے الحمدللہ یہ قابل فخر فیصلہ کیا کہ لڑکیوں کو ان کے رشتے داروں کے حوالے کر دیا جائے۔ لڑکیوں نے بتایا کہ وہ عرش ملسیانی کے قصبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا ایک بیل گاڑی پر انھیں بٹھا مسلح نوجوان مجاہدین کی حفاظت میں ملسیاں کے سکھوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نیک کارروائی کا اثر یہ ہوا کہ سکھوں کی آتش انتقام قدرے سرد ہو گئی۔

آخر ہمارے بزرگوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ سو قافلہ بلوچ رجمنٹ کے مٹھی بھر جوانوں کی ہمراہی میں سمت پاکستان چل پڑا۔ اس قافلے میں تمام مسلم دیہات کے مرد و زن شامل تھے۔ شاہکوٹ تھانہ کے قریب سکھوں نے قافلہ

روک لیا اور مطالبہ کیا کہ محمد عالم خان، حافظ یار محمد خان، سردار احمد علی خان یا چودھری اسلم میں سے کسی ایک کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ تبھی قافلہ آگے جا سکے گا۔

اس موقع پر میانوال اراعیاں کے بہادر سپوت، چودھری اسلم نے پھر حد درجہ ایثار، قربانی اور زبردست جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے کہا ''سکھوں کا اصل "مجرم" وہ ہے، اس لیے خود تھانے میں پیش ہو گا۔''

انھیں بہت منع کیا گیا لیکن وہ نہ مانے۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تھانے کے باہر جمع ہندوؤں اور سکھوں میں پہنچ کر اعلان کیا ''تم مجھ سے اپنا بدلہ لے سکتے ہو۔ ہمارے بزرگ تو آپ لوگوں سے مسلسل صلح کی کوشش کرتے رہے۔ آپ کی خواتین کو بھی نہایت عزت و احترام کے ساتھ محفوظ لوٹا دیا گیا۔'' لیکن ان کی باتیں سنی ان سنی کر کے ہندو اور سکھ مسلح افراد نے چودھری اسلم پر گولیوں اور نیزوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ مسلمان قوم کے اس بہادر سپوت نے سینکڑوں زخم کھا کر جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ہندوؤں سکھوں نے آتش انتقام میں ان کی لاش گھوڑوں کے سُموں سے روند ڈالی..... اس طرح اسوۂ حسینی کی یاد تازہ ہوئی۔

اس دوران بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے قافلے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ قافلے کے نوجوان خود بھی مسلح تھے اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار، چنانچہ بہت زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوؤں اور سکھوں کو مزید حملے کی جرأت نہ ہو سکی۔ قافلہ اگلے روز کھوہ کیمپ پہنچ گیا۔ کھوہ کیمپ میں ہجرت کے متمنی ہزارہا مسلمان تارکین وطن جمع تھے۔ گرد و نواح کے کنوؤں میں پانی ختم ہو گیا تھا۔ جو باقی بچے، ان میں سکھوں نے زہر ڈال دیا۔ کئی افراد وہ پانی پی کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ چند ہی دن میں خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ مویشی بھی ذبح کر لیے گئے۔ تین دن میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔

میں اللہ بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو بستی پور کے پٹھانوں نے چار پانچ فوجی ٹرک منگوا لیے۔ بلوچ فوجی ہی ان ٹرکوں کے نگران تھے۔ ٹرکوں میں سب سے پہلے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بٹھایا گیا۔ میں نے بھی نانی صاحبہ اور ہمشیر محترمہ کو باری باری اٹھایا اور ٹرک میں بٹھا دیا۔ ٹرک کھچا کھچ بھر گیا۔ جب وہ چلنے لگا، تو اس کا عقبی پھٹہ گرا۔ ہم نصف درجن سے زائد نوجوانوں نے اپنے پاؤں اس پر ٹکائے اور اوپر والی فولادی پٹی پکڑ لی۔

فوجی جوانوں نے ہمیں اترنے کی کوشش کی، تو ہم نے کہا کہ ان عورتوں اور بچوں کی حفاظت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا، پھٹہ ٹوٹا، تو تم گر کر مر جاؤ گے۔ ہم نے کہا، پہلے کون سے زندہ ہیں، لوٹنے دو! ان کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اس طرح یہ نوجوان عورتوں اور بچوں کے لیے ڈھال بن گئے ہیں لہٰذا ہمیں کھڑے ہونے کی اجازت مل گئی۔

یہ پانچ ٹرکوں کا قافلہ تھا۔ ہمارے باہر کھڑے ہونے اور فوجی جوانوں کی مشین گنوں کی دہشت سے حملہ کرنے کے باوجود دشمن پسپا ہوتا رہا۔ بالآخر ہم ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح پو پھٹنے کے قریب واہگہ پار کر گئے۔ ٹرک رکے اور فوجی جوانوں نے مبارک باد دی کہ آپ اپنی محبوب سرزمین پاک میں داخل ہو کر محفوظ ہو چکے۔ عورتیں ایک دوسرے کی گردوں پر اور نوجوان اتر کر زمین پاک پر قبلہ سمت دیکھے بغیر سجدہ ریز ہو گئے۔ سبھی نے اللہ بزرگ و برتر کا شکر ادا کیا۔ ایک سرمدی کیفیت میں آنکھوں سے آنسو رواں تھے جبکہ زبان میں بولنے کی سکت نہ تھی۔

فوجی ٹرکوں نے کچھ ہی دیر میں ہمیں والٹن کیمپ پر اتار دیا۔ وہاں خستہ حال اور لٹے پٹے مسلمانوں کا وسیع و عریض شہر آباد ہو چکا تھا۔ نوجوان کارکن بالٹیوں میں چنے کی دال، پانی اور بڑے بڑے "چھابوں" میں روٹیاں لیے گھوم رہے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پانی پیش کیا۔ اس "آب حیات" کو پی کر آزاد وطن کی اہمیت کا احساس ہوا۔ روٹیوں پر دال ڈال کر ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئیں۔ تب میں ایک تہمد اور کرتا پہنے ہوئے اور پاؤں و سر سے برہنہ تھا۔ خواتین بھی تین کپڑوں میں تھیں اور یوں پاکستان میں ہماری زندگی کے سفر کا آغاز ہوا۔



”ہم میجر خورشید انور پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ کوئی حکومت یا طاقت انھیں گرفتار نہیں کر سکتی۔ یہ شیر دل مجاہد پنجاب کا جگر گوشہ نہیں، سرحد کے مسلمانوں کی متاع صد فخر و ناز بھی ہے۔“ مردان کے ایک نوجوان یوسف زئی پٹھان نے بڑے جوش و خروش سے گفتگو کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

مردان پٹھانوں کا گہوارہ ہے اور یوسف زئی قبیلہ افغانی روایات کا مظہر اور علمبردار۔ اس لیے ایک یوسف زئی پٹھان سے یہ باتیں سن کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نوجوان نے میرے جذبات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ”پٹھان بھی تحریک پاکستان کے سرگرم حامی ہیں۔ کانگریس نے پٹھانوں کو گمراہ کرنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر اب ہم اس دام ہمرنگ زمیں میں نہیں آئیں گے۔ اب حقیقت حال ہم پر آشکار ہو چکی۔ اس کا سہرا میجر خورشید انور کے سر ہے اور ان شاءاللہ یہ صوبہ بھی پاکستان میں شامل ہوگا۔“

تحریک آزادی کی افسانوی شخصیت

میجر خورشید انور

جنھوں نے کانگریسی گڑھ، صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لیے اپنا تن، من، دھن وار دیا

حکیم آفتاب احمد قرشی

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے ہند کے تمام صوبوں میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ صرف صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو بعض اسباب کی بنا پر کما حقہ کامیابی نصیب نہ ہوئی اور سرحد میں کانگریسی وزارت ڈاکٹر خان صاحب کی



قیادت میں قائم ہو گئی۔ چند ماہ بعد مرکز میں پنڈت نہرو برسراقتدار آئے، تو حالات بڑی نازک صورت اختیار کر گئے۔ سرحد کی کانگریسی وزارت تحریک پاکستان کی پرزور مخالفت کر رہی تھی۔ اس پر سرحد میں تحریک پاکستان کے حامی بڑے پریشان اور مایوس تھے۔ انگریز گورنر اور مرکزی حکومت بھی کانگریسی وزارت کی پشت پر تھے جو صوبہ میں ظلم و تشدد کر رہی تھی۔

سرحد میں کانگریسی وزارت کے ساتھ سرخ پوشوں کی مضبوط تنظیم بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ بہت کمزور تھی۔ چند فرزانے اس تیرہ و تاریک فضا میں پاکستان کی شمع کو اپنے خون جگر سے روشن کر رہے تھے۔ مگر اس وقت ایسے مجاہدوں کی ضرورت تھی جو پورے عزم و ایمان سے حالات بدل دیں اور مسلم اکثریت کا یہ صوبہ پاکستان میں شامل ہو سکے۔ سرحد کے دردمند مسلمان بارگاہ ایزدی میں دست بدعا تھے کہ ان کے دکھوں کا درماں ہو اور پاکستان کا جہان جمال ان کے لیے بھی جنت نگاہ بن جائے۔

تاریخ عالم اس حقیقت کی شاہد ہے کہ بعض افراد غیر متوقع طور پر عظیم کارنامے انجام دیتے ہیں۔ آزمائش کے اس مرحلے پر صوبہ سرحد میں میجر خورشید انور نے بڑا عظیم کردار انجام دیا۔ اس وقت میجر خورشید انور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے ناظم اعلیٰ (چیف آرگنائزر) تھے۔ انھوں نے سرحد کے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ انھیں اس حقیقت کا احساس ہوا کہ وہاں عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں بھی دوسرے برادران ملت کی طرح اسلام اور پاکستان کے لیے خلوص کا جذبہ موجزن ہے۔ اس خاکستر میں محبت کی چنگاریاں ہیں جنھیں ایمان و خلوص کے دامن سے ہوا دینے سے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

پٹھانوں کو ہندوؤں کے اصل عزائم سے آشنا کرنے کی ضرورت تھی۔ چناں چہ میجر خورشید انور نے صوبہ بہار میں کانگریسی وزارت کے "کارناموں" بالخصوص مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظلم و ستم اور بے پناہ تشدد کے واقعات کو تصاویر کی زبانی بیان کیا۔ انھوں نے بہار کے دردناک حالات، مسلمانوں کی تباہی و بربادی، عصمت مآب خواتین کی بے حرمتی، مسلمان بچوں کے سنگدلانہ قتل کی ہزاروں تصاویر صوبے کے بڑے حصے میں تقسیم کرنا شروع کیں۔

وہ عام سیاسی لیڈروں کی طرح کروفر سے بجائے ایک درویش کے مانند سرحد کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے۔ تصاویر کی تقسیم کے ساتھ ساتھ وہ یہ حقیقت بھی بیان کرتے کہ بہار کی کانگریسی وزارت بھی مسلمانوں کے قتل عام کی سازش میں شریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی نے اصرار کے باوجود بہار کا رخ نہیں کیا۔ بعدازاں سرحد سے دردمند پٹھانوں کا ایک وفد نے بہار کا دورہ کیا۔ اس وفد کے ارکان نے بھی سرحد کے عوام پر اس تلخ حقیقت کو بےنقاب کیا کہ پٹھانوں کی "ہمدرد" جماعت، کانگریس کی حکومت نے وہاں ہزاروں پٹھانوں کو شہید کر دیا ہے۔ چناں چہ بہار میں پٹھانوں کی کئی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔

خورشید انور سرحد کی بستی بستی گھومے اور کانگریس کے عزائم کو آشکار کیا اور مسلم لیگی کارکنوں کو سرگرم عمل۔ نوجوانوں کو تربیت دی۔ پٹھان روایتی طور پر جرأت، ہمت، سادگی، مہم جوئی اور انقلاب کے دلدادہ ہیں۔ انھیں یہ درویش راہنما پسند آیا جو تمام ان کی صفات کا حامل تھا۔ وہ کسی منصب کا حریص نہیں شمع آزادی کا پروانہ تھا۔ وہ کسی سازش میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ نوجوان کارکنوں کو میجر خورشید انور بہت پسند آئے۔ اب عوام اور صوبہ سرحد کے حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ عوام کو احساس ہونے لگا کہ کانگریس مسلمانوں کی دشمن ہے اور سرحد کے پٹھانوں کا مستقبل بھی ملت اسلامیہ پاکستان سے وابستہ ہے۔

سرحد کی کانگریسی حکومت کو اگرچہ اپنی قوت کا بڑا زعم تھا مگر حالات کی اس نئی کروٹ سے اسے بھی پریشانی ہوئی۔ حکومت کو متواتر اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ عوام کانگریس سے بیزار ہو رہے ہیں۔ حکومت کے بعض خیرخواہوں نے اپنے انداز میں زور دیا کہ یہ فتنہ سامانی میجر خورشید انور کی ہے۔ مگر ارباب حکومت اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ ایک پنجابی صوبہ سرحد میں

انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ دراصل کانگریسی حکومت اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی کہ مسلمان توحید کے پرستار ہیں۔ جب بھی کوئی مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کرے، وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اعلائے کلمۃ الحق مسلمانوں کی عظیم روایت ہے۔ سرحد میں یہ سعادت میجر خورشید انور کو نصیب ہوئی اور انھوں نے آوازۂ حق و صداقت بلند کر کے سرحد کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

اسی دوران پنڈت نہرو نے سرحد کے دورے کا پروگرام بنایا۔ وہ عبوری حکومت کے معتبر وزیر تھے۔ کانگریسی حلقے انھیں ویول کی کابینہ میں وزیراعظم قرار دیتے تھے۔ چناں چہ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے سرحد میں جلوہ آرا ہوئے تاکہ سرحد بدستور ان کی فتوحات میں شامل رہے۔ صوبائی حکومت کانگریسی تھی۔ اب مرکزی حکومت میں بھی کانگریس شامل تھی۔ پنڈت نہرو اس دورے سے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اب ہند میں طاقت صرف کانگریس کے پاس ہے، کوئی اور قوت اس کی حریف نہیں۔

لیکن نہرو اور دوسرے کانگریسی یہ بات بھول گئے کہ مسلمان محض قوت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ مسلمان کو جتنا دباؤ گے اتنا ہی ابھرے گا۔ جنگ اور مقابلے ہی میں مسلمان کے جوہر کھلتے ہیں۔ سرحد کے غیور مسلمانوں نے نہرو کی اس دعوت مبارزت کو قبول کیا۔ انھوں نے صوبہ سرحد کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اس برہمن حکمران کا سرحد میں ہر جگہ والہانہ انداز میں سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا گیا۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی آمرانہ قوتوں کے باوجود سرحد کے غیور پٹھانوں نے پنڈت نہرو کی جو درگت بنائی، اس سے یہ بات آشکار ہوگئی کہ سرحد میں انقلاب رونما ہو چکا۔ غیور پٹھان کانگریس کے نخچیر نہیں رہے اور کانگریس کی سنہری زنجیریں توڑ کر آزاد فضا میں پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانانِ سرحد کے اس مظاہرے نے ہند کی سیاسی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔ سرحد کی کانگریسی حکومت نے برافروختہ ہو کر ظلم و تشدد کی راہ اختیار کی۔ آزادی کے ان مدعیوں نے آزادیٔ تحریر و تقریر سلب کر لی اور مسلم لیگی راہنماؤں کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

کانگریسی حکومت جب اس حقیقت سے آشنا ہوگئی کہ سرحد کے مسلمانوں میں یہ ذوقِ انقلاب ایک پنجابی میجر خورشید انور کا مرہونِ منت ہے، تو اس نے مختلف ذرائع سے کوشش کی کہ وہ سرحد سے چلے جائیں۔ مگر میجر خورشید انور تو اور قسم کے انسان تھے۔ ان کا خمیر ہی کسی اور مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ وہ خطر پسند طبیعت کے مالک تھے اور مصائب کو دعوت مبارزت دینے میں راحت محسوس کرتے۔ میجر خورشید انور نے اپنے پٹھان بھائیوں کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سرحد میں اپنے بھائیوں کے دوش بدوش تحریک پاکستان کے لیے کام کرتے رہیں گے۔

اس پر حکومت سرحد نے نیا قدم اٹھایا اور میجر خورشید انور کی گرفتاری کا فیصلہ کیا۔ کانگریسی حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ میجر خورشید انور کی گرفتاری آسان کام ہے۔ خورشید انور پنجابی ہے، سرحد سے چلا جائے گا، تو اس بلائے بے درماں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن جب گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا، تو اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔ پولیس نے میجر خورشید انور کو گرفتار کرنے کے لیے کئی مقامات پر چھاپے مارے مگر انھیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

عام طور پر جو سیاسی کارکن گرفتاری سے بچنا چاہیں، وہ عملی سرگرمیوں سے دست کش ہو کر چھپ جاتے ہیں۔ میجر خورشید انور اگرچہ بساطِ سیاست پر نووارد تھے مگر جرأت و ہمت کی دولت سے مالا مال۔ انھوں نے جرأت مندانہ فیصلہ کیا کہ وہ گرفتار نہیں ہوں گے اور سرحد میں اپنی سرگرمیوں کو بھی تیز تر کر دیں گے۔ میجر خورشید انور کی جولان گاہ سرحد کے تمام اضلاع تھے۔ وہ صبح ایبٹ آباد ہوتے، تو شام کو مردان۔ رات پشاور میں گزارتے، تو دوسرے دن ڈیرہ اسماعیل خان میں نوجوانوں کو خطاب کرتے۔ وہ کوئی شعلہ نوا خطیب نہ تھے مگر ان کے الفاظ میں ایسا جادو تھا جو نوجوانوں کو ہر طاقت سے ٹکرانے

کے عزم سے سرشار کر دیتا۔ ان کی شجاعت، دلیری اور مہم جوئی نے خطر پسند پٹھان نوجوانوں کو ولولۂ تازہ عطا کیا۔

اس پر حکومت نے ان کی گرفتاری کی مہم تیز کر دی۔ پولیس کا ایک خاص دستہ اس مجاہد کی گرفتاری پر مامور کیا گیا۔ کانگریس کے ارکان اپنی جگہ اس پیکرِ جرأت و بسالت کو گرفتار کرانے کے لیے سرگرمِ عمل تھے مگر وہ ایک چھلاوا تھا جو ہاتھ نہ آتا۔ ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ وہ کانگریس کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ اسٹیج پر کانگریسی راہنماؤں کی بغل میں بیٹھتے۔ دوسرے روز کانگریسی راہنماؤں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا کہ ان کا مقصود تو جلسے کی زینت بنا ہوا تھا۔ عوام اس ناکامی پر کانگریس کا مذاق اڑاتے۔

پولیس میجر خورشید انور کو مسلم لیگی راہنماؤں کے مکانوں پر تلاش کرتی رہتی لیکن بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ تو ایک فقیر کے بھیس میں بنوں شہر میں پھرتے رہے۔ رات کو جلسے میں تقریر کر کے غائب ہو گئے۔ میجر خورشید انور اکثر پولیس اور حکومت کو کھلی دعوتِ مبارزت بھی دیتے۔ اعلان ہوتا کہ میجر خورشید انور فلاں جلسے میں تقریر کریں گے۔ پولیس اس شہر کا محاصرہ کر لیتی۔ سب آنے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھتی۔ کانگریسی کارکن بھی دوڑ دھوپ کرتے لیکن عین جلسے کے وقت کوئی مقرر اسٹیج پر آتا، عجیب و غریب لباس میں، نئے چہرے کے ساتھ مگر جلد ہی یہ انکشاف ہوتا کہ وہ میجر خورشید انور ہیں۔ جلسہ ختم ہوتا تو مجمع ہی میں وہ غائب ہو جاتے۔ دوسرے روز پولیس شہر میں ان کی تلاش میں سرگرداں ہوتی تو معلوم ہوتا کہ وہ تو کسی دوسرے شہر پہنچ چکے۔

میجر خورشید انور ہر بار نئی تدبیر کرتے۔ ان کی کامیابی کا راز عوام کا خلوص، بھیس بدلنے میں کمال اور جرأت رندانہ تھی۔ ہمدرد لوگوں سے انھیں پولیس کی نقل و حرکت اور پروگرام کے بارے میں اطلاع مل جاتی۔ عوام ان سے بھرپور تعاون اور ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے۔ بھیس بدلنے میں انھیں ایسی مہارت تھی کہ ان کے قریبی رشتے دار اور ہر وقت ساتھ رہنے والے دوست بھی دھوکا کھا جاتے۔ ان کی طبیعت میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک انقلابی راہنما اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک تھے۔

سرحد کی پولیس اور کانگریسی ارکان میجر خورشید انور کو گرفتار کرنے کے لیے ہر روز نیا دام بچھاتے مگر یہ شاہین زیرِ دام نہ آیا۔ پولیس اور میجر خورشید انور کے اس مقابلے میں عام لوگ بھی بڑی دلچسپی لینے لگے۔ حکومت اور پولیس کی بار بار شکست سے میجر خورشید انور کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ پٹھانوں کے ہیرو بن گئے۔ سرحد کی فضا تیزی سے بدل رہی تھی۔

اب مسلم لیگ کے کارکن شبانہ روز کام کر رہے تھے۔ اسی دوران مسلم لیگ نے کانگریسی وزارت کو دعوتِ مبارزت دی اور سرحد میں بھی سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ سول نافرمانی کی تحریک سرحدی پٹھانوں کے جذبۂ آزادی اور عزمِ قربانی کی علامت تھی۔

سرحد کے مجاہدوں کا ایک سیلِ رواں تھا جس کی طوفانی لہروں میں کانگریسی وزارت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ اس قافلۂ شوق میں سید امین الحسنات سجادہ نشین مانکی شریف، ارباب عبدالغفور، ارباب سکندر خان خلیل، پیر عبداللطیف زکوڑی شریف جیسے لعل و گوہر بھی شامل تھے۔ انھوں نے سرحد میں کانگریس کا سحر اور سرخپوشوں کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔

میجر خورشید انور اس تحریک کے زمانے میں زیرِ زمین سرگرمِ عمل رہے۔ ان کی سرگرمیوں اور ذمے داریوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں گرانقدر ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا کی۔ سرحد مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک کامیاب ہوئی۔ جب کچھ عرصہ بعد استصواب کا اعلان ہوا تو حکومت سرحد نے جو انھیں گرفتار کرنے میں ناکام ہو چکی تھی اپنا ارادہ بدل دیا۔ سرحد کے استصواب کے لیے قائد اعظم نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا۔ اب بھی میجر خورشید انور نے سب سے اہم کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں تمام انتظامات انھوں نے کیے۔

استصواب کے سلسلے میں راقم الحروف سرحد گیا، تو میجر خورشید انور کے کارنامے افسانۂ بزم و انجمن تھے۔ ہر مجلس میں خورشید انور کا دلآویز تذکرہ ہوتا۔ ہر محفل میں ان کے محیر العقول واقعات بیان کیے جاتے۔ نوجوان مزے لے لے کر خورشید انور کی داستانیں دہراتے۔ بسا اوقات یہ احساس ہوتا کہ خورشید انور کوئی افسانوی شخصیت ہے۔ داستان امیر حمزہ کا کوئی رومانی کردار ہے جو پٹھانوں کے قلب و جگر میں بس چکا۔ پٹھان انھیں انقلاب آفریں اور مثالی شخصیت قرار دیتے۔

سرحد کی فضا خورشید انور کی فتوحات سے معمور تھی۔ ان کی عظمت کے نقوش لوگوں کے دلوں اور دماغ پر ثبت تھے۔ ہر جگہ لوگ خورشید انور کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر خورشید انور بڑے ایثار پیشہ، مخلص اور منکسر المزاج انسان تھے۔ جرأت اور انکسار سے ان کی طبیعت عبارت تھی۔ شہرت اور عظمت کی اس معراج پر پہنچنے کے بعد بھی ان کے انکسار میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اس استصواب میں تاریخی کامیابی کے بعد کسی جلوس میں شامل نہیں ہوئے۔ خاموشی اور سکون سے اپنا انقلاب آفریں کردار ادا کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔

میجر خورشید انور مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ میں ان سے ملا اور ان کے خلوص، بے نفسی اور ایثار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہی سادگی اور بے تکلفی تھی جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھی بلکہ پہلے سے زیادہ منکسر المزاج ہو چکے تھے۔ سرحد میں کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کیا، تو انھوں نے کہا ''میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

پٹھانوں کے بارے میں میجر خورشید انور نے کہا ''پٹھان بڑے جسور و غیور ہیں۔ اسلام کے شیدائی اور پاکستان کے فدائی ہیں۔ پاکستان سے علیحدہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر پٹھانوں کی مزاج شناسی ضروری ہے۔ پٹھان انقلابی مزاج رکھتے ہیں۔ وہ انقلابی تحریکوں کے شیدائی ہیں۔ پٹھان اپنی روایات پر فخر کرتے ہیں۔ ان پر جبر و تشدد کی حکمت عملی ہمیشہ ناکام ہوگی۔ ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ ان پر اعتماد کیا اور اسی طرح منزل ہفت خواں کو سر کیا ہے۔''

اب میجر خورشید انور ہم میں نہیں مگر ان کے عظیم کارنامے ہمارا سرمایۂ عزیز ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے جہاد میں اپنی زندگی قربان کر دی۔ سری نگر کے محاذ پر وہ زخمی ہوئے۔ معالجے کے لیے لندن گئے مگر جانبر نہ ہو سکے اور انھوں نے ۱۹۴۸ء میں شہادت کا رتبہ پایا۔ قائداعظم نے ۱۹۴۵ء میں میجر خورشید انور کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا چیف آرگنائزر مقرر کیا تھا۔ وہ دوسری عالمگیر جنگ میں حصہ لے چکے تھے۔ میجر خورشید انور جالندھر کے ایک ارائیں خاندان کے چشم و چراغ تھے جو افق ملت پر خورشید بن کر طلوع ہوئے۔

◆◆◆

شور اور ہارٹ اٹیک کا خطرہ

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ شور زدہ سڑکوں کے قریب رہنے والے افراد میں زندگی کا دورانیہ کم اور دل کے دورے کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔ لندن سکول آف ہائی جین اینڈ میڈیسن کی ماہر جینا ہیلٹن کی سربراہی میں گزشتہ روز جاری ہونے والی ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق ایسی سڑکیں جہاں دن کے اوقات میں ٹریفک کا شور ۶۰ ڈیسیبل سے زیادہ ہوتا ہے، وہاں اموات کی شرح ایسے علاقوں کی نسبت جہاں شور ۵۵ ڈیسیبل یا اس سے کم ہو، چار فی صد زیادہ ہوتی ہے۔

ماہرین نے یہ بھی بتایا کہ عالمی ادارہ صحت کے مطابق بھی ایسے علاقے جہاں ٹریفک کے شور کی شرح ۵۵ ڈیسیبل ہو، وہاں زندگی کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ زیادہ شور والے علاقوں کے باسیوں میں دل کے دورے کے امکانات پانچ فی صد بڑھ جاتے ہیں جبکہ زیادہ بزرگ افراد میں یہ شرح ۹ فی صد تک بھی جا سکتی ہے۔

بھارت سے پاکستان جانا

موت کا قافلہ

"اداس نسلیں" کا رونگٹے کھڑے کردینے والا ایک باب

عبداللہ حسین

انھیں چلتے ہوئے نو روز ہو چکے تھے۔ اب وہ جالندھر کے قریب پہنچ رہے تھے۔ آدھے سے زیادہ نئے لوگ اس میں شامل ہو چکے تھے لیکن قافلے کا حجم حیرت انگیز طور پر گھٹتا جا رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جوں جوں وہ پنجاب میں آتے گئے، حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے اور وہ ایک پل کے لیے بھی بے خبر ہو کر نہ چل سکتے تھے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو زیادہ تر دیہات میں سے آتے۔ پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے، اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگ نکلتے۔ ہر حملے کے بعد مردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے روندتے ہوئے قافلے والے آگے نکل جاتے۔ کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نوجوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں۔ اسی طرح سے گو ہر پڑاؤ پر مہاجرین کی تازہ جماعت ان سے آملتی مگر کم ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی اور قافلہ گھٹتا جاتا۔

پچھلے پچاس میل سے اچانک انھیں اپنے راستے میں مردہ اور نیم مردہ انسانی جسم ملنا شروع ہو گئے جو سڑک پر اور آس پاس کے کھیتوں میں بکھرے پڑے تھے۔ وہ پتا دیتے تھے کہ ان سے آگے آگے ایک اور قافلہ رواں تھا، ایک مہیب، زخمی جانور کی طرح جو خون کی لکیر چھوڑ آگے آگے بھاگ رہا ہو۔ گو وہ اسی عجلت اور بے پروائی کے ساتھ اجنبی مردہ جسموں کو پھلانگتے گزر رہے تھے مگر اس خیال سے کہ ان سے آگے، ان سے پہلے کچھ اور



لوگ، دوسرے ناواقف لوگ موت کا سامنا کر رہے تھے۔ انھیں عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ موت جو مشترکہ تھی اور راستے میں بکھری ہوئی تھی اور جس کے اوپر سے ہزاروں انسانی پاؤں بظاہر بیگانگی اور بے نیازی کے ساتھ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے، آخرکار اسے دھوکا دیا جا سکتا تھا، ٹالا جا سکتا تھا، دوسرے کے سر پر تھوپا جا سکتا تھا۔

اس خیال کو یوں بھی تقویت ملتی کہ بعض دفعہ اگلے قافلے کے حملہ آور انھیں بغیر کچھ کہے گزر جانے دیتے۔ وہ مار مار کر اس قدر اکتا چکے ہوتے کہ محض سڑک کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش اور خوفزدہ کوچ ہی سے محظوظ ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ مردوں اور زخمیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے، بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزر جاتا۔ کبھی کبھار ان کی زد سے باہر نکل کر، ایک آدھ پرانا آدمی رک کے دور سے جلتے ہوئے انسانی جسموں کا نظارہ کرتا اور اس کے ذہن میں قافلے کی پہلی لاش کی یاد تازہ ہو جاتی۔ زیادہ تر لوگ نئے ساتھیوں اور نئے حملوں کی توقع میں اپنا سفر جاری رکھتے۔

نعیم اس افراتفری میں کئی بار علی سے بچھڑ گیا۔ مگر علی ہر دفعہ اسے تلاش کر لیتا۔ وہ گاڑی کے اوپر ایڑیاں اٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا، پھر ایک طرف کو نظریں جما کر گاڑی سے اترتا، ہجوم کو چیرتا ہوا سیدھا جاتا اور سر جھکا کر چلتے ہوئے نعیم کو بازو سے پکڑ کر برا بھلا کہتا اور واپس لے آتا۔ "اپنی گاڑی کو مت چھوڑو مت چھوڑو، تین ہزار بار کہا ہے مگر تم تو بالکل کام سے گئے۔ وہ پکڑ لیں گے اور مار دیں گے اور چلے جائیں گے۔ بس۔ پھر؟" وہ کہتا۔

لیکن نعیم ان باتوں سے دور جا چکا تھا۔ بوڑھا پروفیسر بھی اب اس سے باتیں کرنے کی ناکام کوشش کر کر کے تھک چکا تھا۔ آخر اس نے علی سے کہا تھا "تمھارا بھائی...... اس کے دماغ پر اثر ہے۔ خیال رکھنا پڑے گا۔" اور علی، جو شروع سے بڈھے پروفیسر کی طرف سے بے پروا تھا، یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اب وہ جب چاہے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔

وہ سب کچھ دیکھتا، بھاگتا، کھاتا اور کبھی کبھی سوتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی صورت اپنے دوسرے ہم عمروں سے قطعی مختلف نہ تھی۔ سب کی داڑھیاں اور چہرے غلیظ، لباس پھٹے ہوئے اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ سب ننگے پاؤں تھے کہ سارے جوتے تنگ ہو چکے تھے۔ سب کی نظریں کھوئی کھوئی اور آوارہ تھیں اور ان سے طویل، بے منزل مسافرت کی تکلیف ٹپکتی تھی۔ سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکٹھے رہنا تھا اور وہ ان سب میں گھلا ملا ہوا، کھویا ہوا، محض ایک گمنام، بے حیثیت مسافر تھا۔

اس کے سامنے وقفے وقفے پر حملے ہو رہے تھے، لوگ مر رہے تھے۔ جو مارے جانے سے بچ رہتے وہ تھک تھک کر گر رہے تھے، سامان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور لوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا اور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا۔ عورتوں کے برہنہ مردہ جسم بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مستقل چل رہے تھے۔ میاں بیوی، بہن بھائی اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن یہ سب اہم نہیں تھا، کیونکہ وہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود خاموش اور لاتعلق تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟" آخر جھنجلا کر علی نے کہا۔ "تھ تھ تھ کتنے پانچ روز ہو گئے...... پورے پانچ اور بات تک کر کے نہیں دی اس شخص نے تھ تھ تھ......"

"دماغ پر اثر......" پروفیسر نے کہنا چاہا۔

"چپ رہو تم...... نیچے اترو...... چلو۔" علی نے اس کی پشت پہ چپت جما کر گاڑی سے اتار دیا۔

نعیم نے تیز روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چالاکی سے مسکرایا۔ پھر اس نے اپنے عائشہ پر نظر ڈالی جو گاڑی میں لیٹی تھی اور چارے کا ڈھیر، جس میں آپ کو چھپانے کے لیے اس نے گھر بنا رکھا تھا، ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہرحال اتنی سوکھ چکی تھی کہ کسی نے اسے مارنے یا اغوا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نعیم آہستہ سے ہنسا۔ پھر وہ تیز تیز چل کر بیبوں کے پاس پہنچا اور ان کی پسلیوں پر، جو باہر نکلی ہوئی تھیں، ہاتھ پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے بگلے میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ پروفیسر اور علی گم سم، ترحم خیز تعجب کے ساتھ اسے دیکھتے رہے، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مایوسی سے سر ہلانے لگے۔

ایک نشہ تھا، ایک بدمستی تھی جس میں سب کچھ ڈوب چکا تھا، غرق ہو چکا تھا، جس کا منبع کسی کے علم میں نہ تھا۔ ایک بے خودی، جو زندگی کی سفاکی کے اس سارے منظر کو بہا کر لے گئی تھی، پار کر گئی تھی، جس نے ہر انسانی اور حیوانی جذبے کو، تجربے کو فتح کر کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی، کیونکر پیدا ہوئی تھی اور کدھر لیے جا رہی تھی، اس سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔ صرف ایک غبار تھا، روشن اور لطیف اور بے ہیئت، جیسے خزاں کی شفاف راتوں کی کہکشاں، یا جاڑوں کی صبحوں کی دھند جو چھوئی نہیں جاتی مگر کپڑوں میں گھس کر سارے جسم کو گیلا کر دیتی ہے اور خوبصورت اور خنک ہوتی ہے، جس میں آپ چلتے جاتے ہیں اور نئی نئی چیزیں نمودار ہوتی جاتی ہیں۔

مرد اور عورتیں، گھوڑا گاڑیاں، بچے، روزمرہ کی مانوس شکلیں، مگر دھند میں سے نکلتی ہوئی وہ انوکھی خنک اور خوبصورت ہوتی ہیں خواب کی طرح۔ بس ایسا غبار تھا جو شروع ہی سے بلند ہو رہا تھا، جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جسے اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ موت اور بھوک، بے بسی اور خوف اور لالچ کے ساتھ ساتھ جسم کی بڑھتی ہوئی تھکن کے پہلو بہ پہلو۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

درد کرتا ہوا جسم جو اس کا خیال تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی اور مایوسی کا نقطہ عروج، جہاں پہنچ کر اب نہ وہ بھاگتے تھے نہ پروا کرتے تھے، حملہ آور ان میں سے چند ایک کو ہانک کر لے جاتے تھے اور سڑک کے کنارے کھڑا کر کے گولی مار دیتے تھے، سب ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ جیسے اس نے محسوس کیا تھا آخر ان سب سے زیادہ طاقتور، روشن اور جاندار تھا اور اسے مکمل طور پر لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یہاں بالآخر خاموشی تھی اور وجد۔

قافلے والوں کا کاروبار بہرحال چل رہا تھا۔ شہر کے باہر وہ پناہ گزین کیمپ میں پہنچ کر رک گئے۔ جہاں ان کو رات بسر کرنا تھی۔ کیمپ چند کچی پکی بارکوں اور پھٹے ہوئے خیموں پر مشتمل تھا۔ بارش کا پانی جگہ جگہ رکا ہوا تھا۔ پرانے اور نئے پناہ گزینوں نے ایک دوسرے کو شک و شبے کی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ بیٹھ گئے اور پتھروں کے چولھوں پر روٹیاں پکانے لگے۔

جن کے پاس توے نہیں تھے وہ گول گول پتھروں پر آٹا لپیٹ کر آگ پر گرم کرنے لگے۔ جن کے پاس آٹا نہ تھا، وہ بھاری رقمیں دے کر پڑوسیوں سے آٹا خریدنے لگے۔ جن کے پاس پیسے نہ تھے وہ رات کا انتظار کرنے لگے تاکہ اندھیرے میں چوری کی جا سکے۔ کچھ لوگ بہرحال اتنے تھک چکے تھے کہ آتے ہی غش کھا کر گر پڑے اور ہوش میں آنے پر گڑھوں میں رکا ہوا پانی پی کر دوبارہ گہری نیند سو گئے۔ مکھیاں ان کے منہ پر جمع ہونے لگیں اور جنگلی پرندے انھیں مردہ سمجھ کر چونچیں مارنے لگے۔

چند ایک ایسے بھی تھے جو محض ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے اور خلا میں دیکھ رہے تھے گویا موسم کا جائزہ لے رہے ہوں۔ ان دنوں سارے دن ایک سے تھے۔ یا بارش ہوتی یا سورج نکل آتا۔ دھوپ بھورے رنگ کی جھلس دینے والی ہوتی۔ آسمان گرد آلود اور بدرنگ ہوتا جس پر ہر وقت فربہ مردار خور پرندوں کے غول کے غول اڑا کرتے اور فضا میں ایک عجیب قسم کی متلی آور بو پھیلی رہتی۔

◆●●



ہمارے محلے میں ایک بزرگ، شریف مرزا رہتے ہیں جو لڑکپن میں ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ میری ان سے پرانی یاد اللہ ہے۔ میں نے ان میں یہ خاص بات دیکھی کہ وہ چودہ اگست کے دن افسردہ اور خاموش رہتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ ۱۴ اگست کے دن خاص اہتمام سے روزہ رکھتے، زیادہ وقت مسجد میں گزارتے اور مسکرانا تو بھول ہی جاتے ہیں جبکہ پورا محلہ خوشیوں میں نہال ہوتا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

یہ سن کر ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میری جانب دیکھتے ہوئے انھوں نے جو روداد سنائی وہ عبرت اثر ہونے کے علاوہ حیرت انگیز بھی ہے۔ آئیے شریف مرزا کی داستانِ ہجرت انھی کی زبانی سنتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے آگ و خون کے دریا پار کیے

☆☆

اپنا دیس ہے پاکستان......

خوابوں کی سرزمین

یوم آزادی پر غل غپاڑہ کرنے والے نوجوان یاد رکھیں کہ ہم نے اپنا پیارا وطن عظیم قربانیاں دے اور خون کے دریا پار کر کے پایا' یہ پلیٹ میں رکھا نہیں ملا

سراج دین



یہ جولائی اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ "بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان ..... پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ....." یہ ایسے دلنشین نعرے تھے کہ کان پڑتے ہی تن من میں توانائی دوڑتی۔ دل کی دھڑکن اور خون کی روانی میں بھی تیزی آ جاتی اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی۔ ایسے خوبصورت خیال دل کا احاطہ کرتے کہ یہی جی چاہتا اُڑ کر اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان پہنچ جائیں۔

میرے دادا اعلیٰ پائے کے معمار تھے۔ گورداسپور، امرتسر اور گرد و نواح میں اکثر مساجد کی تعمیر میں ان کی کاریگری شامل ہے۔ ایک مسجد کی تعمیر میں انھوں نے اپنی مینا کاری کے خوب جوہر دکھائے تو ہندو بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنے مندر تعمیر کرانے کے لیے دادا جان کی خدمات مستعار لے لیں۔ مسجد کا منارہ تعمیر ہو چکا تو اس کی چوٹی پر پیتل کا بڑا ہی خوبصورت "بھالا" نصب کرنے کا مرحلہ آیا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ یہ نیک کام مذہب کی تمیز سے بے نیاز ہو کر علاقے کی معتبر شخصیت یا کسی بزرگ کے ہاتھوں کروایا جاتا۔ قرعہ لالو پرشاد کے نام نکلا جو گورداسپور کا "دیالو" مشہور تھا۔ سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس تنومند لالو پرشاد کم و بیش ستر کے پیٹے میں تھا۔ وہ خوشی خوشی اس شبھ کام کے لیے تیار ہو گیا۔ ساٹھ ستر فٹ بلند منار کے گرد لمبے لمبے بانسوں پر لکڑی کے پھٹے خاص ترتیب کے ساتھ رسیوں سے بندھے تھے۔ معمار اپنی زبان میں اسے "گو" کہتے ہیں۔ بلندی دیکھ کر لالو پرشاد کا ماتھا ٹھنکا اور پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ یہ دیکھ کر دادا جان نے اسے حوصلہ دیا اور خاص تکنیک بتائی کہ چڑھتے ہوئے نیچے ہرگز نہیں دیکھنا اور اترتے ہوئے بھی یہی نکتہ یاد رکھنا۔ یوں لالو پرشاد گو کے ساتھ بندھی بانس کی سیڑھی سے آخری منزل پہنچ گیا۔ وہاں کھڑے مزدوروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سیڑھی سے کھینچ گو پر کھڑا کر دیا۔ پھر پیتل کا بھالا اس کے ہاتھوں منار کی چوٹی پر نصب کرایا گیا۔

اس کام کے بعد لالو پرشاد نے اچانک جو زمین کی جانب دیکھا تو چکرا گیا۔ بس جی پھر کیا تھا، موصوف کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رام رام کی مالا جپتے اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ قریب کھڑے مزدور بروقت اسے نہ تھامتے تو وہ سر کے بل نیچے آ گرتا۔ یہ دیکھ کر دادا جان بھانپ گئے کہ اب وہ اپنے پیروں پہ نہیں کھڑا ہو گا۔ لہٰذا موٹی موٹی رسیاں منگوائی گئیں اور نیم مردہ لالو پرشاد کو ان میں جکڑ کر کنویں کے بوکے کی طرح نیچے اتارا گیا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہجوم کھڑا تھا جن میں بچے بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔

زمین سے پاؤں لگتے ہی لالو پرشاد کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور سوگند کھائی کہ آئندہ وہ اس شبھ کام میں شریک نہیں ہو گا۔ کئی روز ہندو اور مسلمان یہ واقعہ ایک دوسرے کو سنا کر محظوظ ہوتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ طویل عرصہ رہنے سے ان کی کئی رسوم ہم میں سرایت کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ مرنے والے کے ساتھ سلوک کی آخری رسم جدا ہی رہی۔ وہ مردے کو شمشان گھاٹ لے جاتے اور نعش کو لکڑیوں سے ڈھانپ کر آگ لگا دیتے ہیں۔

کوئی امیر کبیر ہندو آنجہانی ہو جائے تو صندل کی لکڑی، دیسی گھی اور قیمتی خوشبوئیں اسے جہنم واصل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں، جبکہ غریب غربا کی میت کو عام لکڑیوں اور مٹی کے تیل سے جلایا جاتا ہے۔ اس دوران مردہ اکڑ کر بیٹھتا تو سفید لباس میں ملبوس بنیا جو اسی حرکت کا منتظر ہوتا، تڑاخ سے ایک موٹا ڈنڈا مردے کے سر پر دے مارتا۔ یوں ڈھانچے کی عمارت ڈھے جاتی۔ آگ سرد ہونے پر ادھ جلی ہڈیاں اور مردے کی راکھ مٹی کے گھڑے میں ڈال دریائے گنگا میں بہا دی جاتی۔ جبکہ ہم مسلمان الحمدللہ سنت طریقے سے تدفین کرتے ہیں۔

جب بٹوارے کی صدائیں بلند ہوئیں تو خوشی کے ساتھ ساتھ انتشار بھی بڑھتا چلا گیا اور اس میں پہل ہندوؤں کی طرف سے ہوئی۔ حالانکہ ہمیں یہی گمان تھا کہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر جدا ہوں گے لیکن وہ ہمارا گمان ہی تھا۔ اذان یا باجماعت نماز

کے اوقات میں وہ دانستہ شور شرابا کرتے اور زور دار ڈھولکوں والے پٹاخے چھوڑنے لگے حالانکہ اس سے قبل ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کا احترام اور خوشی غمی کی تقریب میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ امام مسجد مولانا عبدالرحیم نے جو ہندوؤں کے تیور بھانپ گئے تھے انھوں نے نمازیوں کو انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھا تاکہ امن و امان برقرار رہے۔ ان کا خیال تھا کہ گورداسپور، امرتسر، ہوشیارپور اور لدھیانہ وغیرہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان کے حصے میں آئیں گے۔ سکھ اور ہندو ہی یہاں سے کوچ کریں گے لیکن وہ تو حالات گمبھیر کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ایک دن کچھ شرپسند نماز کے دوران مسجد کے احاطے میں مردہ کتا پھینک فرار ہو گئے۔ مقامی ہندو بیرونی سکھوں اور شرپسندوں کی شہ پر ایسی حرکات کے مرتکب ہو رہے تھے۔ امام صاحب نے اس روز بھی بپھرے ہوئے نمازیوں کو بمشکل روکا اور صبر کی تلقین کی۔ ویسے بھی رمضان المبارک کا مہینا تھا اور مسلمان اس ماہ مبارک میں دنگا فساد سے قطعی اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن نماز فجر سے قبل بلوائیوں نے مولانا عبدالرحیم کو مسجد کے دروازے ہی پر بڑی بے دردی سے شہید کر دیا۔ مسجد سے ملحق قبرستان میں مولوی صاحب کی تدفین کے بعد اہل محلہ سر جوڑ کے بیٹھے آئندہ کے لیے منصوبہ بنا رہے تھے کہ شرپسندوں نے مولوی عبدالرحیم کی قبر کھود کر برہنہ لاش چوراہے میں لٹکا دی۔ انسانیت کی تذلیل میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

منوہر، گوپی، موہن یہ تین بھائی اور دو بہنیں نیہا، ریکا اور آشا ہمارے گھر کے سامنے ان کی حویلی تھی۔ ان کے والد رام داس بہت بڑے ساہوکار تھے اور والدہ پاروتی دیوی سے ہمارے گھر والوں کے دیرینہ مراسم تھے۔ ہم بچے اکثر ان کے ہاں کھیلا کرتے۔ ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے۔ لیکن جیسے ہی حالات بدلے یہ گھرانہ راتوں رات سامان سمیت غائب ہو گیا یا انھیں بلوائیوں نے خاموشی سے ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح دوسرے ہندو اور سکھ گھرانے بھی چپکے سے کوچ کر گئے۔

اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہنگامی صورت کے پیش نظر مردوں کی مسلح ٹولی تیار کی گئی۔ سامان حرب ان ہتھیاروں پر مشتمل تھا: ڈنڈے، غلیل، کلہاڑیاں، نلوں کے آہنی پائپ، سبزی کاٹنے والی چھریاں، مٹھی بھر جسامت کے پتھر، چارپائیوں کے سیرو اور پائے... کیونکہ چند روز قبل پولیس کی معیت میں گھر گھر تلاشی کے دوران بھی مسلمانوں سے یہ کہہ کر ہتھیار لے لیے گئے تھے کہ مبادا خون خرابہ نہ ہو۔ بعد میں یہ واپس کر دیے جائیں گے۔ جبکہ ہندو اس تلاشی سے مستثنیٰ تھے۔ جلد ہی ہندو بلوائی مسلمان محلوں پر حملے کرنے لگے۔

جب ہماری مسلح ٹولی ہندوؤں کے علاقے میں پہنچی تو وہ اپنے قیمتی سامان سمیت فرار ہو چکے تھے۔ بلوائی منظم طریقے سے رات کے اندھیرے میں ہمارے محلوں پہ شبخون مارتے اور فرار ہو جاتے۔ آخر اہل محلہ نے بھی ہوش کے ناخن لیے اور ایک رات مسلح ہو کر بلوائیوں کی گھات میں بیٹھ گئے۔ پچیس تیس کے قریب سکھ اور ہندو تلواریں، کرپانیں، چھرے، نیزے، خنجر اور بندوقیں لیے حملہ آور ہوئے تو پہلے سے تیار جیالوں نے تاک تاک کر ان کے سر پھوڑے۔

غلیل باز عبدالرحمن نے اپنے فن کا ایسا مظاہرہ کیا کہ جتھے کا بھرکس بنا دیا۔ جس بلوائی کے سر یا سینے پر غلیلہ پڑتا وہ ذبح کیے ہوئے بیل کے مانند ڈکارتا وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ حتیٰ کہ گھوڑے بھی غلیل کی ضرب برداشت نہ کر سکے اور الٹے قدموں بھاگتے ہوئے اپنے ہی آدمیوں کو روند ڈالا۔ یوں کہیے کہ سورۂ فیل کی چھوٹی سی جھلک تھی۔ باقی ساتھیوں نے ایسی بے جگری سے مقابلہ کیا کہ ان کی ہوا اکھڑ گئی۔ ان میں سے کئی گھڑسوار اپنے گھوڑے اور اسلحہ چھوڑ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ عرشی ماموں، میرے خالہ زاد بھائی حافظ بیدار اور احسان اللہ نے تین تین بلوائی جہنم واصل کیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پیار اور محبت کی جگہ نفرت اور درندگی نے لے لی۔ دوست اور دشمن کی پہچان کھو گئی۔ وہ پڑوسی جن سے

برسوں پرانے قریبی تعلقات تھے انھوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں اور یوں بیگانے ہو گئے کہ جیسے کبھی آپس میں واسطہ ہی نہیں تھا۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام کے مصداق لالو پرشاد جیسے دیالو بھی خونخوار بھیڑیے بن گئے۔ کوئی عزت محفوظ تھی نہ جان... کئی پاکباز خواتین نے اپنی عزت پر حرف نہ آنے دیا اور گھر کی کھوئی میں پناہ لی۔ اکثر کنویں عصمتوں کی جائے امان ثابت ہوئے اور سیکڑوں جانوں کو اپنی آغوش میں سمو لیا۔ ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔

یہ دیکھ کر مجبوراً ہمیں اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑنا پڑا۔ میرے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور میں دادا کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ گلی کوچے جہاں ہر وقت لوگوں کی چہل پہل اور رونق رہتی تھی سنسان اور ویران ہو گئے۔ ایسا خوف و ہراس پھیلا کہ اپنے سائے سے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی عالم میں نقل مکانی کا سلسلہ چل نکلا اور چھوٹی بڑی گٹھڑیوں اور بے سرو سامانی کے عالم میں جیسے تیسے لوگوں کے جتھے نکل پڑے۔ اس ہڑبونگ میں بھی بعض دور اندیشوں نے اپنی قیمتی متاع گھر کے کسی کونے میں مخصوص نشانی لگا کر دفن کر دی کہ جب حالات ٹھیک ہوئے تو واپس امانت لے جائیں گے۔ کسی نے جذباتی فیصلے کیے اور مال و متاع کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہایت ضروری سامان ہی پر اکتفا کیا۔ ہمارے ماموں میاں عرش نے بڑے چاؤ سے بنائی ایک کنال رقبے پر استادہ اپنی حویلی مع ساز و سامان نذر آتش کر دی۔ غالباً وہ بھانپ گئے تھے کہ یہ قیامت کسی طرح ٹلنے والی نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم زندہ و سلامت رہیں گے بھی یا نہیں...

ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ہم بھی تھوڑی سی نقدی بچتے کاتے چنے اور چند ضروری کاغذات لیے شامل ہو گئے۔ حافظ دیدار اور احسان اللہ ہمارے ہمراہی تھے جبکہ عرش ماموں کسی دوسرے قافلے میں شامل تھے۔ سب نے آخری بار اپنے گھر بار اور محلے پر نظر ڈالی اور اللہ کو یاد کرتے کوچ کا قصد کیا۔

عالم اور وزیر

مصر میں دو امیر زادے رہتے تھے۔ ایک نے علم سیکھا دوسرے نے مال جمع کیا۔ پہلا بڑا عالم بن گیا دوسرا مصر کا وزیر اور عالم کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا کہ میں نے حکومت حاصل کر لی اور تو فقیر ہی رہا۔ عالم نے جواب دیا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر مجھے ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے پیغمبروں کا ورثہ یعنی علم عطا کیا ہے۔ تجھے فرعون و ہامان کی میراث یعنی مال ملا، یعنی مصر کی حکومت۔ (حکایات سعدی شیرازی)

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ ہمارا قافلہ صحیح سلامت واہگہ پار کر گیا لیکن اس دوران راستے میں جن صعوبتوں، اذیتوں اور اندوہناک خبروں سے واسطہ پڑتا رہا، وہ خون کے آنسو رلاتی اور دل دہلاتی رہیں۔ ہندوؤں کا جاسوسی نظام بڑا کارگر تھا۔ یقیناً انھیں کسی سیاسی راہنما کی سرپرستی حاصل تھی جو اکثر وہ شب خون مارنے میں کامیاب رہتے۔ بلوائی سر راہ گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور جیسے ہی قافلہ قریب آتا وہ خون کی ہولی کھیلتے۔ ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود بزدلی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کوئی نہتا مسلمان جوشِ ایمانی سے "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کی صدا بلند کرتا تو بلوائی دم دبا کر بھاگ جاتے کہ مبادا وہ حملہ کرنے لگا ہے۔

اکثر کنوؤں میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ اس کا انکشاف کنوؤں کے قریب اور وہاں بکھری پڑی انسانوں، چرندوں اور پرندوں کی نعشوں سے ہوا۔ لہٰذا ہم جوہڑوں کا پانی پی کر پیاس بجھاتے رہے۔ ہجرت کے دوران ایک لمحہ ایسا آیا جب واہگہ بارڈر چند کوس دور رہ گیا تو تلواروں اور نیزوں سے لیس بلوائیوں کا ایک جتھا نمودار ہوا۔ وہ ہم سے چند فرلانگ دور تھا۔ وہ کتوں کی طرح مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے خون آلود کپڑوں سے عیاں تھا کہ وہ ہولی کھیل چکے اور نئے شکار کی تلاش میں تھے۔

ہم سب نہتے اور بھوک سے نڈھال تھے۔ اس عالم کسمپرسی میں انھیں للکارنا بیوقوفی اور موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا' لہٰذا آیت الکرسی کا ورد کرتے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ یکدم کالے بادلوں سے آسمان بھر گیا اور اس زور کی بارش ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ پوٹلی میں بندھے کالے چنے بھیگ کر پھول گئے اور کھانے کے قابل نہ رہے۔ جبکہ گڑ شیرہ بن کر بہہ گیا۔ درحقیقت یہ بارش ہمارے لیے باران رحمت ثابت ہوئی جو بلوائیوں کا جتھہ ناکام و نامراد لوٹ گیا۔

آخر زندہ و سلامت عرض مقدس پاکستان کی سرزمین پہنچے اور قبلے کا تعین کیے بغیر سجدہ ریز ہو گئے۔ وہیں ہمیں یہ افسوس ناک خبر ملی کہ عرشی ماموں بلوائیوں سے لڑتے لڑتے جان کی بازی ہار گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ بہار میں لاکھوں نہتے مسلمانوں کو جس بربریت اور ناپاک منصوبہ بندی سے مارا گیا۔ بھارتی میڈیا نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور یہی سلوک دیگر علاقوں میں بھی روا رکھا گیا۔

ہندوستان میں جان و مال کا خطرہ تھا' تو ادھر بھی چند بھوکے بھیڑیے دندناتے نظر آئے جن پر ظلم اٹھاتے ہوئے روح کانپ اٹھتی ہے اور بے اختیار ذہن میں یہ بات آتی ہے ''کیا وہ مسلمان تھے!'' مختصر یہ کہ خوب رسوا ہونے اور دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ سرکاری طرف سے کلیم کے بدلے رتن محل سے ملحق آبادی میں ایک قدیم مکان مجھے الاٹ ہوا۔ وہ روحیں جن سے گھروں میں رونق ہوتی ہے' میں پاکستان پر نچھاور کر آیا تھا۔ میرے بھانجے بھانجی ہمیرا اور عائشہ نے ابھی زندگی کی چند ہی بہاریں دیکھی تھیں کہ اپنی والدہ سمیت بلوائیوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ میں ان کے بے گور و کفن لاشے وہیں چھوڑنے پر مجبور تھا جو زندگی میں مجھے خون کے آنسو رلاتے رہیں گے۔

تھوڑے عرصے بعد میں نے اپنی تایازاد ثمینہ سے نکاح کر لیا۔ وہ بیچاری بھی اپنے بچوں اور خاوند کی لاشیں بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آئی تھی۔ ہم نے پھر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔

نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی بھارتیوں کا تعصب برقرار ہے۔ اگر کوئی لڑکی بھارت سے بیاہ کر پاکستان آ جائے' تو دوبارہ اسے اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں یا عزیز و اقارب سے ملنے بھارت جانے کے لیے کئی جاں گسل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اول تو بھارتی اُسے پاکستان میں شادی کرنے کی پاداش میں اپنے ملک کا شہری مانتے ہی نہیں کہ تم نے پاکستان میں شادی کر لی لہٰذا تمہاری شہریت ختم۔ اب نئے سرے سے اپنے کاغذات بنواؤ اور بھارت میں اپنے عزیز و اقارب اور والدین کی موجودگی کا ثبوت پیش کرو۔ کسی بھی ملک کا باشندہ ہنگامی صورت میں فوری بھارت جا سکتا ہے جبکہ پاکستانیوں کو غمی یا خوشی کی تقریب میں فوری شریک ہونے کے لیے پاپڑ بیلتے بیلتے اڑھائی سے تین ماہ لگ جاتے ہیں' وہ بھی عملے کی خوشامد اور مٹھی گرم کر کے۔ یوں بیچارے والدین اور بچے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بچوں سے نوازا جن کے نام میں نے ہمیرا اور عائشہ ہی رکھے۔ آہستہ آہستہ زخم مندمل ہونے لگے۔ یہ غالباً ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ ایک دن صبح دس بجے کے قریب کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوچا ہمیں کون ملنے آ سکتا ہے؟ اسی سوچ کے گرداب میں صحن پار کیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا' تو سامنے پولیس کی وردی میں ملبوس دو سپاہی اور ان کے ہمراہ ایک سکھ جوڑا کھڑا تھا۔

''یا اللہ خیر!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ میری لب کشائی سے پہلے ہی ایک سپاہی نے مدعا بیان کیا کہ یہ لوگ بھارت سے آئے ہیں۔ یہ گھر جہاں آپ رہتے ہیں' ان کا آبائی ہے اور وہ اسے اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں! میں نے مسکراتے ہوئے انھیں اندر بلا لیا اور چائے وغیرہ سے اُن کی تواضع کی۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ جوڑا ایک ایک کمرے میں گیا اور بغور گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا جیسے پرانی ساعتیں یاد کر رہے ہوں۔ پھر انھوں نے چھت پر جانے کی اجازت چاہی جو میں نے بخوشی

دے دی۔ اوپر جاتے ہی سکھ جوڑے کی آنکھیں قدرے پھیل گئیں اور وہ تار پر ٹنگے کپڑے ہٹا کر اسے بغور دیکھنے لگے۔ سردار جی کی تو جیسے باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگے "بھائی جی! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم یہ تار اتار لیں، یہ ہمارے پرکھوں کی نشانی ہے۔"

اس معمولی سی تار کی بھلا کیا وقعت تھی، میں نے بخوشی انھیں اجازت دے دی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے ہاتھ میں پکڑے تھیلے میں سے پلاس نکالا اور بڑی سرعت سے تار کھولنے لگے جو دائیں بائیں فولادی میخوں پر قدرے مضبوطی سے لپٹی ہوئی تھی۔ انھیں زیادہ مشقت نہ کرنی پڑی اور چند ہی منٹوں میں وہ اس کام سے فارغ ہو گئے۔ تار کا گچھا بنا تھیلے میں ڈال وہ اسی سرعت سے نیچے اتر آئے۔

انھوں نے پھر پہلے سے زیادہ تپاک سے ملنے کے بعد اجازت چاہی۔ لیکن میرے دل میں تار کے متعلق تجسس بڑھ چکا تھا کہ ایسی کون سی بات ہے جو وہ اتنا سفر کر کے خاص طور پر تار لینے پاکستان چلے آئے۔ جب وہ ہمارے گھر کی دہلیز پار کرنے لگے تو میں نے تار کے متعلق پوچھ ہی لیا کہ اس میں کیا راز ہے جو آپ یہاں بھی ساتھ لے کر آئے اور تار حاصل کرتے ہی چل دیے۔

یہ سن کر سردار جی نے چند لمحے سوچنے میں گزارے اور کہنے لگے "اگست ۱۹۴۷ء میں جب فسادات حد سے بڑھ گئے اور جان مال کا کوئی اعتبار نہ رہا، تو ہمیں اپنا گھر چھوڑ کر نقل مکانی کرنی پڑی۔ تب قتل و غارت اور لوٹ مار کا ایسا بازار گرم تھا کہ عورتوں کے ہاتھ میں پڑی انگوٹھی یا کانوں کی بالیاں تک نوچ لی جاتیں۔ یہ تار دراصل سونے کی ہے۔ میرے دادا نے اس وقت تار پر ایسا روغن پھیرا جس سے یہ لوہے کی معلوم ہو اور چھت پر جا کر دیواروں میں کیل ٹھونک کر باندھ دی کہ جب حالات بہتر ہوئے تو آ کر لے جائیں گے اور بھگوان کی کرپا سے ایسا ہی ہوا۔ یہ ہماری امانت تھی سو لیے جا رہے ہیں۔"

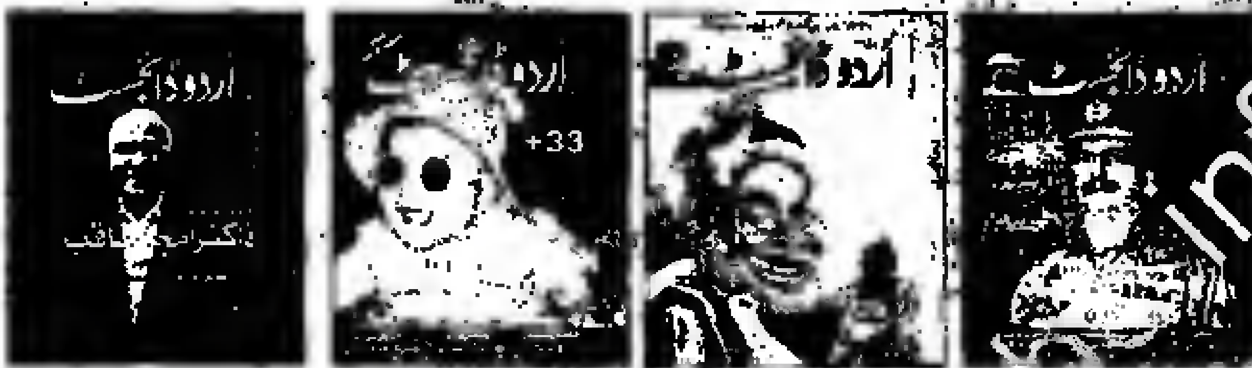
۱۴؍اگست کے دن پورے ملک میں خوب گہما گہمی اور عام تعطیل کے باعث گھروں میں بھی رونق ہوتی ہے۔ ہر چہرہ شاداں و فرحاں نظر آتا ہے۔ ٹی وی میڈیا، اخبارات اور جرائد بھی اس خوشی کی تقریب میں حصہ لیتے ہیں۔ گھروں کی چھتوں پر قومی پرچم لہرایا جاتا اور معصوم بچے سبز ہلالی پرچم سے مشابہ لباس پہنتے اور گلی محلوں کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجاتے ہیں جبکہ نوجوان ہلڑبازی اور رات گئے تک دھینگا مشتی کرتے یہ دن گزارتے ہیں۔ دانستہ موٹر سائیکلوں کے سائلنسر اتارے جاتے ہیں اور وطن کا کوئی گوشہ ان کی چیخم دھاڑ سے محفوظ نہیں ہوتا۔ یوں کہہ لیں کہ پورے ملک ہی میں انارکی کا سماں ہوتا ہے۔ میں نوجوان نسل کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس دن ہم پر کیا بیتی اور یہ آزادی ہم نے کن جاں گسل مراحل سے گزر کر حاصل کی۔ پھر آپ خود ہی فیصلہ کیجیے گا کہ آپ کو یہ دن کس طرح منانا چاہیے۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے عزیز و اقارب اور سگے بھائیوں کو بلوائیوں کے ہاتھوں چھروں سے قتل ہوتے، ماؤں کی چھاتیاں کٹتے، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت دری ہوتے دیکھی۔ اس وقت آسمان گریاں اور زمین شق ہوئی۔ کئی حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک ہوتے اور نومولودوں کو نیزوں میں پروتے دیکھا۔ چیختی چلاتی مدد کے لیے پکارتی ہماری لاتعداد بہو بیٹیاں درندے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ بے بسی اور بیچارگی کا دردناک عالم تھا۔ البتہ اس روز آسمان نے گھن گرج کے ساتھ خوب آنسو برسائے کہ ہر طرف طغیانی بپا ہو گئی۔ ہم نے گھر بار، املاک اور معصوم جانوں کی قربانی کے علاوہ اذیت ناک صعوبتیں جھیلیں اور بھوکے پیاسے کربناک طویل مسافت کے بعد یہ وطن حاصل کیا تھا۔ قتل و غارت اور تقسیم ہند کے بعد ہجرت پر پابندی لگا دی گئی۔ جو کم و بیش تین سال برقرار رہی۔ یوں خاندانوں کے خاندان بٹ کر رہ گئے۔ بیشتر خاندان اپنے پیاروں سے ملنے کی آس میں بوڑھے ہو گئے یا قبروں میں ابدی نیند جا سوئے۔ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اس کی قدر کریں۔ یہ داستان سن کر شریف مرزا رو پڑے۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے اور مجھے احساس ہوا کہ ہمارا وطن پاکستان اللہ تعالیٰ کا عظیم تحفہ ہے، بیش بہا تحفہ!

◆◆●

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

* 560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے * اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے



اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ______ فون نمبر ______

پتا ______ ای میل ______

میں ماہ ______ 20ء سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ______ دستخط ______

[illegible]



مسئلہ کشمیر جنم لیتا ہے

جموّں کا قتلِ عام

بندو مہاراجا ہری سنگھ کے حکم پر جب لاکھوں مسلمانوں کو تہِ تیغ کر دیا گیا..... ریاستی دہشت گردی کی خوفناک داستان

افتخار احمد افتخار

ہماری رہائش ریاست جموں و کشمیر کے سرمائی صدر مقام، جموں کے سب سے بڑے محلے میں تھی۔ اس محلے میں صرف مسلمان آباد تھے۔ ہمارے محلے کے دو اطراف دریائے توی اور ایک طرف دریائے چناب سے نکالی ہوئی نہر بہتی تھی۔ ہم گرمیوں میں اس نہر پر نہانے جاتے تھے۔ اس کا پانی اتنا سرد تھا کہ دس منٹ سے زیادہ پانی میں رہتے تو دانت بجنے لگتے۔

سری نگر کی جھیل ڈل میں بہتی ایک کشتی (ہاؤس بوٹ) کے بھی ہم مالک تھے۔ وہ کشتی دو خواب گاہوں ملحقہ غسل خانوں اور کھانے کے بڑے کمرے پر مشتمل تھی۔ ساتھ ایک چھوٹی کشتی بھی ہوتی جس میں باورچی خانے کے علاوہ ملازمین کے دو چھوٹے کمرے تھے۔ لوگ چھوٹی کشتیوں میں پھول، پھل، سبزیاں اور مچھلی بیچنے آتے تھے۔

میرے والد کا کاروبار یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں تھا۔



ہیڈکوارٹر طولکرم (فلسطین) میں تھا۔ وہ سال دو سال بعد کچھ ماہ کے لیے جموں آتے تھے۔ کبھی ہماری والدہ صاحبہ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ ۱۹۴۶ء میں والد صاحب جموں آئے، تو ہماری والدہ اور پانچ سالہ چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ فلسطین لے گئے۔ میں اور میری دونوں بڑی بہنیں اپنے دادا دادی اور پھوپھی کے پاس رہے۔

جموں شہر میں ہمارا اسکول تعلیمی معیار میں سب اسکولوں سے بہتر تھا مگر اس میں مخلوط تعلیم تھی۔ مسلمان طلبہ بالخصوص طالبات کی تعداد کم تھی۔ میری جماعت میں ایک سکھ لڑکا، چھے مسلمان اور سات ہندو لڑکے تھے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کا فیصلہ ہو گیا، تو میرے غیر مسلم ہم جماعت طلبہ کا رویہ بدلنے لگا۔ ایک دن آدھی چھٹی کے وقت میرے ہم جماعت رنبیر سنہ نے قائداعظم کو گالی دی۔ مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ میرے منع کرنے پر اس نے جیب سے چاقو نکالا اور میرے شانوں کے درمیان رکھ کر زور سے دبانے لگا۔

اچانک کچھ مسلمان لڑکے آ گئے، تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں زخمی ہونے سے بچ گیا مگر میرا کوٹ پھٹ چکا تھا۔ دو دن بعد خالی پیریڈ میں رنبیر کے دوست کیرتی کمار نے مسلمانوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میرے منع کرنے پر کیرتی کمار نے کہا، ہم تم مسلوں کو ختم کر دیں گے اور مجھ پر پل پڑا۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ میرا ایک مکا کیرتی کی ناک کو لگا اور خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر لڑکیاں چیخنے لگیں۔ شور سن کر ٹیچر انچارج آ گئیں۔ پرنسپل صاحب گو ہندو تھے مگر منصف مزاج۔ حقائق جان کر انھوں نے کیرتی کمار کو جرمانہ کیا اور رنبیر کو اسکول سے نکال دیا۔

جموں شہر میں تعلیم کا تناسب سو فی صد تھا۔ اسی لیے وہ سیاست کا گڑھ بن گیا۔ ۱۹۴۷ء کی ابتدا ہی سے جموں کے آئے دن جلسے کرنے اور جلوس نکالنے لگے۔ ایک دفعہ جلوس میں کم از کم آٹھ سال تک کے بچوں کو بھی شامل کیا گیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ تمام بچوں کے ہاتھوں میں مسلم لیگ کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے تھے۔ ان جلوسوں میں یہ نعرے لگائے جاتے۔

"لے کے رہیں گے پاکستان۔" "بن کے رہے گا پاکستان۔"
"پاکستان کا مطلب کیا..... لا الٰہ الا اللہ۔"

مسلمانوں کو یقین تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہو گا، کیونکہ ایک تو وہاں مسلمان کافی غالب اکثریت میں تھے۔ دوسرے کی سرحدوں کے ساتھ واقع کبھی اضلاع بھی مسلم اکثریتی تھے۔ چناں چہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا یوم آزادی بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ میری خواہش پر میرے دادا جان نے پاکستان کا ایک بہت بڑا جھنڈا ہمارے دو منزلہ مکان کی چھت پر ۳۲ فٹ لمبے پائپ پر لگایا۔ مگر مسلمانوں کے جوش و ولولے نے ڈوگرا حکمرانوں کو غم و غصے سے پاگل کر دیا۔

اکتوبر کے شروع میں ہی ڈوگرہ پولیس نے صوبہ جموں کے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لے کر ہر قسم کا اسلحہ بشمول کلہاڑیاں، چار انچ سے لمبے پھل والے چاقو چھریاں سب برآمد کر لیے۔ ساتھ ہی ہندو اکثریت والے دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ان کے مکانوں اور فصلوں کو نذر آتش کیا جانے لگا۔ ہندوؤں سے یہ بھی سننے میں آیا کہ مسلے عید پر جانور قربان کرتے ہیں، اس عید پہ ہم مسلے قربان کریں گے۔ پاکستان اور بھارت میں عیدالاضحیٰ اتوار ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو تھی۔

اس دوران گاندھی نے مہاراجا ہری سنگھ پر مختلف طریقوں سے بھارت کے ساتھ الحاق کے لیے دباؤ ڈالا۔ مسلمانوں کی طرف سے قرارداد الحاق پاکستان پہلے ہی مہاراجا کے پاس پہنچ چکی تھی۔ مہاراجا ہری سنگھ نے مہلت مانگی۔ عیدالاضحیٰ کے دوسرے دن یعنی ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی فوج سے لدے ہوائی جہاز جموں ہوائی اڈے پر دھڑا دھڑ اترنے لگے۔ یوں بھارتی فوج جموں کشمیر کی سرحدوں پر پہنچ گئی۔ ان میں زیادہ تعداد گورکھا، نابھہ اور پٹیالہ کے فوجیوں کی تھی جو انتہائی ظالم اور بے رحم مشہور تھے۔ جموں میں عیدالاضحیٰ سے پہلے ہی کرفیو لگا دیا گیا۔

اس کرفیو میں ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح دستے بغیر روک ٹوک پھرتے مگر مسلمانوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

ہمارے گھر کے قریب ہندوؤں کے محلے میں دو اونچی عمارتوں پر بھارتی فوج نے مشین گنیں نصب کر لیں۔ آنے والی رات ان دونوں عمارتوں کی چھتوں سے ہمارے گھر کی سمت میں متواتر فائرنگ شروع ہو گئی۔ جواب میں مسلمانوں کے پاس نعرۂ تکبیر اللہ اکبر لگانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیونکہ ان سے ہر قسم کے ہتھیار پہلے ہی لے لیے گئے تھے۔ ہمارا گھر نشانہ بننے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس پر پاکستان کا بہت بڑا جھنڈا بہت اونچائی پر لہرا رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارا خاندان مسلم کانفرنس کی سیاسی و مالی حمایت کرتا تھا۔

اگلے دن ہمارا ہندو کرائے دار بعد دوپہر ہمارے گھر آیا۔ یہ برہمن تھا اور اس پر دادا جان کے کئی احسانات تھے۔ کہنے لگا، میں نے سوچا، کرفیو کی وجہ سے آپ کی زمینوں سے دودھ نہیں آیا ہو گا۔ اس لیے اپنی گائے کا دودھ بچوں کے لیے لے آیا ہوں۔ اس کا شکریہ ادا کر کے ہم سے کہا گیا کہ دودھ ابال کر پی لو مگر کسی کا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسرے دن صبح چائے بنانے لگے تو دیکھا سارا دودھ خراب ہو گیا ہے۔ اسے باہر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر گئے تو دیکھا ایک بلی زمین پر تڑپ رہی ہے۔ وہ تڑپتے تڑپتے ٹھنڈی ہو گئی۔ تب پتا چلا ہمیں ہمارا وہ برہمن کرائے دار ہمدرد بن زہر ملا دودھ پلا کر مارنے آیا تھا لیکن قدرت نے ہمیں بچا لیا۔

ہمارے ایک ہمسائے عبدالمجید ریاستی فوج میں کرنل تھے۔ ان کی تعیناتی گلگت بلتستان کے برفانی علاقے میں تھی۔ ہمیں اکتوبر ۱۹۴۷ء کے آخری دنوں میں پتا چلا کہ ان کے بیوی بچے ستواری (جموں چھاؤنی) میں جا رہے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے کہنے پر دو بچوں کو بھی ساتھ لے جانے پہ تیار ہو گئے۔ اگلی رات وہ مجھے اور میری دونوں بڑی بہنوں، دو کزن اور پھوپھی کو ساتھ لے گئے۔ اس وقت رات ایک اور دو بجے کے درمیان کا وقت تھا۔ ہم ایک فوجی ٹرک پر سوار تھے۔ گھر سے ہمیں کچھ آٹا، چاول، دالیں، ایک لیٹر تیل زیتون اور کچھ پیسے دے دیے گئے۔

ستواری چھاؤنی میں بھی ہم محفوظ نہ تھے۔ بعض اوقات رات کو "جے ہند" اور "ست سری اکال" کے نعروں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی یوں لگتا کہ بہت قریب سے آ رہی ہیں۔ پتا چلا کہ مسلح ہندو اور سکھ جتھوں کی صورت مسلمانوں پر حملے کرنے کے لیے یہاں سے گزرتے ہیں۔ حفاظت کا معقول انتظام نہ ہونے کے باعث ہم ہر وقت موت کے لیے تیار رہتے۔ کھانا پکانے کے لیے میں اپنے کزن کے ساتھ باہر سے سوکھی تھور توڑ لاتا تھا جس سے میری ہتھیلیاں کانٹوں سے چھلنی ہو گئیں۔ جب تک ہم واپس نہ آتے ہماری بہنیں ہماری خیریت کی دعائیں مانگتی رہتیں۔ ہمارے پاس کھانے کا سامان تھوڑا تھا اور مزید لانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے ہم تھوڑا ہی کھاتے۔ زیتون کا تیل ختم ہو گیا، تو ابلے پھیکے چاولوں پر بغیر پیاز، لہسن، نمک مرچ مسالہ صرف ابلی دال ڈال کر کھا لیتے۔

ہم اس کوٹھی میں کل پانچ لڑکے تھے۔ سب سے بڑا ۱۸ سال کا تھا۔ سب سے چھوٹا میں تھا۔ تب میری عمر دس سال تھی۔ کوئی بڑا مرد وہاں مقیم نہ تھا۔ البتہ خواتین خانہ رو رہی تھیں۔ نلکے میں پانی بہت کم آتا۔ اس لیے ۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو بعد دوپہر ہم لڑکے قریبی نہر پر نہانے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ نہر کے پانی میں خون اور جسمانی لوتھڑے بہتے جا رہے ہیں۔ ہم ڈر گئے اور الٹے پاؤں بھاگے۔ ہمارے واپس پہنچنے کے کوئی ایک گھنٹا بعد کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

خاتون خانہ نے لڑکیوں کو اندر بھیج دیا پھر ایک ڈنڈا انھوں نے اٹھایا۔ ہم نے بھی ان کی تقلید کی۔ دوبارہ زور سے دستک ہوئی۔ خاتون خانہ نے مجھے کنڈی کھولنے کا اشارہ کیا۔ جوں ہی میں نے کنڈی کھولی، ایک چھے فٹ کا نوجوان دروازے کو دھکا دیتا اندر داخل ہوا، "سب مر گئے" کہہ کر اوندھے منہ گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ سب ششدر رہ گئے۔ اسے سیدھا کیا تو لڑکوں میں سے کوئی چیخا "بھائی جان؟ کیا ہوا؟"

اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ ہوش میں آ کر پھر چیخا "سب مر گئے۔" اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمارے عزیز و اقارب سب مار دیے گئے ہیں۔ چناں چہ

سب زاروقطار رونے لگے۔ ہم اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ وہ لڑکا خاتون خانہ کے جیٹھ اور ہمارے ساتھی لڑکوں کے تایا کا بیٹا تھا۔

ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے جموں سے نکلنے کے بعد مسلسل گولیاں چلتی رہیں اور جو بھی چھت پر گیا، زندہ سلامت واپس نہ آیا۔ جموں کے نواحی ہندو اکثریتی علاقوں سے زخمی اور بے خانماں مسلمان جموں شہر پہنچ رہے تھے۔ وہ بھی ہندوؤں، سکھوں اور بھارتی فوج کے ہاتھوں مسلمانوں کے بیہمانہ قتل کی خبریں سنا رہے تھے۔

۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو نیشنل کانفرنس کے راہنما کرنل ریٹائرڈ پیر محمد کی طرف سے سارے شہر میں اعلان کیا گیا کہ جس نے پاکستان جانا ہے، وہ پولیس لائنز پہنچ جائے۔ وہاں بسیں پاکستان جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ اس سے پہلے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کی طرف سے جنگ آزادی شروع ہونے کی خبر بھی پھیل چکی تھی۔ شہر میں سبھی مسلمانوں کے پاس راشن تقریباً ختم تھا۔ سو جموں شہر کے مسلمان پولیس لائنز پہنچنا شروع ہو گئے۔

بسوں کا پہلا قافلہ ۵ نومبر کو روانہ ہوا اور دوسرا ۶ نومبر کو صبح سویرے۔ وہ نوجوان اور اس کے گھر والے ۶ نومبر کے قافلے میں روانہ ہوئے۔ جموں چھاؤنی سے آگے جنگل میں نہر کے قریب بسیں رک گئیں۔ وہاں دونوں طرف بھارتی فوجی بندوقیں اور مشین گنیں تانے کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ”جے ہند“ اور ”ست سری اکال“ کے نعرے بلند ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے بسوں پر دھاوا بول دیا۔

جن مسلمانوں کو بسوں سے نکلنے کا موقع ملا، وہ ادھر ادھر بھاگے۔ ان میں سے کئی بھارتی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے اور بہت کم زخمی یا صحیح حالت میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ جوان اور ان کے گھر والے دروازے کے قریب بیٹھے تھے۔ اس لیے وہ بس سے جلد نکل کر بھاگے۔ کچھ نیزوں اور خنجروں کا نشانہ بنے۔ کچھ گولیوں کا۔ اس جوان نے نہر میں چھلانگ لگائی اور پانی کے نیچے تیرتا ہوا جتنی دور جا سکتا تھا، نکل گیا۔ پھر پانی سے باہر آ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ جموں چھاؤنی کی مخالف سمت بھاگ رہا تھا۔ اس نے الٹے پاؤں بھاگنا شروع کر دیا اور جس جگہ حملہ ہوا تھا، وہاں پہنچ گیا۔

حملہ آور جا چکے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنے لگا۔ مرد عورت بوڑھوں سے لے کر شیرخوار بچوں تک سب کی سیکڑوں لاشیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ بسیں خون سے لت پت تھیں۔ ان کے اندر بھی لاشیں تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے والدین کی خون آلود لاشیں مل گئیں۔ اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ گر

جموں کے بدقسمت مسلمان

۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کے علاقے جموں میں آباد افراد میں تقریباً پینتیس فیصد مسلمان تھے۔ جب ہندو ڈوگرا راجا ہری سنگھ کو اپنی حکومت ختم ہوتی محسوس ہوئی تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ جموں سے مسلمانوں کا صفایا کر ڈالیں۔ یوں وہ کم از کم جموں میں اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا تھا جہاں ہندو اور سکھ زیادہ آباد تھے۔

ڈوگرا فوج نے پھر جموں میں مسلمانوں کی نسلی صفائی شروع کر دی۔ سیکڑوں مسلم دیہات صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ مسلمان بچوں، بڑوں اور بوڑھوں کا بے دریغ قتل عام ہوا۔ مسلمانوں کی اس نسل کشی میں ہندوؤں اور سکھوں نے بھی بھرپور حصہ لیا اور بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۴۷ء میں جموں کے تین سے پانچ لاکھ مسلمان شہید کیے گئے۔ جبکہ لاکھوں نقل مکانی کر کے وادی کشمیر اور پاکستان چلے گئے۔

یہ جموں میں مسلمانوں کا قتل عام ہی ہے جس کے خلاف مسلمانان کشمیر نے نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ ظالم ڈوگرا شاہی کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ بعد میں صوبہ سرحد سے پٹھان جہاد میں شریک ہونے آ پہنچے۔ بدقسمتی سے مسلم لشکر بدنظمی کا شکار ہو گیا ورنہ وہ سری نگر پہنچ جاتا تو آج کم از کم وادی کشمیر اور لداخ کے علاقے پاکستان میں شامل ہوتے۔

گیا۔ ہوش آیا تو اپنے باقی عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈنے لگا۔ اتنے میں دور سے نعروں کی آوازیں سنائی دیں وہ پھر بھاگ اٹھا۔ نہر کے کنارے بھاگتا ہوا وہ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہم دو دن رات روتے رہے اور کچھ نہ کھایا پیا۔ آخر تیسرے دن خاتون خانہ نے چاول ابالے۔ ہم سب بچوں کو پیار کیا اور تھوڑے تھوڑے چاول کھانے کو دیے۔

تین دن بعد ایک ادھیڑ عمر، ایک جوان خاتون اور ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہمارے پاس آئے۔ جوان خاتون کی گردن میں پچھلی طرف ایک انچ چوڑا اور کافی گہرا زخم تھا جس میں پیپ پڑ چکی تھی۔ یہ لوگ جموں میں ہمارے محلے دار تھے۔ لڑکی میرے ایک ہم جماعت ممتاز کی بڑی بہن تھی۔ جوان خاتون اس کی بھابی اور بڑی خاتون اس کی والدہ تھیں۔ ان کا پورا خاندان ۶ نومبر والے قافلے میں تھا۔

انھوں نے جب دیکھا کہ مردوں، بڑی عمر کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جا رہا ہے اور بلوائی جوان لڑکیوں کو اٹھا لے جا رہے ہیں، تو وہ بس سے نکل بھاگے۔ ممتاز کی بھابی اور دونوں بہنوں نے اغوا سے بچنے کے لیے نہر میں چھلانگیں لگا دیں۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ایک بلوائی نے نیزے سے وار کیا جو بھابی کی گردن میں لگا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ گر کر بے ہوش ہو گئی۔ پھر گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ ممتاز کی والدہ گولیوں سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ گئیں۔ ان کے اوپر چار پانچ عورتوں مردوں کی لاشیں گریں۔ ان کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں مگر وہ اسی طرح پڑی رہیں۔ انھوں نے یہ ہولناک منظر بھی دیکھا کہ ایک بلوائی نے ایک شیرخوار بچے کو ماں سے چھین کر ہوا میں اچھالا اور نیزے سے ہلاک کر دیا۔

شور شرابا ختم ہونے پر جب خاتون کو اندازہ ہوا کہ بلوائی چلے گئے ہیں، تو بڑی مشکل سے اس نے خود کو لاشوں کے نیچے سے نکالا اور اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے لگی۔ تینوں بیٹوں اور باقی رشتے داروں کی لاشوں اور اپنی بے چارگی پر آنسو بہاتی رہی۔ اچانک بہو اور بیٹیوں کا خیال آیا اور وہ دیوانہ وار نہر کی طرف بھاگی۔

بہو نہر کے کنارے پڑی ملی۔ اس کے منہ میں پانی ڈالا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بیٹی آ کر چیختی چلاتی ماں اور بھابی کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس نے بتایا کہ چھوٹی بہن ڈوب گئی ہے۔ وہ نہر کی تہ میں تیرتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ اب واپس سب کو ڈھونڈنے آئی تھی۔

ماں بیٹی نے بہو بھابی کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور ان کے بازو اپنی گردنوں کے گرد رکھ ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ رات ہوئی تو جنگلی جانوروں سے بے نیاز ایک جگہ پڑی رہیں۔ صبح ہوئی تو پھر چل پڑیں۔ چند گھنٹے بعد دور ایک کچا مکان نظر آیا۔ بہو اور بیٹی کو جھاڑیوں میں چھپا کر بڑی خاتون مکان تک گئیں۔ کھانے کو کچھ نہ ملا۔ جیب خالی تھی اور بھیک مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جموں چھاؤنی کا راستہ پوچھا تو پتا چلا کہ ابھی تک سارا سفر مخالف سمت میں طے کیا تھا۔ چاروناچار الٹے پاؤں سفر شروع کیا۔ بھوک پیاس نے ستایا، تو جھاڑیوں کے سبز پتے توڑ کے کھا لیے۔ گڑھے میں بارش کا پانی جمع تھا اور جس میں کیڑے چپکے تھے، وہ پی لیا۔ چلتے چلتے پاؤں سوج گئے۔ مزید ایک دن کی مسافت کے بعد وہاں پہنچے جہاں سے وہ چلی تھیں۔ حد نظر تک لاشیں بکھری پڑی تھیں اور ان کی بدبو پھیل چکی تھی۔ نہر سے پانی پیا تو کچھ افاقہ ہوا اور آگے چل پڑے۔ قریب ہی ایک نزالسفار سر کو اٹھائے چار کھمبے نظر آئے۔ ان سے ایک عورت کی برہنہ لاش دو کھمبوں سے اس طرح باندھی گئی تھی کہ ایک بازو اور ایک لات ایک کھمبے سے اور دوسرا بازو اور دوسری ٹانگ دوسرے کھمبے سے بندھا تھا۔ اس کی گردن سے ایک کاغذ بندھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا: یہ ہوائی جہاز پاکستان جا رہا ہے۔"

نومبر ۱۹۴۷ء میں بھارتی فوج، راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا اور اکالی دل کے مسلح کارکنوں نے صوبہ جموں میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا جن میں مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے اور بچے سب شامل تھے۔ سیکڑوں جوان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں اور لاکھوں مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا۔ تیس ہزار سے زائد مسلمان صرف نومبر کے پہلے چھے دنوں میں ہلاک کیے گئے۔ اغوا

ہونے والی لڑکیوں میں مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس اور نائب صدر چودھری حمید اللہ کی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔

کرنل عبدالمجید کے بھائی جموں میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کے وسط میں وہ چھاؤنی آئے اور بتایا "جموں میں تمام مسلمانوں کے مکان لوٹے جا چکے اور تمام علاقہ ویران پڑا ہے، تاہم شیخ محمد عبداللہ کو وزیراعظم بنا دیا گیا ہے اور امید ہے کہ اب امن ہو جائے گا۔" واپس جا کر انھوں نے کچھ دالیں، چاول اور آٹا وغیرہ ہمارے لیے بھجوا دیا۔ چار ہفتے بعد ایک جیپ آئی اور ہمارے خاندان کے بچے کھچے لوگوں یعنی مجھے، میری دو بہنوں، دو کزنوں اور پھوپھی کو جموں شہر میں کرنل ریٹائرڈ پیر محمد کے گھر لے گئی۔

وہاں قیام کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ ۶ر نومبر کو مسلمانوں کے قتل عام کے بعد خون سے بھری بسیں چھاؤنی کے قریب واقع نہر میں دھوئی گئی تھیں۔ اسی وجہ سے ہم نے نہر میں خون اور جسمانی لوتھڑے دیکھے تھے۔ مسلمانوں کے قتل کا منصوبہ انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے مسلمانوں کے علم میں بھی وقوعہ کے بعد آیا۔ وہاں کچھ دن قیام کے بعد ہمیں دیمبر بے لاوارث اور زخمی عورتوں اور بچوں کے ساتھ مدراسی فوجیوں کی حفاظت میں ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو سیالکوٹ پاکستان بھیج دیا گیا۔

میں یہ لکھ چکا کہ جموں کے اس عظیم سانحے کے زمانے میں میرے والدین فلسطین میں تھے اور ہم دادا، دادی اور پھوپھی کے پاس تھے۔ میرے دادا، دادی بھیڑ بھاڑ سے گھبرانے والے لوگ تھے، اس لیے انھوں نے پہلے دو دن کے قافلوں میں روانہ ہونے کی کوشش نہ کی۔ ہمارے جو عزیز و اقارب پہلے قافلوں میں روانہ ہوئے، ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔ ہمارے بغیر سات بستوں میں ہمارے بزرگوں کی جو ذہنی کیفیت ہوئی، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ جب ہماری بس سیالکوٹ چھاؤنی آ کر کھڑی ہوئی تو میری بہنوں اور اپنے بچوں کے نام لے کر میری چچی میری بہن سے پوچھتی ہیں "بیٹی تم نے ان کو نہیں دیکھا؟"

میری بہن نے کہا "چچی جان! میں ہی ہوں آپ کی بھتیجی اور باقی سب بھی میرے ساتھ ہیں۔"

لیکن چچی نے کچھ دیر بعد پھر وہی سوال دہرایا۔ ہم فوراً بس سے اتر کر چچی اور پھوپھی سے لپٹ گئے۔ پہلے تو وہ دونوں حیران ہو کر بولیں "آپ لوگ کون ہیں؟" پھر ایک ایک کا سر پکڑ کر کچھ دیر چہرے دیکھنے کے بعد ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار چھوٹ پڑے۔

پاکستان پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے دادا کا جوان بھتیجا جموں میں گھر کی چھت پر بھارتی فوجی کی گولی سے شہید ہوا۔ باقی جو عزیز و اقارب ۶ر نومبر کے قافلے میں گئے تھے، آج تک ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ہمارے کئی عزیز ابھی پولیس لائنز جموں میں تھے ۶ر نومبر کے قافلے میں کٹنے سے بچ جانے والے چند مسلمان، ۷ر نومبر کو فجر کے وقت چھپتے چھپاتے کسی طرح ان کے پاس پہنچ گئے اور قتل عام کا حال بتایا۔ یہ خبر جلد ہی پھیل گئی اور ہزاروں لوگ جو بسوں میں سوار ہو چکے تھے، نیچے اتر آئے۔

مسلم کانفرنس کے ایک راہنما، کیپٹن ریٹائرڈ نصیر الدین موجود تھے۔ انھوں نے وہاں کھڑے سرکاری اہل کاروں کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا "پولیس لائنز کی چھت پر مشین گنیں فٹ ہیں اور آپ کے فوجی بھی مستعد کھڑے ہیں۔ انھیں حکم دیں کہ فائر کھول کر ہم سب کو یہیں ہلاک کر دیں۔ ہمیں بسوں میں بٹھا کے جنگلوں میں لے جا کر قتل کرنے سے بہتر ہے کہ یہیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح آپ کو زحمت بھی نہیں ہوگی اور آپ کا پٹرول بھی بچ جائے گا۔"

چنانچہ ۸ر نومبر کو کوئی قافلہ نہ گیا۔ اسی دوران شیخ عبداللہ جو نیشنل کانفرنس کا صدر تھا، وزیراعظم بن گیا۔ اس نے نابھہ اور پٹیالہ کے فوجیوں کو شہروں سے ہٹا کر ان کی جگہ مدراسی فوجیوں کو لگا دیا۔ میرے دادا، دادی، پھوپھی اور خاندان کے بچے ہوئے تین لوگ ۹ر نومبر کے قافلے میں پاکستان کی سرحد تک پہنچے۔ بسوں سے اتر کر پیدل سرحد پار کی اور ضروری کارروائی کے بعد سیالکوٹ شہر آ گئے۔

◆◆◆

سات کا بابرکت عدد

ڈاکٹر خالد مسعود قریشی

قدرتِ کاملہ کے ایک راز کی کتھا جو لفظ پاکستان سے نتھی ہو گیا



پروردگار عالم نے سات آسمان، خشکی کے سات خطے، سات سمندر بنائے اور یہ کام سات دن میں مکمل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ہفتے کے سات دن مقرر فرمائے۔ انسان کی اپنی تخلیق سات مرحلوں میں ہوئی۔ اللہ نے اپنے گھر کا طواف اپنے بندوں کے ذمے سات چکروں میں رکھا۔ سعی بین صفا و مروہ کے بھی سات چکر مقرر کیے۔ حج کے ایک رکن میں منیٰ میں جمرہ کو سات سات کنکریاں مارنے کا حکم دیا۔

قرآن مجید کی پہلی سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ قرآن مجید کی سات منزلیں ہیں۔ قرآن مجید کی قرأت کے سات انداز ہیں اور اس کی کتابت کے سات طریقے رائج ہوئے۔ عیدین کی تکبیریں سات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد پر طوفان باد و باراں سات دن تک جاری رکھا۔ اونٹ اور گائے کی قربانی میں سات حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ مظہر قدرت، قوس قزح کے رنگ سات ہوتے ہیں۔ نمازیں بھی سات ہیں، پانچ فرض ہیں اور دو نفلی جن میں تہجد اور اشراق کی نماز شامل ہے۔



حضرت سعدؓ بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ وہ بیمار ہوئے، تو عیادت کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے کندھوں کے درمیان رکھا، تو ہاتھ کی ٹھنڈک میری چھاتی میں پھیل گئی۔ دل کی تکلیف کی وجہ سے میری چھاتی میں شدید جلن اور درد ہو رہا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ اسے حارث بن کلادہ کے پاس لے جاؤ جو ثقیف میں مطب کرتا ہے۔ حکیم کو چاہیے کہ وہ مدینہ کی سات عجوہ کھجوریں گٹھلیوں سمیت کوٹ کر اسے کھلائے۔"

قرآن مجید فرقانِ حمید میں عزیزِ مصر (بادشاہ) کو آنے والے خواب اور اس کی تعبیر بیان ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمائی: (سورۂ یوسف آیت نمبر ۴۳)

ایک روز عزیزِ مصر نے کہا" میں نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ اے اہلِ دربار، مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو۔"

لوگوں نے کہا" یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔"

حضرت یوسف کے ساتھی، قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا، اسے مدت دراز کے بعد اب ایک بات یاد آئی۔ اس نے کہا" میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں، مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف علیہ السلام کے پاس) بھیج دیجیے۔"

اس نے جا کر کہا" یوسف علیہ السلام اے سراپا راستی، مجھے خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی، شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں۔"

یوسف علیہ السلام نے کہا" سات برس تک لگاتار تم کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ اس دوران جو فصلیں تم کاٹو، ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ جو تمھاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی اس کی بالوں ہی میں رہنے دو۔ پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا، تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں بارانِ رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔"

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ سات کا عدد قدرت کاملہ کا ایک راز ہے جو تاقیامت ایک راز ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کو سات کے عدد کی حکمت معلوم ہے، تبھی اس عدد کو اتنی اہمیت دی گئی۔

اب وطن عزیز پاکستان کی طرف آئیے۔ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی۔ قیامِ پاکستان سات سال بعد ۱۹۴۷ء میں ممکن ہوا۔ یہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ ہجری کی بابرکت شب معرضِ وجود میں آیا۔ یہ جمعرات اور جمعۃ المبارک کی درمیانی شب تھی۔ اگلے روز جمعۃ الوداع تھا تبھی اس کو عطیہ خداوندی کہا جاتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ لفظ پاکستان کے حروف کی تعداد بھی سات ہی بنتی ہے۔

پ، ا، ک، س، ت، ا، ن پاکستان
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷

پاکستان، باکرامت، باسلامت، تاقیامت۔ پاکستان زندہ باد

☆ مساوات اور اخوت ہو تو جمہوریت جنم لیتی ہے۔
☆ کفایت شعاری قومی فریضہ ہے۔
☆ علم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے، اس لیے علم کو اپنے ملک میں بڑھائیں۔
(قائداعظم محمد علی جناح)



ازقبیلہ مانیست......

سقوطِ حیدر آباد کا شہید

اس مجاہد کی داستانِ عزیمت جس نے جنگِ پاکستان ہزارہا میل دور چھوٹے سے گاؤں میں لڑی

مسعود جاوید

یہ دنیا ہے۔ یہاں ہر وقت فنا کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں۔ جو تھا، نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا... "یہی ہے اک حرفِ محرمانہ۔"

معلوم نہیں وہ قبریں محفوظ بھی ہیں یا انھیں کھود کر ہڈیاں اِدھر اُدھر پھینک دی گئی ہیں۔ ایسی صورت میں ان قبروں کی جگہ کچھ گڑھے ضرور ہوں گے جن میں برسات کا پانی ہر سال کچھ عرصہ کے لیے جمع ہو جاتا ہوگا اور مویشی ان سے پیاس بجھاتے ہوں گے۔ اس چھوٹے سے تالاب کے بند پر آم کا پیڑ تھا جس سے ہم کیریاں توڑا کرتے۔ کیا معلوم وہ درخت زندہ بھی ہے یا صدمے سے مر گیا۔ اس پیڑ کے سائے میں میرے دادا دادی کی جنگ بستہ قبریں تھیں۔ دادا کی قبر اتنی لمبی چوڑی اور اونچی تھی کہ اس پر بیٹھ کر گاؤں کے بے فکرے نوجوان گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ہم بھی بچپن میں اس پر کھیلا کرتے۔ میں نے دادا کو نہیں دیکھا، والد صاحب سے سنا ہے کہ وہ دبلے پتلے مگر طویل القامت تھے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء کا وہ دن انتہائی المناک تھا جس دن گاؤں کے مسلمانوں نے دو رضا کاروں کو میرے دادا کی قبر کی پائنتی، خون آلود وردیوں کے ساتھ قبروں میں اتارا۔ وہ دو روز پہلے ہندو شرپسندوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک رضا کاروں کا افسر کمانڈر تھا۔ دوسرا رضا کاروں میں ابھی



ابھی شامل ہوا تھا..... انسٹرکٹر کا نام سید عبدالغفار تھا۔

اس نے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔ اس کی شہادت سے ڈیڑھ سو سال پہلے ایک سید عبدالغفار نے، جو سلطان ٹیپو کا فوجی سردار تھا..... سردار تو میر صادق بھی تھا..... وفاداری، دلیری اور جاں سپاری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا تھا کہ اس کا نام آج تک سلطان ٹیپو کے ساتھ احترام سے لیا جاتا ہے۔ سید عبدالغفار نے اپنے آقا کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑتے ہوئے کاویری کے کنارے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی تھی۔ آج بھی جنوبی ہند کے ان علاقوں میں جہاں کبھی سلطنت خداداد میسور قائم تھی، اس کا نام عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ عوام و خواص اپنے بچوں کا نام عبدالغفار رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ نام ان علاقوں میں بہت مقبول ہے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل کی بات ہے، حیدرآباد دکن کے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم "مجلس اتحاد المسلمین" کی ایک ضلعی شاخ کی مجلس عمل کا معتمد ہونے کی وجہ سے ضلع کے رضا کاروں کی تنظیم و تربیت میری ذمے داری تھی۔ اس کے لیے مجھے موزوں انسٹرکٹروں کی ضرورت تھی اور میں نے مرکزی مجلس کو اپنی ضرورت سے مطلع کر رکھا تھا۔ وہاں ایک ریٹائرڈ کرنل صاحب انسٹرکٹر مہیا کرنے کا کام انجام دیتے تھے۔

میں ایک روز دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک چاق چوبند نوجوان جس کی عمر بمشکل ۲۵-۳۰ سال تھی، داخل ہوا۔ فوجی طریقے پر سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا۔ اس کا نام سید عبدالغفار تھا۔ جنوبی ہند کے کسی قصبے سے تعلق تھا۔ روانی کے ساتھ تیلگو زبان بول سکتا تھا۔ برٹش انڈین آرمی میں حوالدار کے عہدے سے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر سبکدوش ہوا تھا۔ سگنل کور سے متعلق تھا۔ جاپانیوں کے خلاف برما کے محاذ پر سرگرمی دکھا چکا، اور اب پاکستان کی حمایت میں نعرے لگانے کے جرم میں بے وطن کر دیا گیا تھا۔ ہجرت کر کے حیدرآباد میں پناہ لی۔

یہ وہ دور تھا جب نہ صرف ریاست حیدرآباد دکن سے متصل صوبے مدراس، بمبئی اور سی پی سے مسلمان ہجرت کر کے حیدرآباد آ رہے تھے۔ بلکہ یو۔پی اور بہار کے بعض مسلمان بھی پاکستان جانے کے بجائے حیدرآباد میں پناہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے۔ حیدرآباد اپنی روایتی فیاضی کے ساتھ ان کی میزبانی کے فرائض انجام دینے لگا۔ مجھے یہ نوجوان اچھا لگا، اس لیے جانبداری سے کام لیتے ہوئے، میں نے اسے اپنے آبائی گاؤں کے رضا کاروں کی تربیت کے لیے نامزد کر دیا۔ اس گاؤں میں دس بارہ رضا کار تھے۔ پورے گاؤں میں کوئی دو سو مسلمان تھے جبکہ غیر مسلموں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ آس پاس کے دیہات میں بھی مسلمانوں کے اکا دکا مکان تھے۔

سید عبدالغفار تندہی سے خدمت انجام دینے لگا۔ اسے قیام و طعام کے علاوہ ساٹھ روپیہ ماہانہ معاوضہ خدمت ملتا تھا۔ اسی دوران اس کی ضعیف ماں اور معذور بھائی بھی مہاجر کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ خوش تھا۔ کبھی کبھی اپنی والدہ سے ملنے جاتا۔ وہ انھیں مہاجر کیمپ سے نکال کر مستقل آباد کرنے کی فکر میں تھا۔

چند ہی دنوں میں اس نے رضا کاروں میں عسکری روح پھونک دی۔ قریبی دیہات کے چند ایک مسلم جوانوں کو بھی رضا کاروں میں شامل کر کے ان کی تعداد میں اضافہ کر لیا۔ ہتھیاروں کی کمی کے باوجود ان کی ہمت بندھائی۔ ہتھیار کیا تھے، برچھے بھالے، بھرمار بندوقیں اور ایک تھری ناٹ تھری رائفل! ہفتے میں ایک دفعہ آس پاس کے دیہات میں رضا کاروں کو گشت پر لے جاتا تاکہ وہاں کے غیر مسلموں پر رعب پڑے۔ لیکن اس نے کسی کو تنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ تیلگو میں دیہاتیوں کو سمجھاتا کہ وہ پُرامن رہیں۔ تخریب کاروں کو پناہ نہ دیں۔ لیکن رضا کاروں کی سرگرمی کے ساتھ

ساتھ تخریب کاری کے واقعات بھی بڑھتے گئے۔

مقامی ہندو بھی بیرون سے آنے والے انتہا پسند ہندوؤں کی شہ پر تخریب کاری میں ملوث ہونے لگے۔ وہ یہ کہ ریاست حیدرآباد کے خلاف ولبھ بھائی پٹیل کی زہرافشانیوں سے دل ہی دل میں خوش ہوتے مگر برملا اظہار نہ کر پاتے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ کب بھارتی فوجیں ''نجات دہندہ'' کا روپ دھار کر حیدرآباد کی سرحدیں عبور کرتی ہیں۔

سید عبدالغفار ان حالات میں انتہائی انہماک کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اسی دوران ستمبر ۱۹۴۸ء کے اوائل میں اسے کسی نے خبر پہنچائی کہ قریبی گاؤں میں جہاں مسلمانوں کا کوئی گھر نہیں تھا تخریب کار راتوں کو پناہ لیتے ہیں۔ اس نے ان کو پکڑنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں بتایا گیا، اس نے ایک دن بہت سویرے آٹھ دس رضا کاروں کے ساتھ اس مکان کو گھیر لیا، مگر تخریب کار فرار ہو چکے تھے۔



ہندوستانی حیدرآباد دکن میں بھارتی فوج کا استقبال

اس زمانے میں ہندوؤں کی جاسوسی کا نظام خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اسی دوران کچھ دیہاتی رضا کاروں کے گرد جمع ہو گئے۔ سید عبدالغفار انھیں سمجھانے لگا کہ خوف زدہ نہ ہوں، پُرامن رہیں اور تخریب کاروں کی ہمت افزائی نہ کریں۔ اس کی تقریر کے دوران ایک شخص کے بدلے تیور دیکھ کر ایک رضا کار نے بندوق چلا دی۔ گولی اس شخص کے بازو سے رگڑتی نکل گئی۔ سید عبدالغفار اس کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

بندوق کی آواز سن کر لاٹھیوں اور پتھروں سے مسلح کچھ لوگ آئے اور رضا کاروں کی طرف بڑھنے لگے۔ رضا کاروں کے اصرار کے باوجود سید عبدالغفار نے نہ تو خود گولی چلائی اور نہ رضا کاروں کو اس کی اجازت دی...... وہ بے رحم نہیں تھا۔ وہ ایک چٹان پر چڑھ گیا، رضا کار اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ وہ تیلگو میں تقریر کرتا رہا مگر مجمع کے قدم ہر طرف سے اس کی طرف بڑھتے گئے۔ پہاڑی کا وعظ بے اثر ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ رضا کار لاٹھیوں اور پتھروں کی زد میں آ گئے۔

ایک لاٹھی سید عبدالغفار کے ہاتھ پر پڑی۔ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی جسے دوسرے رضا کار نے اٹھا لیا۔ پھر تو مجمع اور بھی دلیر ہو گیا۔ پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ لاٹھیاں برسنے لگیں۔

سید عبدالغفار گر پڑا اور وہ رضا کار بھی جس کی جھولی میں ایمونیشن تھا...... رضا کار مجمع کا گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گئے مگر وہ اپنے زخمی انسٹرکٹر اور ایک ساتھی رضا کار کو باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

میں اس روز حیدرآباد شہر میں تھا۔ ایک سائیکل سوار رضا کار یہ خبر جانکاہ لے کر مجھ تک پہنچا، تو میں نے پولیس سے رابطہ قائم کیا۔ پولیس دوسرے دن جائے حادثہ پر پہنچی۔ سید عبدالغفار اور ساتھی رضا کار کی مسخ شدہ لاشیں تنگی کے کھیت میں گیلی مٹی پر پڑی ہوئی تھیں۔

اس المیے نے رضا کاروں اور مجھ میں انتقامی جذبہ بیدار کر دیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں نے قلعہ گولکنڈہ سے ایک سو رضا کاروں کی خدمات حاصل کیں جن میں کچھ سابق فوجی بھی شامل تھے اور انھیں ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ بھیگی ہوئی رات کی

تاریکی میں انھیں گاؤں پہنچایا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پو پھٹنے سے پہلے ہم نے متعلقہ گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ میں خود، چند رضاکاروں کے ساتھ آبادی میں داخل ہوا۔ تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ شرپسند پہلے ہی فرار ہو چکے۔ پھر ایک دفعہ دشمنوں کی جاسوسی کام کر گئی۔

تھکے ماندے رضاکار اسی دن شام، بے نیل مرام گولکنڈہ لوٹ گئے۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اپنے آبائی گاؤں میں گھر پر سستانے رک گیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۲ ستمبر کی شام کو بندوقوں کے ایک وزنی بنڈل کے ساتھ، جو مجھے واپس کرنے تھے، شہر جانے کے لیے قریبی ریلوے اسٹیشن پہنچا تو ہُو کا عالم تھا۔ سناٹا، اداسی، تاریکی.... معلوم ہوا کہ گزشتہ شب قائداعظم اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

حیدرآباد کے نامپلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا، تو معلوم ہوا کہ قائد کے سوگ میں مکمل ہڑتال ہے۔ گاڑیوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بندوقوں کا وزن میرے لیے مسئلہ بن گیا۔ بمشکل ایک سائیکل رکشا ملا جس نے مجھے گھر تک پہنچایا۔ ساری رات بے خوابی اور بے قراری میں گزاری۔

۱۳ ستمبر کی صبح قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رضاکاروں کا اجتماع منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ اپنی تقریر کے دوران سید قاسم رضوی نے اطلاع بم پہنچائی کہ گزشتہ شب بھارتی طیاروں نے حیدرآباد کی ہوائی پٹیوں پر بمباری کی ہے اور فوجیں حیدرآباد کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ اجتماع کے بعد افسردہ گھر لوٹا ہی تھا کہ پیغام ملا، فوراً مجلس اتحاد المسلمین کے صدر دفتر دارالسلام پہنچو۔ حکم ملا کہ میڑچل کے مقام پر جو میرے آبائی گاؤں کے قریب تھا، تین سو رضاکاروں کا مرکز قائم کروں تاکہ بوقت ضرورت بھارتی فوج کی مزاحمت کی جا سکے۔ ادھر ادھر سے رضاکار مرکز میں پہنچنے لگے۔

رضاکاروں کی راہنمائی کے لیے دو سپاہی بھی متعین کیے گئے مگر دونوں دوسرے ہی دن مختلف بہانے کر کے منظر سے غائب ہو گئے۔ میں رضاکاروں کو منظم کر ہی رہا تھا کہ جمعہ ۱۷ ستمبر کا تاریک دن آ گیا۔ ریڈیو عام نہیں ہوا تھا، اس لیے شام تک ہم بے خبر رہے۔ شام کے بعد اطلاع ملی کہ حیدرآباد مرحوم ہو چکا ہے۔

☆☆☆

سید عبدالغفار اور اپنے آباؤ اجداد کی قبر میں چھوڑ کر میں پاکستان چلا آیا۔ سید عبدالغفار کی والدہ اور معذور بھائی کو اس کی شہادت کی خبر پہنچا دی گئی تھی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد ان پر کیا گزری، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا ہو گا جو ہزاروں مسلمانوں کا ہوا جو حیدرآباد کو امن اور پناہ گاہ سمجھ کر وہاں سمٹ آئے تھے۔ ان ہزاروں رضاکاروں پر کیا بیتی ہو گی جو صرف جوش و ولولے کے ذریعے حیدرآباد کو بھارتی چنگل سے بچانا چاہتے تھے۔ میں ان کے انجام سے ناواقف ہوں۔ مجھے وہ بھی یاد آتے ہیں مگر سب سے زیادہ سید عبدالغفار یاد آتا ہے۔

وہ حیدرآبادی نہیں تھا.... مگر حیدرآباد کسی خطے کا نہیں اعلیٰ انسانی اقدار کا نام تھا جن کے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کا چھوٹا سا گمنام گاؤں بھی پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی اس نے پاکستان کی حمایت میں نعرے لگائے اور بے گھر ہوا۔ اسے امید تھی کہ پاکستان اعلیٰ انسانی اقدار کا گہوارہ ہو گا جن کے پنپنے کی توقع اکھنڈ بھارت میں نہیں۔ اس نے پاکستان کی جنگ پاکستان سے کوسوں دور، گاؤں گاؤں لڑی اور شہید ہو گیا۔ اس کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں اور نہ شہیدوں کی کسی فہرست میں اس کا نام ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید عبدالغفار از قبیلہ ما نیست.... وہ تم ہی میں سے ایک ہے۔

◆◆◆

جدوجہد زندگی

مسائلِ حیات سے نہ گھبرائیے

سوچ کی سطح بلند کیجیے

قیصر عباس

پہاڑوں میں گھری ایک وادی میں رہنے والے لوگ بڑی مشکل میں تھے۔ پہاڑ دیوتا جب بھی ان سے ناراض ہوتا، پتھروں کا ایک لشکر نیچے لڑھکا دیتا۔ کئی گھر ملیامیٹ ہو جاتے۔ بارش کے دنوں میں لوگوں کے مویشی، اجناس اور دیگر قیمتی اثاثے سیلاب کی نظر ہوتے۔ برف باری کے دنوں میں گلیاں بازار برف سے اٹ جاتے۔ کئی بار بچے پتھروں کی زد میں آ کر زخمی ہوئے۔ اس قبیلے کے لوگوں کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ لیکن یہی ایک زندگی تھی جس سے وہ آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں وہ بس ایسی ہی زندگی گزار سکتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ تسلسل کے ساتھ آنے والی یہ تباہیاں ان کا مقدر ہیں۔

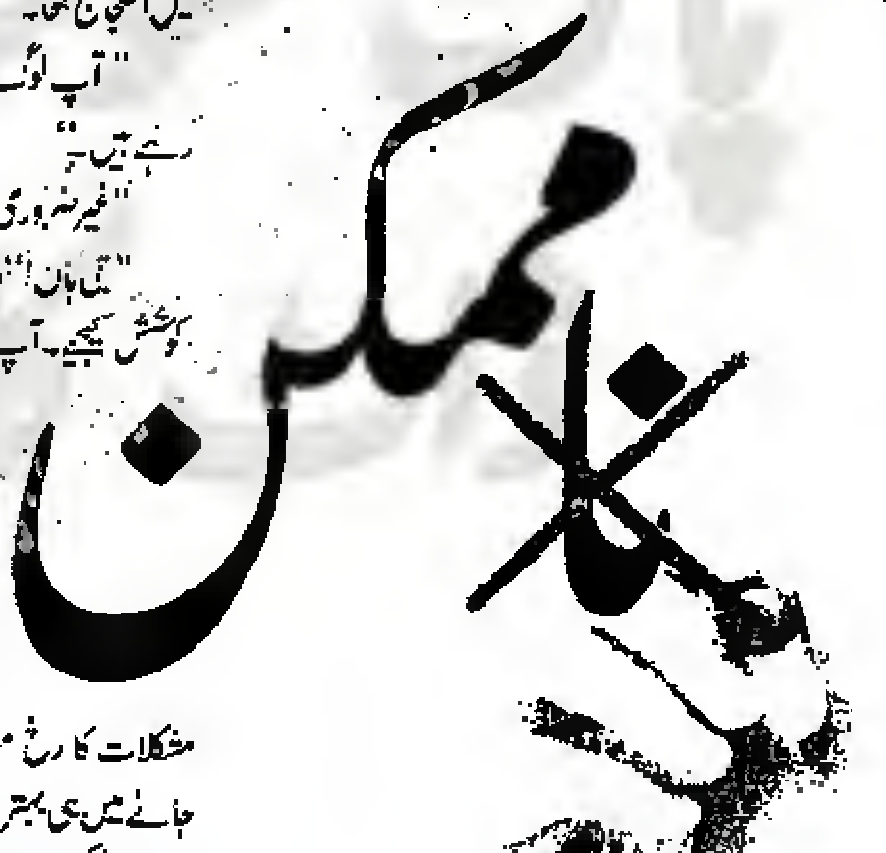
ایک دن وہاں سے عقلمند آدمی کا گزر ہوا۔ اس نے ان کی خستہ حالی دیکھی، تو انھیں سمجھایا "اصل مسئلہ پہاڑوں سے لڑھکتے پتھر، برف باری یا سیلاب نہیں بلکہ آپ خود ہیں۔"

"اصل مسئلہ ہم خود ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟" سب کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"آپ لوگ غیر ضروری طور پر یہ نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔"

"غیر ضروری نچلی سطح؟" وہ سب چیخے۔

"جی ہاں!" وہ عقلمند شخص پُریقین لہجے میں گویا ہوا "سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ وادی کی گہرائی میں رہنے کی وجہ سے ایک کے بعد دوسرے بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔



جب تک آپ نچلی سطح پر رہے، ہمیشہ مشکل میں مبتلا رہیں گے۔ اپنے آپ کو اوپر اٹھا لیجیے، خود کو بلند کیجیے۔ نچلی سطح سے اوپر اٹھ جانے کا فیصلہ کر لیجیے، پھر دیکھیے گا کہ آپ مشکلات کا رخ موڑنے میں کیسے کامیاب ہوتے ہیں۔ اوپر جانے میں ہی بہتری ہے۔ بلندی پر جانے میں ہی نجات ہے۔"

"لیکن ہم یہیں ٹھیک ہیں، اوپر جانے کی مشقت کون اٹھائے؟" انھوں نے کہا

"تم مانو یا نہ مانو، اوپر جانے میں ہی بچت ہے۔"

’’لیکن کیسے، ہمیں دکھاؤ؟‘‘ کسی کے انداز میں تجسس تھا۔

عقلمند آدمی نے انھیں بتایا کہ کس طرح وادی میں بلندی پر ڈھلوانوں سے اوپر گھر بنائے جاتے ہیں۔ تھوڑے عرصے بعد کچھ لوگوں نے وادی کی بلند جگہوں پر گھر بنا لیے۔ جو اور بھی سمجھدار تھے، وہ زیادہ بلندیوں پر پہنچے۔ یوں انھوں نے قدرتی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ محفوظ جگہ کا انتخاب کر لیا۔

’’اب آپ ماضی کی مشکلات سے آزاد زندگی گزاریں گے۔ اپنی رہائش بدلنے سے آپ نے اپنے مسائل کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔‘‘ عقلمند شخص نے کہا۔

’’تم صحیح کہتے ہو۔‘‘ ایک ضدی شخص نے تسلیم کرتے ہوئے کہا ’’اب ہماری زندگی میں بہت سکون آچکا۔ میں خواہ مخواہ اس مشقت بھری زندگی کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ کاش میں نے اتنی مزاحمت کیے بغیر ہی یہ قدم اٹھا لیا ہوتا۔‘‘

’’میں بھی حیران ہوں، ہمیں یہ معمولی سی بات اتنا عرصہ پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘ ایک اور شخص نے اعتراف کیا۔

یہ کہانی ہمیں ہر طرح کی مشکلات سے مقابلہ کرنے کی راہ دکھاتی ہے۔ زندگی میں ایسا کوئی مسئلہ، ایسا کوئی بحران وجود نہیں رکھتا جسے بلند سوچ کے ذریعے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ اگر آپ سوچ کے نچلے درجے پر رہے، تو نچلی زندگی ہی گزاریں گے۔ جوں جوں آپ کی سوچ کا درجہ بلند ہو گا، آپ کی زندگی بھی بلندیوں سے ہمکنار ہونے لگے گی۔

٭٭٭

ایک شخص کسی بزرگ کے پاس آیا اور کہا ’’باباجی! میری مدد کیجیے۔ میرے مسائل میری طاقت سے بہت زیادہ ہیں، میں انھیں حل نہیں کر سکتا۔‘‘

باباجی نے اسے کندھوں سے پکڑا اور کہا ’’دیکھو مجھے ابھی جانا ہے، ویسے اگر تم چاہو تو میں تمھیں ایک ایسی جگہ بتا سکتا ہوں جہاں سب لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں! لیکن میں تمھیں وہاں لے بھی جاؤں تو کیا تم وہاں رہنا چاہو گے؟‘‘

اس شخص نے اشتیاق سے کہا ’’میں وہاں ہر قیمت پر جانا اور ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں جنھیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں۔‘‘

باباجی نے کہا ’’تم ایک بار تو چلے جاؤ گے لیکن شاید تم پھر وہاں رہنا نہ چاہو، وہ جگہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔‘‘

وہ شخص چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد باباجی نے ایک جگہ پہنچ کر اس شخص سے کہا ’’وہ سامنے قبرستان ہے جہاں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگ دفن ہیں۔ ان میں کسی کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔‘‘

دوستو! مسائل دراصل زندگی کا تحفہ ہیں، زندگی کی نشانی ہیں۔ اگر آپ کو ایک بڑا مسئلہ درپیش ہے تو آپ اس کے لیے شکر گزار ہوئیے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ روحانی اور جسمانی طور پر زندہ اور مصروف ہیں۔

انداز نظر بدلیے

آپ کو بہت سی چیزیں، سوچیں اور خیالات پریشان کرتے ہوں گے لیکن وہ ہمیشہ ایسا نہیں کر سکتے۔ پریشانی دراصل آپ کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ چیزیں آپ کو کبھی نہیں کر سکتیں اور نہ ہی غصہ دلا سکتی ہیں۔ آپ کا دکھ اور غصہ آپ کی اپنی اُپج ہے۔ دنیا تو جیسی ہے ویسی ہی ہے مگر آپ کو جیسی نظر آتی ہے، وہ آپ کا انداز نظر ہے۔ ہر چیز جو آپ دیکھتے ہیں، وہ آپ کی سوچ سے فلٹر ہو کر دماغ تک پہنچتی اور ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔

سوچ کے انتخاب میں آپ آزاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کامیابی کی بلند و بالا عمارت کھڑی کرتا تو دوسرا ناکامی کی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ لوگوں کے مختلف انداز نظر کی وجہ سے ان کے تجربات، توقعات اور بالآخر ثمرات بھی مختلف ہیں۔ آپ دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس کا نظارہ کرنے والی عینک تبدیل کر لیجیے.....دنیا آپ کو آپ کی پسند کے مطابق ہی نظر آئے گی۔

سوچ اور ادراک محض خواب و خیال نہیں بلکہ حقیقت کا وہ ذائقہ ہے جو آپ کو پسند ہے۔ اپنی پسندیدہ دنیا چنیے اور پھر موجودہ دنیا کو اس کے مطابق ڈھال لیجیے۔ کامیابی کے زینے پر تگ و دو کرنے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں، ذہنی طور پر

پسماندہ اور خستہ حال لوگوں کو کامیابی کم ہی ملتی ہے۔ آپ بادلِ نخواستہ کسی پارٹی میں جانے پر مجبور ہوں تو سر درد یا خراب موسم کا بہانہ ڈھونڈیں گے۔ لیکن پسندیدہ لوگوں سے ملاقات کے لیے آپ بے تاب ہوں گے، دوران سفر بھی پرجوش اور خوش رہیں گے کیونکہ آپ دل سے وہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔ ٹریفک جام، سرخ بتیاں، سڑکوں پر تعمیر کا کام، طوفان اور آندھی بھی آپ کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ جب آپ ہمت سے چیلنج قبول کریں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی سمت درست ہے۔ لیکن اگر آپ شکایات، مایوسی، رونا دھونا اور الزام تراشی کرتے ہیں تو یقین کر لیجیے، آپ غلط راستے پر ہیں۔ آپ کا رویہ بتائے گا کہ آپ واقعی اس منزل کے راہی ہیں یا نہیں۔

کسی بھی کامیابی کے لیے سچی لگن چاہیے۔ اگر آپ کی نظریں ایسے مقصد پر ہیں جس کی طرف آپ بڑھنا ہی نہیں چاہتے تو نہ صرف آپ اس تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ سفر بھی آپ کے لیے عذاب بن جائے گا۔ لیکن اگر منزل تک پہنچنا جنون اور لگن ہے تو حصولِ منزل کے علاوہ سفر بھی آپ کے لیے حسین یادوں کا خزانہ بن جائے گا۔

یاد کیجیے، وہ کون سا وقت تھا جب آپ مکمل طور پر زندہ تھے؟ کب آخری بار آپ کے دماغ، جسم اور روح نے بھرپور انداز میں دنیا کا سامنا کیا، اسے چھو کر دیکھا، محسوس کیا، خوشبو سونگھی، اس میں رہے، اس کو جانا اور اس میں کود پڑے۔ زندگی کے سمندر میں اپنے پاؤں بھگوئیے اور پورے جسم کو یادگار تجربے کے طور پر گزاریے۔

اگر آپ واقعی کامیابی چاہتے ہیں تو آج ہی عہد کیجیے کہ آپ بہترین سے کم پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ یہ کتنا شاندار خیال ہے کہ آپ ایک دم خود کو زبردست محسوس کرنا شروع کر دیں۔ آپ کے پاس ایسا کرنے کی بہت سی وجوہ ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ آپ کو بہت سی دلیلیں دیں اور وہ درست بھی ہوں۔ تاہم ان میں سے کوئی آپ کی راہ میں دیوار نہیں بننی چاہیے۔ کوئی بھی چیز آپ کو اپنے اور دنیا کے بارے میں زبردست خیالات سوچنے سے روک نہیں سکتی۔

اسی طرح جیسے ایڈیسن کو 9999 ناکامیاں بلب بنانے میں کامیابی سے نہ روک سکیں۔ جب اس سے کسی دوست نے کہا کہ ”بس کرو پیارے! بہت ہو گئی۔ یہ بلب بنانا تمھارے بس کا کام نہیں۔ 9999 ناکامیاں، خدا کی پناہ! اب باز آ جاؤ۔“

ایڈیسن نے تب مسکراتے ہوئے کہا ”میں ناکام کہاں ہوا ہوں؟ میں نے تو 9999 نئے طریقے ایجاد کر لیے جن سے بلب نہیں بن سکتا۔“

ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ اب تک آپ کی زندگی میں آنے والی تمام مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں ماضی میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئیں۔ آپ کی کامیابی کے سفر میں رکاوٹ بننے والی تمام وجوہ، سوچیں اور بیکار خیالات غائب ہو گئے۔ اسی حالت میں خود کو طاقتور محسوس کرنا ممکن ہے اور آسان بھی۔

اپنی زندگی رنگوں سے بھرنا اور ہر طرح کے حالات میں زندہ رہ کر کچھ کرنا آپ کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ مضبوط محسوس کرنے کے لیے آپ کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو بس یہ جان لینا ہے کہ آپ کر سکتے ہیں۔ جب آپ نعمتوں کو قبول کر لیتے اور ان کا شکر بجا لاتے ہیں تو سارے دکھ، پریشانیاں، ناامیدیاں، ناکامیاں دم دبا کر بھاگ جاتی ہیں۔ اور اس سے بڑی شکر کی بات کیا ہو گی کہ آپ زندہ ہیں۔ مطلب یہ کہ خدا آپ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ آپ زمین کے اوپر ہیں، نیچے نہیں، اس سے بڑی خوشخبری اور کیا ہو گی؟

اس لمحے کو غنیمت جانیے، کچھ کر گزریے۔ میرے ایک اور پسندیدہ مینجمنٹ گرو، میاں محمد بخش کہتے ہیں:

لکھ ہزار بہار حسن دی خاک دے وچ سمانی
پریت اجہی لا محمد، جگ تے رہے کہانی

آپ اپنے پیچھے کامیابی کی کون سی لازوال کہانی چھوڑ کے جائیں گے؟

جو دل سے خواب دیکھنے کی جرأت کرے، تعبیریں اس کے قدم ضرور چومتی ہیں۔ جب آپ کامیابی کی توقع کرتے ہوئے اپنے خواب کی طرف بڑھتے ہیں تو پھر کامیابی پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کا سواگت کرتی ہے۔

مجھ سے ایک بار تربیتی پروگرام میں ایک خاتون نے پوچھا "آپ کی بات بجا کہ چلیے کہ زندگی منفی رویوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میں اس بات کو سمجھتی ہوں لیکن اس کے باوجود خوشگواریت کو ہوا دینے والے رویوں سے جان کیوں نہیں چھڑا پاتی؟"

"کیونکہ آپ حقیقتاً ایسا نہیں کرتیں کہ جان لیوا رویے کس طرح آپ کا خون چاٹ رہے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح آپ خود ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں اور ان کے ہونے کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ کسی بھی شخص کے لیے یہ جاننا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کر رہا ہے، بظاہر مشکل مگر زندگی ساز کام ہے!" میں نے تحمل سے جواب دیا۔

وہ خاتون دوبارہ الجھن زدہ لہجے میں بولیں "میرے لیے اپنے رویوں کو تبدیل کرنا اتنا مشکل کیوں ہے؟"

"کیونکہ آپ نے انھیں اپنی شناخت کا حصہ بنا لیا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ وہی ہیں جو آپ کرتی ہیں، کہتی یا سوچتی ہیں۔ آپ نے یہ یقین کر لیا ہے کہ ان رویوں کی عدم موجودگی میں آپ کی ذات کو کوئی شناخت نہیں مل سکتی۔ آپ کی ذات کھوکھلی، خالی اور بے نام رہ جائے گی۔ لیکن یہی وہ قدم ہے جو آپ کو اٹھانا ہے۔ اپنے غلط اور منفی رویوں کا متبادل ڈھونڈے بغیر آپ کو فوراً ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ یہ خالی پن شروع میں آپ کو تکلیف دہ محسوس ہوگا لیکن اس کا جرأت سے سامنا کیجیے۔ تب یہ خالی پن خود بخود سچ کے ساتھ بھر جائے گا۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے گدلے پانی سے بھری کسی جھیل کو تازہ، پاکیزہ اور صحت بخش پانیوں سے بھرنے کے لیے پہلے سارا گندہ پانی باہر پھینکنا ضروری ہے۔ خود ترسی اور بے جا غصے کے منفی رویوں کو آج ہی زندگی سے نکال باہر پھینکنے کی جرأت کیجیے۔

اپنے اندر منفی رویوں اور احساسات کی موجودگی سے باخبر ہو کر پریشان نہ ہوئیے۔ بس انھیں اسی طرح دیکھیے جیسے وہ ہیں۔ یاد رکھیے وہ آپ کی اپنی ذات کا عکس نہیں بلکہ محض دوسروں سے ادھار مانگے ہوئے ہیں جنھیں با آسانی اصل مالکوں کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ بہت کوشش اور مشقت کے باوجود ان کی زندگی پہلے کی نسبت زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ کتابیں پڑھنے اور تربیتی پروگراموں میں شرکت کے باوجود زندگی کے معیار میں کوئی گراں قدر اضافہ نظر نہیں آتا۔ اپنے لوگوں سے میں کہا کرتا ہوں "لفٹ میں سوار ہونے کے بعد محض اس کے مختلف کونوں میں جگہ تبدیل کرنے سے اوپر جانے کا عمل شروع نہیں ہوگا۔ یہ یقین ضرور حاصل کر لیجیے کہ آپ 'اوپر' جانے کے لیے کامیابی کے اصلی اصولوں مثلاً ایمانداری اور خلوص نیت کا صحیح استعمال کر رہے ہیں۔ صرف اسی صورت میں اوپر کی طرف پیش رفت کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر ہم نفسیات کے حوالے سے فرد کی اندرونی دنیا کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ اس اندر کی دنیا میں امیر شخص امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔" جب ایک بار میں نے یہ بات اپنے ایک لیکچر میں کہی تو ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ نفسیاتی دنیا میں زیادہ باخبر شخص زیادہ صاحب کمال ہوتا جاتا ہے اور کم باخبر انسان جو کچھ پہلے سے موجود ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے؟"

"کیونکہ زندگی جامد نہیں" میں نے جواباً کہا تھا "زندگی میں آپ یا تو ترقی کرتے ہیں یا تنزلی کا شکار ہو جاتے ہیں، کوئی درمیانی راہ موجود نہیں۔ اب آپ کون سی راہ اختیار کرتے ہیں، یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ممکن ہے:

تصور کیجیے کہ ایک لق و دق صحرا کے درمیان ایسا مقام ہے

جہاں سرسبز و شاداب درخت، سکون، سایہ اور ٹھنڈا پانی دستیاب ہے۔ اس مقام سے قریباً ایک میل دور ابتے ہوئے گرم صحرا میں ایک شخص گم ہو چکا۔ اس بھٹکتے شخص کی نظر دور سے اس مقام پر پڑتی ہے۔ وہ اس سرسبز مقام کی شادابی اور صحرا کی وحشت ناکی میں آسانی سے فرق دیکھ سکتا ہے۔ اس مقام سے "قریب" ہونے کی وجہ سے جو کچھ اسے نظر آتا ہے، اسے مزید بڑھنے کا حوصلہ دینے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا وہ اس مقام کی طرف بڑھتا ہے۔ جوں جوں قریب آتا ہے، سکون اور اطمینان سے لبریز ایک دلکش دنیا اس کے لیے اپنے دروازے کھول دیتی ہے۔

لیکن اس "مقام جنت" سے تین میل کے فاصلے پر موجود ایک بھٹکتے شخص کا تصور بھی کر کے دیکھیے چونکہ وہ اس زندگی بخش مقام سے زیادہ دور ہے۔ لہٰذا آدمی کے لیے مقام کو دیکھنے، اس کی جانب کشش محسوس کرنے اور اس کی سمت سفر شروع کرنے کا بہت کم امکان ہے۔ نتیجتاً وہ غلط سمت قدم اٹھا بیٹھتا ہے۔ اس کا ہر قدم اسے سکون و اطمینان کی دنیا سے دور تر کر دیتا ہے۔ وہ اس سرسبز و شاداب مقام کے وجود سے بے خبر ہے لہٰذا صحرا میں اور زیادہ بھٹکتا چلا جاتا ہے۔ دکھ اور مایوسی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس حالت میں وہ پانی اور سبزے کے سراب کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ یہ فریب نظر اس کی زندگی کے سفر کو رائیگانی کی طرف لے جاتا ہے ایک کے بعد دوسرا سراب اس کا مقدر بنتا چلا جاتا ہے۔

"تو اصل نقطہ یہ ہے" میں نے نتیجہ خیز لہجے میں کہا "جوں جوں ہم کامیابی کے قریب آئیں ہماری نظر میں کامیابی کی قدر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چونکہ ہمیں اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے، لہٰذا ہم اس کے زیادہ قریب آتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امیر امیر تر ہو جاتا ہے کیونکہ اس "امارت" تک وہ خود اپنی ذاتی کمائی سے پہنچا ہے۔"

کوئی بھی بھٹکا شخص کسی بھی لمحے اپنی سمت تبدیل کرنے کی جرأت، صلاحیت اور استطاعت رکھتا ہے۔ کسی بھی شخص کو بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی عورت یا مرد صحیح قدم اٹھاتے اٹھاتے بالآخر زندگی کے وحشت ناک صحرا سے نکل کر سکون، شادمانی اور کامیابی کی سرسبز و شاداب سرزمین کا ٹکٹ حاصل کر سکتا ہے۔ اس ساری گفتگو میں سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ سکون، شادمانی اور کامیابی سے لبریز یہ سرسبز و شاداب دنیا حقیقت میں وجود رکھتی ہے اور کسی بھی شخص کے لیے یہاں تک پہنچنا حقیقی طور پر ممکن ہے۔ میں کئی سال اس سرزمین سے دور، ناکامی کی وحشت ناکیوں میں بھٹکنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔ مجھے حیرت ہے، اگر مجھ جیسا انسان بھی یہاں پہنچ سکتا ہے تو کسی کو بھی یہاں آنے میں مشکل پیش نہیں آنی چاہیے۔ میری زندگی کا مقصد کامیابی کے اس لامحدود نخلستان میں ہر کسی کو بلانا ہے اور اگر آپ یہاں آنا چاہتے ہیں تو "شاباش تم کر سکتے ہو۔"

(یہ تحریر مصنف کی کتاب "شاباش تم کر سکتے ہو" سے بصد شکریہ لی گئی۔ یہ کتاب مایوس مرد و زن کو ہمت دیتی اور انھیں مشکلات سے نبرد آزما ہونا سکھاتی ہے۔)

☆ جب تک ہر شخص اپنے فریضہ کو ادا کرنے کا عزم نہ کرے قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

☆ بزدل بار بار مرتے ہیں اور بہادر کو ایک بار موت آتی ہے۔

☆ آزادی کی حفاظت قوانین نہیں جذبہ عمل و ایثار کے ذریعے ہوتی ہے۔

☆ انسانی روح آزادی رائے کے لیے بے چین رہتی ہے اور مساوی فوائد بھی کبھی آزادی کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

☆ اصولوں پر کبھی مفاہمت نہ کریں۔ جن لوگوں نے عظمت اور بڑائی حاصل کی، انہوں نے اصولوں پر سختی سے عمل کیا اپنے مقصد کے لیے سب کچھ نچھاور کر دیا۔ دنیا کا کوئی لالچ اور ترغیب ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔

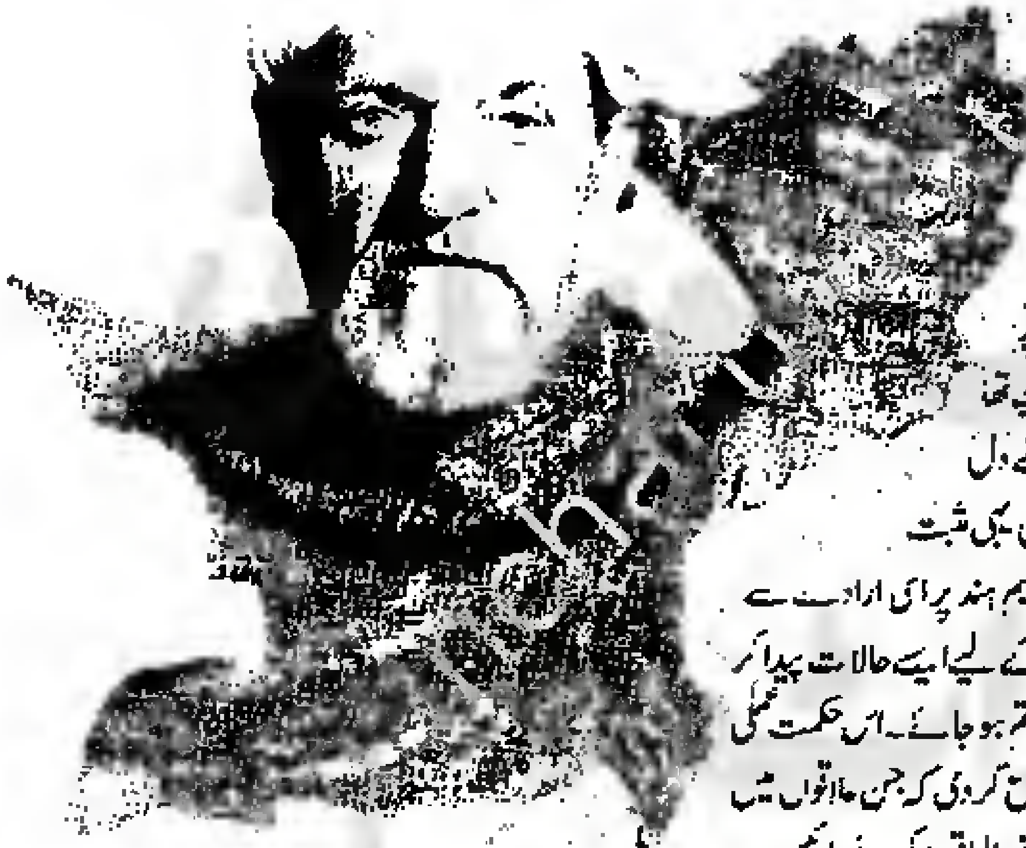
(مادرِ ملت فاطمہ جناح)

قوم کے بلوچ ہیرو

نواب محمد خان جوگیزئی

جنھوں نے بلوچستان کو پاکستان کا حصہ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا

سید صلاح الدین اسلم



۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ اور کانگریس میں تقسیم ہند کے فارمولے پر سمجھوتہ ہو گیا۔ تب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس طرح مسلم لیگ نے کھلے دل سے اسے تسلیم کر لیا تھا، کانگریس بھی یہی مثبت قدم اٹھاتی۔ لیکن حقیقتاً ہندوؤں نے تقسیم ہند پر ارادے سے رضامندی ظاہر کی تھی کہ پاکستان کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیں، وہ معرض وجود میں آتے ہی ختم ہو جائے۔ اس حکمت عملی کے تحت کانگریس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ جن علاقوں میں ریفرنڈم ہونا ہے، وہ پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کرنے پائیں۔

بلوچستان میں بھی کانگریس نے اپنے کارندوں کے ذریعے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے لیکن خوش قسمتی سے یہاں ایک ایسی باأثر اور پُرخلوص شخصیت موجود تھی جس کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا۔ اور وہ تھے جناب نواب محمد خاں جوگیزئی۔ انھیں جب کانگریس اور ہندوؤں کی سازش کا پتا چلا، تو انھوں نے بلوچستان میں شاہی جرگے کا اجلاس مقررہ تاریخ سے پہلے ہی بلا لیا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ صوبہ پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتا ہے۔

نواب محمد خاں جوگیزئی کے صاحبزادے، نواب زادہ جہانگیر جوگیزئی نے ایک بار مجھے بتایا ''وائسرائے ہند نے اعلان کیا کہ تین جولائی ۱۹۴۷ء کو ریفرنڈم کے لیے ووٹ ڈالے جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد ہم لوگ ۲۸ جون کو نواب صاحب کے پاس گئے۔ ان کو بتایا کہ کانگریس دو جولائی کو ایک بڑی رقم ایک صاحب کے ذریعے بلوچستان بھیج رہی ہے تاکہ

یہاں چند سرداروں کو خرید کر انھیں پاکستان کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ کیا جا سکے۔ اگر یہ رقم آ گئی، تو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ لالچ میں آ کر کانگریس کی سازش کا شکار ہو جائیں۔ آپ کل ہی یہ اعلان کر دیجیے کہ ہم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

''یہ سن کر نواب صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ میں کل ہی شاہی جرگہ بلا لیتا ہوں۔ اس وقت وہاں نوشکی اور نصیر آباد کے سردار موجود تھے۔ وہ کہنے لگے، ہم نے تو خان آف قلات کو لکھ کر دیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ ہیں۔

''نواب محمد خان جوگیزئی نے ان کو سمجھایا کہ یہ خان قلات نہیں بلوچستان کے مستقبل کی بات ہے۔ ہم سب کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ نواب صاحب کی تقریر کا سب پر بہت اچھا اثر ہوا۔ چناں چہ جب صبح اٹ صاحب آئے، تو نواب صاحب نے ان کو بتایا ''ہم نے فیصلہ کر لیا ہے ہم پاکستان کے ساتھ ہیں۔''

''جب ریفرنڈم ہوا، تو اس میں یہی متفقہ فیصلہ کیا گیا۔ اس میں نصیر آباد اور نوشکی کے سرداروں کے علاوہ قبیلہ مری اور بگٹی کے سربراہ بھی شامل تھے۔ نواب جہاں خان، سردار دودا خان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ نواب اکبر بگٹی کے والد تو نواب محمد خان جوگیزئی کے بچپن کے دوست تھے۔ جب ووٹنگ ہو رہی تھی، تو ہم سب نتیجے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ نسیم تجازی بھاگتے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے آئے اور بتایا کہ بلوچستان پاکستان میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ خوشیاں منانے لگے۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔''

بلوچستان میں مسلم لیگ کے قیام کی بابت صاحبزادہ جہانگیر جوگیزئی نے بتایا کہ ۱۹۳۹ء میں ایک دن قاضی عیسیٰ، مولانا ظفر علی خان اور عبدالرحمن صاحب، نواب محمد خان جوگیزئی کے پاس آئے اور بتایا کہ ہم لوگ مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے۔ محمد علی جناح اس کے لیڈر ہیں۔ اب جلد ہی ایک جلسہ ہونے والا ہے تاکہ بلوچستان میں بھی مسلم لیگ قائم کی جا سکے۔ انھوں نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھی جلسے میں شرکت کریں۔

''نواب صاحب نے جلسے میں شرکت پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جب یہ خبر پھیلی، تو کانگریس والوں نے یہ شوشا چھوڑا، یا

بلوچستان کے دلیر سپوت

تحریک پاکستان کے ممتاز راہنما، نواب محمد خان جوگیزئی ۱۸۸۴ء کے قریب ژوب میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی، تو اسے مقبول بنانے میں اہم حصہ لیا۔ یوں صوبے میں پاکستان کے حق میں نعرے بلند ہونے لگے۔

۱۹۴۶ء کے تاریخی انتخابات میں کانگریسی امیدوار، میر عبدالصمد خان اچکزئی کو شکست دی اور بلوچستان سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جون ۱۹۴۷ء میں کوئٹہ میں شاہی جرگے کا اجلاس ہوا۔ اس میں بلوچ سرداروں نے فیصلہ کرنا تھا کہ بلوچستان پاکستان میں شامل ہو جائے یا آزاد مملکت کا روپ دھارے۔ اس جرگے میں پاکستان کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے نواب محمد خان جوگیزئی نے بنیادی کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد آپ پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن بن گئے۔ تاہم بعد میں نواب صاحب نے خود کو صوبائی سیاست تک محدود کر لیا۔ زندگی کے آخری برس عزلت نشینی میں گزارے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو وفات پائی۔

کہ مسلم لیگ ایک نیا مذہب ہے اور اسی کا جلسہ ہونے والا ہے۔ مدعا یہی تھا کہ قبائلی راہنما مسلم لیگ کے جلسے میں شرکت نہ کر سکیں۔ ایسا ہی ہوا، نواب صاحب نے جلسے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کر دیا اور میرے بھائی کو کچھ لوگوں کے ساتھ جلسے میں بھیجا کہ وہ یہ معلوم کریں، حقیقت کیا ہے؟ جس دن جلسہ ہونے والا تھا تمام سردار ایک جگہ بیٹھے نواب صاحب کا انتظار کرنے لگے۔

''نواب کرم خاں کانسی نے کہا، ہم نواب صاحب کے بغیر جلسے میں نہیں جائیں گے۔ بہر حال ایک سردار نے کہا کہ میں انھیں سمجھا کر لاتا ہوں۔ یہ کسی نئے مذہب کی بات نہیں بلکہ کانگریس نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا ہے۔ وہ سردار گئے اور نواب صاحب کو سمجھا بجھا لے آئے۔ اس طرح ۱۹۳۹ء میں جو جلسہ ہوا، تو اسی میں بلوچستان مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔''

جہانگیر جوگیزئی بتاتے ہیں ''میں نے بی اے تعلیم کے بعد باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۵ء میں چمن میں مجھے اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا۔ میں نے ہی نواب محمد خاں جوگیزئی کو ۱۹۴۵ء کا الیکشن لڑنے کے لیے تیار کیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ الیکشن لڑیں، تو انھوں نے کہا، بیٹا میں اسمبلی میں کیا کروں گا؟ میں تو اردو بھی صاف نہیں بول سکتا پھر وہاں تو انگریزی بولی جاتی ہے۔

میں نے انھیں بتایا کہ اگر آپ الیکشن نہیں لڑیں گے، تو کانگریس کا امیدوار صمد خاں اچکزئی جیت جائے گا کیونکہ قاضی عیسیٰ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر کانگریس جیت گئی، تو ہمیں پہاڑوں پر چڑھنا پڑے گا۔ نواب صاحب نے کہا، ہاں تمھاری یہ بات ٹھیک ہے۔ جعفر خاں جمالی بھی یہی کہہ رہے تھے۔

انتخابات کے زمانے ہی میں نواب صاحب قائداعظم سے ملاقات کرنے گئے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے جناح صاحب سے کہا ''نواب صاحب پہاڑی آدمی ہیں۔ کانگریس پر چڑھ دے گی، تو وہ بیٹھ جائیں گے۔''

قائداعظم نے کہا ''میں نے پانچ منٹ نواب صاحب کی آنکھوں میں دیکھا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے لوث آدمی ہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔''

جب نواب محمد خاں جوگیزئی الیکشن جیتنے کے بعد دوبارہ قائداعظم سے ملنے گئے، اس وقت سردار نشتر بھی موجود تھے۔ قائداعظم نے نشتر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا ''میں نے کہا تھا نا کہ نواب صاحب نہیں بیٹھیں گے۔''

ایک مرحلے پر پنڈت نہرو نے انھیں ملاقات کے لیے بلوایا۔ اس سے پہلے جعفر خاں جمالی کو کانگریس نے معاملہ طے کرانے کے لیے پانچ لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ خان قلات نے انھیں کہا، نواب صاحب نہرو سے ملنے میں کیا حرج ہے؟ نواب محمد خاں جوگیزئی نے جواب دیا کہ جب مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا ہی نہیں ہے، تو پھر میں ان سے کیوں ملوں؟

قائداعظم نے بھی ایک روز نواب صاحب سے پوچھا ''آپ کانگریس کے پرچے پر اسمبلی میں ان کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھے؟''

نواب محمد خاں جوگیزئی نے کہا ''اگر میں ایسا کرتا، تو لوگ کیا کہتے کہ نواب شنگل خاں کا لڑکا ہندوؤں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ یہ میری غیرت نے گوارہ نہ کیا۔''

پاکستان کے ساتھ بلوچستان کے الحاق میں نواب محمد خاں جوگیزئی نے جو تاریخی کردار ادا کیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے ایک ایسے وقت میں جرأت، دانش مندی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا جب بلوچستان کے ایک بہت بڑے سردار قائداعظم سے ذاتی دوستی کے باوجود بھارت کے ساتھ الحاق کی طرف مائل تھے۔ نیز کانگریس ہر قیمت پر بلوچستان کو پاکستان سے الگ رکھنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی۔

◆◆◆

ماورائے عقل دنیا کی سوغات

پُراسرار غار کا راز

چھٹی حس کے مالک دو دوستوں کا تحیر خیز قصہ‘
انھیں ایک سفر میں حیرت افزا واقعات سے پالا پڑ گیا

احسان دانش

اللہ تو لامثل ہے ہی لیکن حضرت انسان بھی کچھ کم شے نہیں۔ بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ عقل انھیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن کیا کریں، مشاہدات ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی نوع کا ایک واقعہ سنیے۔

ایک روز مجھے اچانک حد سے زیادہ بے چینی کا احساس ہوا۔ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ گزشتہ رات گہری نیند سویا اور صبح ہشاش بشاش بیدار ہوا تھا۔ کافی دیر بلاوجہ کی بے چینی میں مبتلا رہنے کے بعد میرے دل میں اپنے دیرینہ دوست، حکیم نیئر واسطی سے ملاقات کا خیال پیدا ہوا۔

نیئر واسطی بڑی خوبیوں کا مالک اور بڑا پیار انسان تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا رکھی تھی جس کا ایک زمانہ معترف ہے اور رہے گا۔ شفا کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے محبت کرنے والا گداز بھرا دل بھی عطا کیا تھا۔ وہ ایک ایسا



انسان تھا جو غیر کے دکھ کو اپنا دکھ تصور کرتا۔ یہ بات قابلِ راز نہیں رہی کہ موصوف مستحق مریضوں کا علاج اپنی جیب سے کیا کرتے تھے۔ اس پریشانی میں صرف نیرّ واسطی سے ملاقات کا خیال دل میں کیوں پیدا ہوا، اس کی کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس دل اس سے ملاقات کو مچلنے لگا۔

جب میں اس کے مطب پہنچا، تو حسب توقع وہ روگی انسانوں کے دکھ دور کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اتفاق کی بات کہ اس روز مطب میں جتنے مریض تھے، ان میں اکثر اہلِ ثروت اور صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔

"حکیم صاحب آج تو پانچوں گھی میں ہیں۔" میں نے ہلکی سی چوٹ کی۔

"اور سر کڑاہی میں ہونا کوئی خوش گوار بات تو نہیں۔" نیرّ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اس وقت میرا دوست ایک ٹھیکے دار صاحب کا معائنہ کر رہا تھا جو مرضِ وہم میں مبتلا تھا۔ میں علیک سلیک کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ ایک غریب بوڑھی خاتون مطب میں داخل ہوئی۔ اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو میرے دل میں کھٹکنے لگی۔ خاتون کی ظاہری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے انسانی لباس کے نام پر تہمت تھے۔ پہلے تو اس نے سہمی نظروں سے صاحبِ حیثیت لوگوں کو دیکھا پھر ہمت کر کے حکیم صاحب کے قریب آ گئی۔ وہ یوں چپ چاپ کھڑی تھی جیسے کوئی حقیر فریادی انصاف پسند مگر صاحبِ جلال حکمران کے دربار میں کھڑا ہو اور حرفِ مدعا زبان پر نہ لا سکے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"خاتون اس کرسی پر اطمینان سے بیٹھ جائیں۔" نیرّ واسطی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اس مریض سے فارغ ہو کر میں پوری توجہ سے آپ کی بات سنتا ہوں۔" ٹھیکے دار کو حکیم کی بات ناگوار گزری۔ لیکن نیرّ ان باتوں کی پروا نہیں

لاہور کے ممتاز حکیم

شاعر، صوفی اور طبیب، حکیم نیرّ واسطی ۱۹۰۱ء میں نہٹور (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ سید خاندان سے تعلق تھا۔ ۱۹۲۵ء میں طبیہ کالج، دہلی میں داخلہ لیا اور طب کی تعلیم پائی۔ پھر لاہور چلے اور بقیہ زندگی اسی شہر میں گزری۔ علامہ اقبال کے قریب دوست تھے۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت پاکستان نے طب کے میدان میں خدمات انجام دینے پر انھیں "ستارہ خدمت" عطا کیا۔ مئی ۱۹۸۲ء کو وفات پائی۔

کیا کرتا تھا۔ اس کا ہمدردانہ لب و لہجہ دیکھ کر بڑھیا کو حوصلہ ہوا اور اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "بیٹھنے والی بات نہیں ہے جی۔"

"آپ کھل کر بتائیں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟" میرے دوست نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"حکیم صاحب، آپ ..... میرا مطلب ہے میرے ساتھ چلیں، اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔" بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بیمار میں نہیں میری بیٹی ہے۔"

"کیا وہ یہاں نہیں آ سکتی؟" جس مریض کو نیرّ واسطی دیکھ رہا تھا، اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

بڑھیا کی آنکھوں میں بے بسی، بے چارگی، ناامیدی، غرض دکھوں کا میلا سا لگ گیا۔ وہ مریض کے تلخ لہجے سے خوف زدہ سی ہو گئی۔ پھر ایک بڑی عجیب بات ہوئی۔ نیرّ واسطی سامنے بیٹھے ہوئے مریض کو چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "چلیے خاتون کہاں چلنا ہے۔"

"یار تم آرام سے بیٹھو میں مریضہ کو دیکھ آؤں۔" میرے دوست نے معذرت خواہانہ انداز میں مجھ سے کہا میں چونکا۔ نیرّ واسطی کا مزاج شناس تھا لہٰذا برا منائے بغیر مسکرانے لگا۔

بلکہ میرے دل میں تجسس بھری کریدسی پیدا ہونے لگی۔

میں وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میری تشویش اضطراب میں بدلنے لگی۔ چند مریض جو صرف "وہم" میں مبتلا تھے، انتظاری صعوبت برداشت نہ کر سکے اور دوا لیے بغیر ہی اٹھ کر چلے گئے۔ جب میرا دوست واپس آیا، تو اس کی اپنی حالت مریضوں سے بدتر تھی۔ میں حیران سے زیادہ پریشان ہو گیا۔

"خیریت تو ہے نا؟" میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

"فارغ ہو کر اطمینان سے بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر نیئر واسطی نے منتظر مریضوں کو فارغ کیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا دوست شدید کرب میں مبتلا تھا۔ مریض رخصت ہوئے، تو میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ لیت ولعل سے کام لینے لگا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ کیوں کہ ہم بے تکلف دوست تھے اور اکثر ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ لیتے۔ میں مصر ہوا، تو وہ اپنے کرب کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کرب جس نے اس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی۔

"اصل میں نواب بیگم سے خاموش رہنے کا وعدہ کر بیٹھا ہوں۔" نیئر نے کہا۔

"یہ نواب بیگم کون ذات شریف ہیں؟" میں نے کرید جاری رکھی۔

"وہ مفلس خاتون جو مطب میں آئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کا تعلق ایک ریاست کے نواب خاندان سے ہے۔ اسی لیے میں نے اسے نواب بیگم کہا۔ اتفاق سے اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ ذکر، عہد خلافی ہو گی لہٰذا مجھے مجبور نہ کرنا۔ وہ مریضہ جسے میں دیکھنے گیا نواب زادی تھی۔"

"اسی لیے وہ مطب تک نہ آسکی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں..... مطب نہ آنے کی وجہ خاندانی تفاخر نہیں کچھ اور ہے۔" نیئر نے نواب زادی کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ اس کے پاس لباس نہیں تھا۔" نیئر نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"یہی تو نواب زادیوں کا المیہ ہے۔" میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ "ہر تقریب کے لیے مناسب لباس....."

"نہیں یار، ماں بیٹی کے پاس اپنی ستر پوشی کے لیے صرف ایک پھٹا پرانا جوڑا ہے۔ اب ظاہر ہے، کہ کپڑوں کا ایک جوڑا بیک وقت دونوں کا ستر کیسے ڈھانپ سکتا ہے؟"

یہ کہہ کر میرے دوست نیئر واسطی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بھی افسردہ ہو گیا..... حالات کا رونا میں بھی اکثر رویا کرتا تھا۔ لیکن تصویر کا یہ رخ بڑا ہی گھناؤنا تھا۔ مفلس نواب..... غیر معمولی شخصیت کا راز آشکارا ہو چکا تھا۔

"خاتون کے ساتھ جب میں اس کے ایک کمرے والے مکان پر پہنچا، تو اس کی حالت دیدنی تھی۔" نیئر نے سر جھکا کر سلسلہ کلام جاری رکھا۔ میں بھی اس سے نظریں ملانے سے کترانے لگا۔

"کمرے میں داخل ہوا، تو ننگے فرش پر نواب زادی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔" نیئر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ "اور اس نے اپنا بدن پرانے اخبار کے کاغذوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ نواب بیگم اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کر کے منہ پھیر کھڑی ہو گئی اور میں فرط غم اور مارے حیا کے زمین میں گڑے کا گڑا رہ گیا۔ میں لب مرگ مریض کو دیکھ کر کبھی نہیں گھبرایا۔ لیکن اس مریضہ کو دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ یہ تو ساری انسانیت کو کند چھری سے ذبح کرنے والی بات تھی۔ ہم انسانی عظمت کے نغمے اور مسجود ملائک کی بڑائی کے گیت گاتے ہیں مگر انسانی دکھوں کا علاج نہیں کرتے۔ اپنے پڑوس کی خبر گیری نہیں کر سکتے، احسان صاحب، خالق

کائنات ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"تم نے اس مریض کا علاج کیسے کیا؟" میں نے نیئر واسطی سے پوچھا۔

"نواب زادی ناتوانی کا شکار تھی، وہ کمزوری جو فاقہ کشی سے پیدا ہو، جان لیوا عذاب سے کم نہیں ہوتی۔" نیئر نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔ "میں مریضہ کی نبض دیکھے بغیر ہی بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ لہٰذا خاتون سے اجازت لے کر بازار گیا اور مناسب لباس اور خوراک کا انتظام کر کے لوٹا۔ ماں بیٹی کو تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ انھوں نے کھانا کب کھایا تھا۔"

"تو یہ تھی تمھارے دیر سے آنے کی وجہ؟" میں نے اپنے عظیم دوست کو ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو۔" نیئر نے کہا۔ "میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔"

شام ڈھلے ہم دونوں نواب بیگم کے "عیش محل" گئے۔ وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی تو جانوروں کے رہنے کے لائق بھی نہیں تھی۔ وہ بات جو میرے حکیم دوست کی نگاہوں سے اوجھل رہی یا شاید اس کا ذکر اس نے عمداً نہیں کیا، وہ نواب زادی کا حسن جہاں سوز تھا۔ اس حسن کو سراہنے کے لیے "شاعر" ہونا ضروری نہیں تھا۔ نواب زادی کا حسن تو کسی بدذوق بنیے کو بھی غزل سرائی پہ مجبور کر سکتا تھا۔

جب ہم نواب زادی کی عیادت سے واپس آئے، تو اداس تھے۔ نیئر کی حالت تو ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اسی اضطراب میں اس نے کہا۔ "چلو یار، اس شہر خرابی سے کہیں دور چلتے ہیں۔ یہ تو سنگ دل انسانوں کا ایک مہیب جنگل بن گیا ہے۔"

"جس بستی میں ہم گئے حالات کم و بیش اسی نوعیت کے ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "وسائل کی نامنصفانہ تقسیم سے ایسے مسائل تو ہر جگہ پیدا ہو چکے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جنگلوں یا بیابانوں میں جا بسیرا کریں، تو حالات شاید مختلف ہوں۔"

لیکن مجھے خود وحشت سی ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ہر شے چھوڑ چھاڑ کر کسی اجنبی مقام کی طرف کوچ کر جاؤں۔ پھر اچانک میرے ذہن کے پردے پر بلند و بالا پہاڑوں کا منظر ابھرنے لگا جیسے میں نے تصور کا کرشمہ خیال کیا۔ حیران کن بات یہ کہ مجھے سامنے والی سپاٹ سی دیوار پر پہلے برف پوش چوٹیاں دکھائی دیں، پھر ایک چشمہ ابلتا ہوا نظر آیا اور آخر میں ایک عجیب و غریب غار سا دکھائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ منظر اتنا واضح تھا کہ تصوراتی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو کوئی نادیدہ ہاتھ مجھے کسی خاص سمت کی جانب دھکیل رہا تھا۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" نیئر نے مخاطب کیا، تو دیوار کا منظر غائب ہو گیا۔

"تھوڑی دیر خاموش رہتے تو شاید میں تمھیں بتانے کے قابل ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"اچھا، اب خوابوں کی وادی سے باہر نکلو اور اٹھو سفر کی تیاری کریں۔"

"کہاں کے ارادے ہیں مولانا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم شاعروں کی ایک حس شاید فالتو ہوتی ہے جس کی مدد سے تم لوگ ان دیکھی جگہوں کی سیر کر سکتے ہو۔ مگر ہم سیدھے سادے انسانوں کو تو جسم کثیف کے ساتھ ہی سفر کی تکالیف برداشت کر کے ایک سے دوسرے جگہ جانا پڑتا ہے۔"

"حساس دل کو تحریک دینے کے لیے ہلکا سا اشارہ ہی کافی ہے اور پتھر دل کو زلزلہ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔" میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے، تو نیئر نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو احسان؟ اللہ کی قسم! بالکل یہی بات میں سوچ رہا تھا مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ عجیب بات ہے، سوچا میں نے اور اظہار تمھاری زبان سے ہوا۔"

"ہم تو اندر کا حال بھی جان لیتے ہیں۔" میں نے

حیرت کدہ......ایک عمدہ تحفہ



حیرت و اسرار میں ڈوبی زیرِ نظر تحریر ممتاز شاعر، احسان دانش (۱۹۱۴ء......۱۹۸۲ء) کی آپ بیتی "جہانِ دانش" سے ماخوذ ہے۔ تاہم اسے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "حیرت کدہ" سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔

"حیرت کدہ" علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے کراچی کے راشد اشرف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے کمال مہارت سے مختلف کتب و رسائل میں بکھرے مافوق الفطرت اور پُراسرار واقعات جمع کر دیے ہیں۔ یوں ماورائے عقل قصے پڑھنے کے شوقین خواتین و حضرات کے لیے ایک نادر قلمی خزانہ وجود میں آ گیا۔ اس کے ہر صفحے پر جہانِ حیرت پوشیدہ ہے۔

راشد اشرف بہ لحاظ پیشہ انجینئر ہیں، مگر علم و ادب سے عشق کرتے ہیں۔ خاص طور پر ماضی کے علمی و ادبی نوادرات کو گرد جھاڑ کر دوبارہ نمایاں کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ چناں چہ وہ نہ صرف قدیم علمی و ادبی تحریریں رسائل میں شائع کراتے بلکہ انھیں اسکین کرا کر دنیائے انٹرنیٹ پر بھی جاری کرتے ہیں۔ یوں وہ خاص طور پر نوجوان نسل کو اردو علم و ادب کے شائع شدہ سرمائے سے روشناس کرا رہے ہیں۔ یہ انوکھا اور محنت طلب کام انجام دینے پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

"حیرت کدہ" عمدہ کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ پیش کش معیاری ہے اور کتاب کی ضخامت دیکھتے ہوئے قیمت مناسب۔ یہ کتاب آپ اٹلانٹس پبلی کیشنز، ۳۶۔اے، ایسٹرن اسٹوڈیو کمپاؤنڈ، بی۔۱۶، سائٹ کراچی۔ فون نمبر: ۰۲۱-۳۲۵۸۱۷۲۰ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

مذاق کہا۔

"اچھا پیر صاحب، اب اٹھنے والی بات کریں۔" نیئر نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ میں کوشش کے باوجود اعتراض یا احتجاج نہ کر سکا بلکہ بلا سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم سفر پر تو چل نکلے مگر منزل سے ناآشنا تھے۔ اس کی کوئی متعین منزل ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم تو بس بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہتے تھے۔

جب ہم لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچے، تو راولپنڈی جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ خریدنے کا نہ وقت تھا نہ ہمیں اس کا خیال آیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ ٹکٹ ہم نے راستے میں بنوا لیے اور طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم راولپنڈی موجود تھے۔ ناشتا ہم نے ریلوے اسٹیشن ہی پر کیا۔ سورج طلوع ہوا، تو ہم ایبٹ آباد کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے صرف ایک بار دبی زبان سے کہا "یار یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟" نیئر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

ایبٹ آباد میں ہم نے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ میدانی علاقوں میں موسم خوش گوار تھا مگر وہاں ہمیں سردی محسوس ہونے لگی۔ ہم ویسے ہی منہ اٹھائے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے، گرم کپڑے تک ساتھ نہیں لائے۔

"اس سردی کا کیا علاج کیا جائے؟" نیئر نے کہا۔

"حکیم آپ ہیں اور علاج مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں۔"

"کوہ پیمائی کے متعلق کیا خیال ہے؟" نیئر نے عجیب و

غریب حل پیش کیا۔'' دشوار گزار راستوں پر آتیں چڑھیں گے، تو سردی خود بخود بھاگ جائے گی۔''

پہاڑ پر چڑھنے کا مجھے تو کوئی خاص تجربہ نہیں تھا مگر بلندی کے سفر میں لطف آنے لگا۔ اپنی سنک میں ہم جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ واپسی کا ہمیں خیال ہی نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی بھی آئی۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ یہ لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ماحول میں آخر کیوں رہ رہے ہیں؟ اس بستی میں ہم نے موٹی موٹی روٹیاں گڑ اور لسی کے ساتھ نوش جان فرمائیں۔ میں دل ہی دل میں مسبب الاسباب کی رزاقی پر اش اش کر اٹھا۔

سائے لمبے ہونے شروع ہوئے، تو اچانک ہمارے سامنے اس قدر دل کش منظر آ گیا کہ ہم دونوں بس مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔ پہاڑی زمین کا وہ ٹکڑا جنت کو شرما رہا تھا۔ لمبے لمبے درخت پورے جاہ و جلال سے نسبتاً ہموار جگہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جن کے نام تک سے میں ناواقف تھا۔ وسیع و عریض قطعات پر لاتعداد پھول جھاڑی نما سبز چادروں کی طرح بچھے تھے۔ وہ دل فریب منظر انسانی ہاتھوں کی صناعی کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا۔ دست قدرت کی کاریگری کا کمال یہ تھا کہ خوبصورتی کی تلاش میں نگاہوں کو ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسحور کر دینے والا حسن پلکوں پر فوراً دستک دینے کو بے قرار تھا۔ اتنا حسین منظر تو میں نے کسی تصویر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ قریب ہی ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ بے اختیار اسے پینے کو دل مچلنے لگا۔ ہم دونوں نے چلو بھر بھر کر اپنی پیاس بجھائی۔ اچانک نیئر واسطی ایک طرف جا کر اپنے کپڑے اتارنے لگا۔

''مولانا کیا ارادے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''احسان صاحب، اس پانی میں غسل نہ کرنا کفران نعمت ہے۔ مجھے تو یہ آب حیات دکھائی دیتا ہے۔ یہ سنہرا موقع ہے، پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔''

خود میرا دل بھی اس چشمے میں ڈبکی لگانے کو بے قرار ہو گیا۔ جب ہم نے پانی میں قدم رکھے، تو ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پانی کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا تھا۔ بہرکیف ہم کافی دیر تک پانی میں چھینٹیں کرتے رہے۔ جب باہر نکلے تو غلطی کا احساس پچھتاوے میں بدل چکا تھا۔ ہم بری طرح ٹھٹھر رہے تھے اور سردی ہماری ہڈیوں تک اترنے لگی تھی۔

''نیئر تمھارے ہونٹ تو بالکل نیلے پڑ رہے ہیں۔'' میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمھارا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں۔'' اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ ''اگر ہم نے اس سردی سے نجات حاصل نہ کی تو ناقابل تلافی نقصان کا امکان ہے۔''

ہم دونوں سگریٹ نوش نہ تھے لہٰذا ماچس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماچس ہوتی تو آگ جلا کر اپنا علاج کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا سر درد سے پھٹنے لگا اور کانوں میں مسلسل سائیں سائیں ہونے لگی۔ نیئر کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ قرب و جوار میں کسی انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے، ہمیں اپنی موت کا یقین ہو گیا لیکن ہم خاموشی سے موت کو گلے لگانے کے سخت خلاف تھے۔ لہٰذا بھرپور جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ ہم اس دل کش مرگ وادی سے فوراً نکل جانا چاہتے تھے۔ ہمارے سر چکرا رہے تھے۔ ہمیں تو یہ خبر تک نہ تھی کہ وہ کون سا علاقہ تھا۔ ہم تو بس بے مقصد گھومتے گھومتے جانے کہاں آ گئے تھے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوئی جب سورج غروب ہوا۔

سورج ڈوبتے دیکھ کر ہمارے دل بھی ڈوبنے لگے۔ سردی کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ گھٹاٹوپ اندھیرا بھی ہم پر حملہ آور ہونے کو تیار تھا۔ غروب آفتاب کا صرف ایک فائدہ ہوا کہ عارضی طور پر ہمیں مشرق و مغرب کا اندازہ ہو

گیا۔ خارشی اس لیے کہ ہماری سوچ برق رفتاری سے دھندلا رہی تھی۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا اور موت کو شکست دینی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے دشوار گزار راستے پر چلنے لگے۔ پہلے تو ہمارے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ وہ درد کا احساس مٹنے لگا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ ہماری قوت مدافعت کی آخری حد تھی۔

سردی کی شدت سے جب قوت مدافعت شکست کھا جائے، تو سردی خوش گوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ میرے نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "پہلے غنودگی طاری ہوتی پھر نیند کا غلبہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر ہماری آنکھیں بند ہو گئیں، تو پھر کبھی نہ کھل سکیں گی۔"

اچانک واسطی کو ٹھوکر لگی یا جانے کیا ہوا کہ وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے صرف اس کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ شاید وہ کسی گہرے کھڈ میں گر گیا تھا۔ میری ہمت جواب دے گئی اور میں گھپ اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سجھائی..... عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ آخر میں نے ہمت کر کے صرف ایک قدم اٹھایا اور میرا بھی وہی حشر ہوا جو میرے دوست کا ہوا تھا۔ اصل میں ہم دونوں کسی گہرے کھڈ کے کنارے پر جا پہنچے تھے۔ میں اس گہرے کھڈ میں گرا، تو گرتا ہی چلا گیا۔ پستی کا وہ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زبردست ہاتھ مجھے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ اللہ اللہ کر کے میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ چکیں اور واسطی کے ہاتھ پاؤں بھی سلامت نہیں ہوں گے۔

کافی دیر تک جب مجھے کچھ نہ ہوا، تو میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹول کر دیکھا۔ دفعتاً میرا ہاتھ کسی نرم شے سے

ای میل واپس لانے کا آپشن متعارف

اکثر لوگ جلد بازی میں یا پھر جذبات میں ای میل کے ذریعے کسی کا پیغام کسی کو بھیج دیتے ہیں جس کے بعد عموماً یہی سوچتے ہیں کہ کاش ایسا کوئی آپشن ہوتا جس کے ذریعے اس پیغام کو واپس لایا جا سکتا لیکن اب اس حوالے سے پریشان ہونے کا وقت ختم ہو گیا ہے کیونکہ جی میل نے "ان سینڈ" نامی بٹن کے نام سے ایسا فنکشن متعارف کرا دیا ہے جو آپ کو ایک مخصوص وقت میں ای میل واپس لینے کی مہلت فراہم کرے گا۔ جب آپ ای میل لکھنے کے بعد سینڈ کا بٹن دبا کر اس کے مطلوبہ شخص کی طرف روانہ کر دیں گے، تو آپ کی اسکرین کے بالکل اوپر ایک "ان سینڈ" کا بٹن جگمگاتا نظر آنا شروع ہو جائے جو آپ کو ای میل واپس لانے کے لیے ۱۰ سے ۳۰ سیکنڈز کا وقت دیتا ہے۔

ٹکرایا اور ساتھ ہی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی۔ "احسان! یہ تم ہو؟" یہ آواز میرے دوست کی تھی اور میں اس کے بالکل قریب گرا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ہم دونوں زندہ سلامت تھے۔ اس بات کی عقلی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ ہم ایک ہی جگہ سے یکساں انداز میں گرے تھے۔ لہٰذا ایک ہی جگہ یا قریب قریب آ کر رک گئے۔ اس کے علاوہ کھڈ میں اگی ہوئی جھاڑیوں نے ہمارا بوجھ برداشت کر کے ہمیں بچا لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ان دلائل کو رد کر دیا۔ وہ تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ تھا جس نے دھکا دے کر ہمیں راہ راست پر لا پھینکا تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ساری رات اندھیرے میں بھٹکتے رہتے، تو بھی اس جگہ نہ پہنچ پاتے جہاں ہم آ گرے تھے۔

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر اپنے اپنے

وجود کو حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے رہے مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ چاروں طرف دردناک چیخیں یوں گونج رہی تھیں جیسے ہماری وفات حسرت آیات پر ہزاروں چھل پیریاں مل کر بین کر رہی ہوں۔ اس خوف و دہشت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ سردی کا احساس قدرے کم ہو گیا۔ یہ طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گزر گیا۔ اچانک تھوڑے فاصلے پر مجھے ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔

"وہ سامنے کیا ہے؟" نیئر واسطی نے بمشکل سرگوشی کی۔

"شاید چراغ کی روشنی غار سے باہر نکل رہی ہے۔" میں نے مضبوطی سے امید کی کرن کو تھامتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد ہمیں خبر نہیں کہ کس طرح ہم گرتے پڑتے غار کے دہانے تک پہنچے.... اندر کا ماحول دیکھتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم نے موت کو شکست دے دی۔

غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور ہمارے سامنے آگ کا الاؤ دہک رہا تھا۔ اس سے غار کا اندرونی منظر بڑا خوشگوار لگا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ الاؤ کے قریب ایک گدڑی پوش درویش بیٹھا دہکتی آگ پر لکڑیاں رکھ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں آگ کے قریب بیٹھ جانے کو کہا۔ درویش کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے ہماری آمد کی توقع تھی۔

الاؤ کے قریب چٹائی پر بڑا خوبصورت مصلیٰ بچھا ہوا تھا جو گدڑی پوش کے لیے مسند کا کام دے رہا تھا۔ ہم آگ کے قریب قریب لیٹے، تو حیرت انگیز طور پر ہماری حالت بڑی تیزی سے سنبھلنے لگی۔ اس نیکی کے فرشتے نے کمال کر دکھایا۔

"جناب! گرما گرم چائے حاضر ہے نوش فرمائیں۔" درویش نے بڑے بڑے دو مگ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا.... ہم دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گرم چائے اس وقت ہماری اشد ضرورت تھی اور چائے بھی ایسی فرحت بخش اور لذیذ کہ پہلی چسکی لیتے ہی ہماری رگوں میں حیات آور خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جانے اس چائے میں درویش نے کیا ملا دیا تھا کہ مجھے اپنے جسم و جاں میں توانائی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ نیئر واسطی کے چہرے پر بھی رونق آ گئی۔

"کیوں جناب! کیسی ہے طبیعت؟" درویش نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا "بعض اوقات مسیحاؤں کو بھی مسیحائی کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔"

"آپ تو واقعی آنکھوں والے دکھائی دیتے ہیں۔" حکیم نیئر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"ہاں صاحب حساس دلوں کے لیے اشارہ اور وہ کیا کہتے ہیں پتھر دل انسان کے لیے تہ و بالا کر دینے والا زلزلہ.....!! صاحب واہ" اب فقیر کا روئے سخن میری جانب تھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ الفاظ میں نے آغاز سفر سے پہلے لاہور میں ادا کیے تھے اور سیکڑوں کوس دور پہاڑی غار میں بیٹھا رحمت کا فرشتہ میرے الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہ درویش تو قدم قدم پر ہمیں حیران کر رہا تھا۔ میری عقل اس کی وجہ بیان کرنے سے قاصر تھی.....

"فی الحال تو آپ حضرات آرام فرمائیں۔" گدڑی پوش نے بڑے رسان سے کہا "اندر ٹھیک ہو جانے کا تو باہر بھی خیریت دکھائی دینے لگے گی۔" اجازت ملتے ہی ہم پتھریلی زمین پر لمبے لیٹ ہو گئے اور ایسے بے سدھ ہو کر سوئے کہ صبح کی خبر لائے۔ اپنے دوست کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر ایسی میٹھی نیند کبھی نصیب نہ ہوئی تھی جو اس رات درویش کے غار میں پتھریلی زمین پر ہوئی۔

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ایک نئے تماشے کا آغاز ہو گیا۔ جسے ہم دشوار گزار اور ویران علاقہ قرار دے چکے تھے، اسی علاقے سے درویش کی زیارت کرنے والوں کی آمد شروع ہو گئی۔ کئی معتقد اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیا بھی لائے۔

درویش ان اشیا کو فوراً مہمانوں میں بانٹ دیتا اور پھر مسند کا کونا اٹھا کر نیچے سے ایک دونی نکالتا اور آنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیتا (اس دور میں دونی یعنی دو آنے اتنی حقیر رقم نہیں تھی، دونی کی آٹھ روٹیاں آیا کرتی تھیں۔ ایک آنے روٹی والا دور بہت بعد کا ہے) یہ دونیاں بانٹنے والا سلسلہ عصر تک جاری رہا۔ جانے درویش کے مصلّی میں دونیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع تھا جس نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔

دن بھر فقیر کے ڈیرے پر کھانے پینے کے علاوہ چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ ہم دونوں نے اب حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے کئی بار غار سے باہر جانے کی کوشش کی مگر ہر بار اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔ نیئر بھی بس پہلو بدل کر رہ جاتا اور میں نے تو اس مسحور کن ماحول سے اٹھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔

عصر کے بعد لوگوں کا آنا بند ہوا اور ماحول پر بوجھل بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ شام ڈھلنے سے ذرا پہلے درویش نے بڑے رسان سے کہا ''آپ ذرا باہر گھوم پھر آئیں، طبیعت بہل جائے گی۔ پھر اس نے سرسری لہجے میں کہا ''تو گرفتار پنچھیوں کا اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے ناجی۔''

ہم دونوں غار سے باہر نکلے، تو ڈر و خوف کا شائبہ تک ہمارے دلوں میں نہیں تھا۔ سارا علاقہ بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں وہ گہرا کھڈ بھی نظر آیا جس میں ہم دونوں گرے تھے۔ اس کا آغاز کافی بلندی سے ہو رہا تھا۔ اس بات کا فیصلہ کرنا بڑا دشوار تھا کہ کون سا راستہ ہماری طرف آ اور کون سا دور جا رہا ہے۔

''یار احسان! ہم کس گورکھ دھندے میں پھنس گئے اور یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' نیئر نے غار کے سحر سے آزاد ہوتے ہی کہا ''کیا خیال ہے گھر کو لوٹ چلیں؟''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' میں نے اپنے دوست کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں تو سہی پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔''

''یہ درویش صاحب بصیرت دکھائی دیتا ہے۔'' نیئر واسطی نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کئی ایک باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔'' آخر دل کی بات میرے ہونٹوں تک آ ہی گئی۔ ''مثلاً یہ دونیوں والا کیا چکر ہے؟''

اس رات ہم نے بے تکلفی سے ہر موضوع پر باتیں کیں۔ غار کے اندر درجہ حرارت معتدل تھا۔ درویش بھی موج میں آیا لگتا تھا۔ اچانک نیئر واسطی نے دونیوں والا ذکر چھیڑ دیا اور میں نے بھی درویش سے تعارف حاصل کرنے کی خاطر دو تین سوال داغ دیے۔ وہ تھوڑی دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر لب کشا ہوا:

''آج سے تیس برس پیشتر یہ راندہ درگاہ انسان اس علاقے میں خوف و دہشت کی علامت تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو میرا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ میں اس علاقے کی سیاہ راتوں کا بے تاج بادشاہ تھا، وہ بادشاہ جسے اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ میں کوئی تیسرے درجے کا اٹھائی گیرا نہیں بلکہ پہلے اعلان کر کے ظلم ڈھاتا تھا۔ جب یہ سراپا تقصیر انسان زمین کا ناقابل برداشت بوجھ بن گیا، تو رحمت باری تعالیٰ جوش میں آئی۔ میں ایسے حالات سے دوچار ہوا جو آپ حضرات کو پیش آئے ہیں۔ وہ رات بڑی ہی بھیانک تھی جب میں گرتا پڑتا اس غار میں پہنچا۔ میں اس جگہ جہاں اب میں بیٹھا ہوا ہوں، میری شکل و صورت کا ایک نیک دل درویش بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سنگ دل کو اپنے سایہ عافیت میں لے لیا۔ تین روز تک میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہا اور وہ نیک دل انسان میری خدمت کرتا رہا۔''

''آپ کے اور ہمارے حالات ایک جیسے تو نہ ہوسکے۔'' نیئر واسطی نے بے باک لہجے میں کہا۔ ''ہم تو چائے کی ایک پیالی سے سنبھل گئے تھے۔''

"آئینۂ دل ایک جیسا زنگ آلود تو نہیں ہوا کرتا۔" مسند نشین نے مسکرا کر کہا۔ "آپ حضرات تو پہلے ہی صیقل شدہ تھے۔ آپ کے ساتھ تو بس رسمی سی کارروائی ہوئی ہے۔"

"بہت خوب! اگر رسمی کارروائی تھی، تو آزمائش کسے کہتے ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"محترم! دعا کریں اللہ آپ کو آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔" مسند نشین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "حساس دل کے لیے اشارہ اور بے حس دل کے لیے تہ و بالا کر دینے والا زلزلہ۔ یہ بھی تو ذہن میں رکھیے۔"

یہ سنتے ہی نیر واسطی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ جو واسطی کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے، یہ درویش دوسری بار دہرا رہا تھا جس کی کوئی منطقی توجیہہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری اس روز کی بلاوجہ بے چینی، نیر سے ملاقات، نواب زادوں کا علاج اور ہمارا سفر سب کچھ ایک منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا؟ میری عقل اس سوال کا جواب دینے سے بھی قاصر تھی۔

"تیسرے روز جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں نے اس نیک دل انسان کو دونیاں تقسیم کرتے ہوئے دیکھا۔" مسند نشین نے آپ بیتی کا آغاز از سر نو کرتے ہوئے کہا۔ "میرے دل میں فاسد خیالات نے اودھم مچا دیا اور میں نے اس خزانے پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ شب تنہائی میں اس نیک دل انسان کو قتل کر کے خزانہ لے غار سے نکل جاؤں۔ میری توانائی بحال ہو چکی تھی، مگر میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں بہت کمزور ہوں۔ نیک دل انسان مسکرا کر میری خدمت کرتا رہا۔ شاید وہ پانچواں روز تھا۔ عصر کے بعد دونیاں وصول کرنے والے سب لوگ رخصت ہو گئے، تو نیک دل درویش نے بڑے پیار سے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اس مسند پر بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ یہی تو میرے دل کی خواہش تھی۔ میں نے فوراً اس جگہ پر قبضہ کر لیا۔ آج بیس برس ہو گئے ہیں، میں اس نیک دل انسان کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس جانے والے کا انتظار بھی نہیں۔"

یہ ناقابل یقین داستان سنانے کے بعد مسند نشین زیر لب مسکرانے لگا۔ میں اور نیر واسطی اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ ماحول پر مکمل سناٹا طاری تھا۔ مسند نشین کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ تھی۔

داستان کا یہ اختتام غیر متوقع اور چونکا دینے والا تھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ مثلاً دونیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ، ایک درویش کا دوسرے انسان کو اپنی جگہ بٹھا کر غائب ہو جانا اور مسند پر بیٹھتے ہی ایک سنگ دل ڈاکو کی کایا پلٹ جانا..... ہر بات خلاف عقل تھی مگر کایا پلٹ جانے والا انسان ہماری آنکھوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور وہ صاحب بصیرت و بصارت بن چکا تھا۔ میرا دل شکوک و شبہات کی آماج گاہ بن گیا۔ آخر حرف مدعا میری

انڈے کی سفیدی اور زردی کو علیحدہ کرنے کا انوکھا طریقہ

انڈے کی زردی کو بغیر توڑے سفیدی سے الگ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن اس نوجوان کے لیے یہ کام بالکل بھی مشکل نہیں جو پلک جھپکتے ہی ایک انوکھا طریقہ استعمال کرتے ہوئے مہارت سے یہ کام سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نوجوان نے ایک خالی بوتل کو الٹا کرتے ہوئے ہوا کا کچھ دباؤ بوتل سے باہر نکالا اور زردی کو اوپر لے جا کر جیسے ہی یہ دباؤ کم کیا تو زردی صرف ۳۰ سیکنڈ میں سفیدی سے الگ ہو کر بوتل میں گر گئی۔ مہارت تو دیکھیے کہ اس نوجوان کا بار بار یہ عمل کرنے پر بھی زردی ٹوٹ کر سفیدی میں حل نہیں ہوئی بلکہ ہر بار باآسانی بوتل میں داخل ہوتی رہی۔

زبان پر آ ہی گیا۔ ''دنیوں کا یہ کیسا ذخیرہ ہے جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا؟''

''عزیزم فضول باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔'' مسند نشین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''اپنے فرض سے مجھے فرصت ملے، تو میں ان باتوں کے متعلق غور کروں۔'' اچانک فقیر اپنی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرسری لہجے میں کہنے لگا۔ ''آج عرصے بعد تازہ ہوا میں گھومنے کو جی چاہتا ہے۔ ہوا کا نشہ بھی کتنا شدید ہوتا ہے۔'' پھر وہ میرے دوست سے مخاطب ہوا۔ ''حکیم صاحب! ناگوار خاطر نہ ہو، تو تھوڑی دیر کے لیے میری جگہ پر بیٹھ جائیں۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بات بالکل صاف تھی۔ میں چیخ چیخ کر اپنے دوست کو منع کرنا چاہتا تھا مگر میری زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔ ادھر نیئر واسطی تو جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ وہ جھپٹ اٹھ کر مسند پر جا بیٹھا۔ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ہونی ہو چکی۔ درویش نے حسرت بھری نگاہ گردوپیش پر ڈالی اور ٹہلتا ہوا غار سے نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب بھی واپس نہیں آئے گا۔

اب میں نے اپنے دوست کے چہرے کو غور سے دیکھا تو حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ مسند نشین ہوتے ہی نیئر واسطی کے چہرے سے جانے والے درویش کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ یہ سب کچھ میری ان گنہگار آنکھوں کے عین سامنے ہوا مگر میرا دل مان ہی نہیں رہا تھا۔ انسان کا دل واقعی بڑی عجیب شے ہے۔ کوئی اسے معمہ کہتا، کوئی دریا سمندر سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر میرے دل میں بڑی حقیری سی خواہش پیدا ہوئی، اتنی حقیر کہ مجھے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی۔ میں مصلّی کا وہ کونا دیکھنا چاہتا تھا جسے سرکا کر جانے والا درویش لوگوں میں دونیاں تقسیم کرتا تھا۔

''احسان صاحب! فضول خیالات سے پرہیز کریں۔'' میرے دیرینہ دوست کی سرزنش بھری آواز مجھے سنائی دی، تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ گویا وہ مسند پر بیٹھتے ہی حقیقی معنوں میں درویش بن گیا ایسا درویش جو میرے دماغ کے اندر جھانکنے کی قدرت رکھتا تھا۔ شاید میرا وہم تھا مگر اس کی آواز، لب ولہجہ، ہر شے بدلی بدلی سی تھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی آواز جانے والے درویش ہی کی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی اور یقیناً اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا رہا۔ آدھی رات ہوئی تو میری بے چینی کی انتہا ہو گئی۔ جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا۔ ادھر واسطی بڑے اطمینان سے مسند پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے وردو وظائف میں مشغول ہو۔ پھر اس نے بڑے نرم الفاظ میں مجھے سو جانے کی تلقین کی۔

''مگر...... یہ...... کیسے ممکن ہے؟'' میری بلند آواز غار میں گونجی۔

''کیا کیسے ممکن ہے عزیزم؟'' واسطی نے سکون سے پوچھا۔

''بس جناب بہت ہو گئی۔ اٹھ جائیے اس مسند سے اور نکلیے اس سحرزدہ ماحول سے۔'' میں کوشش کے باوجود بھی آپ جناب وغیرہ کے بغیر بات نہ کر سکا۔

''جلدی کا ہے کی ہے عزیزم۔'' درویشانہ انداز میں جواب دیا گیا۔ ''اوپر والے کی نگاہ کرم سے ہر شے ٹھیک ہو گئی۔ ابھی نیا سورج طلوع ہوگا۔''

اور آپ دونیاں بانٹنا شروع کر دیں گے۔'' میں اچانک پھٹ پڑا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا غار کے دہانے پر جا کھڑا ہوا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جانے والے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں افسردگی میں سر جھکا کر الاؤ کے قریب آیا اور سارا معاملہ نظرانداز کر کے آرام سے لیٹ گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں، مگر ان میں نیند نہیں تھی۔ وہی غار تھا، وہی پتھریلی زمین اور وہی دہکتے الاؤ کی سکون بخش حرارت۔ عمر گزری ہوئی اور آج کی

رات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہی فرق جو قرار اور بے قراری میں ہوتا ہے۔

میں نے آنکھیں نیم وا کر کے نئے مسند نشین کو دیکھا۔ میرے دل نے اعتراف کیا کہ واسطی کے چہرے پر اتنی رونق پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ رونق کس نوعیت کی تھی؟ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا! وہ فتح و کامرانی کا نشہ تھا یا اطمینان قلب کا اظہار یا شاید دونوں!! بہرحال جو کچھ بھی تھا، برا نہیں تھا۔ میرے اندر منفی اور مثبت کے مابین کشمکش سی ہونے لگی اور یہ رفتہ رفتہ شدت اختیار کر گئی۔

"یہ سراسر ظلم ہے۔" میری آواز غار میں گونجی۔ "حکیم نیز واسطی پہاڑ کے کسی گم نام غار میں دونیاں چونیاں تقسیم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ وہ کسی بڑے کام کے لیے پیدا ہوا ہے اور اپنا فریضہ بطریق احسن انجام دے رہا ہے۔ اس کی ضرورت بیماروں اور دکھ درد میں مبتلا انسانوں کو ہے۔ نواب بیگم اور نواب زادی جیسی خواتین کو ہے۔" مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ ایک بات البتہ یقینی تھی کہ ہر بات میرے دل سے نکل رہی تھی۔ اور دل سے نکلنے والی بات بے اثر نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح وہ رات میں نے غار میں ٹہلتے ٹہلتے گزار دی۔

سورج طلوع ہوا۔ اندھیری رات مانند آئینہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔ مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر بعد دونیاں وصول کرنے والے حضرات غار میں آنے لگیں۔ ان میں جانے والے کئی حقیقی معتقد بھی ضرور ہوں گے۔ جب وہ کسی غیر کو مسند پر تشریف فرما دیکھیں گے، تو پھر کیا ہوگا..... اس خیال نے مجھے بے کل کر رکھ دیا اور میں غار کے دہانے پر آ کر کھڑا ہو گیا..... اچانک میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔

ایک شخص دیوانہ وار پتھروں کو پھلانگتا ہوا غار کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ ذرا قریب آیا، تو میں نے اسے پہچان کر سکھ کا سانس لیا۔ جی ہاں! وہ ہمیں چائے پلانے والا غار کا پرانا مسند نشین درویش ہی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔ میرا دل کہتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا بلکہ ایسا ہونا چاہیے۔ اس یقین کی بھی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

"چلیے شاعر صاحب اندر چلیے۔ ایسا تو کبھی دیکھا نہ سنا، یعنی حد ہو گئی۔" درویش کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا اپنی مسند کی طرف بڑھا۔ نیز واسطی اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مسند فقیر کے لیے خالی کر دی۔

"حکیم صاحب! اس زحمت کے لیے یہ بندہ ناچیز معافی کا طلب گار ہے۔" درویش نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ حضرات فوراً تشریف لے جائیں۔ جگہ آپ کے لائق نہیں۔ خلق خدا کسی اور جگہ حکیم صاحب کی منتظر ہے اور یہاں بھی چند لوگ محو انتظار ہیں۔" پھر اس نے ناقابل فہم سی بات کی۔ "سودا نا منظور ہوا۔"

میں نے اپنے دوست کو کلائی سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا غار سے باہر لے گیا۔ حالات کے بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ درویش اپنا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔ ہم غار سے باہر نکلے، تو چند لوگ غار کی طرف آتے دکھائی دیے جو یقیناً زیارت کے لیے آ رہے تھے۔ گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ایک شخص ملا جو دو عدد خچروں کی لگامیں تھامے کھڑا تھا۔

"لیجیے جناب! غار نشین نے کمال مہربانی سے ہمارے لیے ٹیکسیوں کا انتظام بھی کر دیا۔" میں نے واسطی سے کہا۔

"یار! ایک تو تم لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہو۔" نیز واسطی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ان باتوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ یہ شخص تو روزی کمانے کے لیے یہاں کھڑا ہے۔"

میں نے مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور خچروں والے سے بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ وہ معمولی اجرت لے کر ہمیں ریسٹ ہاؤس تک پہنچا گیا۔ ہم لاہور پہنچے، تو نواب بیگم بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ نواب زادی کی حالت خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ دوسرے مریض بھی محو انتظار تھے۔

◆◆◆

دنیا کی مظلوم ترین قوم کا مسکن

”برما ہمارے لیے جہنم بن چکا“

مسلمانوں کی نسل کشی میں محو حکومت کے ہولناک مظالم کا قصہ، ایک برمی مسلمان کی زبانی

سجاد قادر

پچھلے ماہ ایک برمی مسلمان، عبدالقدوس دفتر اردو ڈائجسٹ تشریف لائے۔ آپ جمعیت خالد بن ولید الخیریہ ٹرسٹ کے رواں دواں ہیں جو برما میں غریب مسلمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ان سے برمی مسلمانوں کی حالت زار پر تفصیلی بات چیت ہوئی جو پیش خدمت ہے۔ مسلمانانِ برما جس خوفناک عذاب سے گزر رہے ہیں، یہ اس کے نئے پہلو سامنے لاتی ہے۔

س: اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیے؟

ج: میرا نام عبدالقدوس ہے۔ ۱۹۷۹ء میں پہلی بار برما سے پاکستان آیا۔ بنیادی دینی تعلیم برما ہی میں پائی پھر پاکستان آنے کے بعد بقیہ تعلیم جامعہ فاروقیہ کراچی سے مکمل کی۔



میرا سارا خاندان ابھی تک برما میں مقیم ہے جبکہ والد وفات پا چکے۔ کبھی کبھار برما آنا جانا ہوتا ہے۔ وگرنہ فون پر ہی بات چیت ہو جاتی ہے۔

س: جب برما سے پاکستان آئے، تو آپ کی عمر کیا تھی؟

ج: تب میں ۱۲ سال کا تھا۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ جب برمی حکومت ظلم کی داستانیں رقم کرنے لگی تھی اور میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں پر انسانیت سوز ظلم ہوتے دیکھا۔ تب ہم ہجرت کر کے بنگلہ دیش چلے گئے۔ چونکہ مہاجرین کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی، اس لیے بنگلہ دیشی حکومت کے لیے انھیں سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ پھر پاکستان، سعودی عرب اور بنگلہ دیش نے مل کر برمی حکومت سے ہمارا امن معاہدہ کرایا۔ ہم پھر اپنے آبائی وطن واپس چلے گئے لیکن میں ۱۹۷۹ء میں پاکستان چلا آیا۔

س: مسلمانانِ برما سے متعلق ذرا تفصیل سے بتائیے؟

ج: برما میں آباد مسلمان روہنگیا کہلاتے ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد برما کے صوبے اراکان میں آباد ہے جو اب راخین کہلاتا ہے۔ اراکان برما کی آزادی سے پہلے ایک خودمختار ریاست تھی جس پر ساڑھے تین سو برس مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اس وقت راخین کا وزیراعلیٰ بدھ مت کا پیروکار ہے۔ صوبے میں ۴۰ فی صد آبادی مسلمان ہے۔

ایک زمانے میں روہنگیا خوشحال تھے۔ مگر جب ملازمتوں کے سلسلے میں ان کا مقامی بدھیوں سے مقابلہ ہوا، تو حالات خراب ہونے لگے۔ چونکہ برما میں ۱۹۶۲ء سے فوجی حکومت ہے، اس لیے وہاں نہ جمہوریت ہے اور نہ ووٹ کا حق۔

پہلے مسلمان فوج اور دوسرے اداروں میں ہوتے تھے تاہم ۱۹۶۲ء کے بعد حکومت نے مسلمانوں کو کسی بھی سرکاری ادارے میں ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کا معاشی انحصار کاشت کاری پر ہے۔ لیکن ستم بالائے ستم فصل کا بھی دو تہائی حصہ بطور ٹیکس گورنمنٹ کو جمع کرانا ہوتا ہے جبکہ زمین ان کی اپنی ہوتی ہے اور بیج بھی۔ محنت بھی وہ خود کرتے ہیں لیکن حکومت ان سے اتنا زیادہ ٹیکس وصول کرتی ہے جو سراسر زیادتی ہے۔ اگر ہم ٹیکس جمع نہ کروائیں، تو ہماری زمین ضبط ہو جائے۔

س: برما میں موجودہ صورت حال کے متعلق بتائیے؟

ج: برمی حکومت اور بدھی تنظیموں کا کہنا ہے کہ اگر برما میں رہنا ہے، تو ہمارے نظام اور قانون کے مطابق رہنا اور مذہب بھی ہمارا اپنانا ہوگا۔ وہ مساجد اور مدرسے بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ اگر عبادت کرنی ہے، تو ہماری عبادت گاہیں موجود ہیں، وہاں جا کر کرو۔ تعلیم بھی ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کریں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنا نام بدل کر بدھ مت والا نام رکھنا پڑتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ان کے اپنے ناموں سے داخلہ نہیں دیتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، رہن سہن غرض تمام طور اطوار بدل کر مکمل طور پر بدھ مت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

اس کے علاوہ بھی وہ بہت سختیاں برتتے ہیں۔ مثلاً ایک شہر سے دوسرے شہر کوئی اپنے بھائی کے گھر گیا، تو ٹھہرنے کے لیے اسے گورنمنٹ سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اجازت لیے بغیر آپ اپنے گھر میں کسی دوست، رشتہ دار کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ کس کے پاس کتنی گائیں، بھینسیں، بکریاں اور مرغیاں ہیں، سب کا ریکارڈ حکومت کے پاس ہوتا ہے۔ بغیر ریکارڈ کے اگر کچھ رکھیں، تو حکومت ضبط کر لے گی۔

اراکان میں ۲۰۱۲ء سے ظلم کا جو نیا سلسلہ شروع ہوا، اس میں تین مہینے کے دوران ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو شہید کر دیے گئے۔ سیکڑوں مساجد شہید کر دی گئیں۔ شرپسندوں نے مدارس بند اور ہزارہا مکانات مکمل طور پر خاکستر کر دیے۔ اب ہم مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ انہی مظالم سے تنگ آ کے تقریباً ایک لاکھ سے زائد مسلمان بنگلہ دیش ہجرت کر چکے۔ لیکن اب بنگلہ دیشی حکومت نے زمینی

راستہ بند کر دیا ہے۔ روہنگیا کشتیوں پر بیٹھ کر بنگلہ دیش جاتے ہیں۔ ایک کشتی میں پانچ سو تا ایک ہزار افراد سفر کرتے ہیں۔ یہ آٹھ نو گھنٹے کا سفر ہے۔ لیکن اب بنگلہ دیشی حکومت ان کشتیوں کو بھی روکنے لگی ہے۔ جبکہ وہ برما واپس بھی نہیں جاسکتے۔ ہفتہ دس دن کے بعد خوراک ختم ہو جاتی ہے۔ مختلف موذی امراض چمٹ جاتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ چناں چہ کشتی ہی میں کئی بچے بوڑھے چل بستے ہیں۔ اکثر برمی فوج فائرنگ بھی کرتی ہے اور بہت سے مسلمان مارے جاتے ہیں۔

س: لگتا ہے، برما میں مسلمانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے؟

ج: جی بالکل، مسلمان خاندان دو بچوں سے زیادہ بچے پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا، تو جرمانہ ہو جائے گا یا پولیس جیل میں ڈال دے گی۔ ۱۹۸۲ء سے انھوں نے قانون بنایا ہے کہ شادی سے پہلے آپ کو میڈیکل سرٹیفکیٹ لینا ہوگا کہ لڑکی بالغ ہے یا نہیں۔ سرٹیفکیٹ کے لیے لڑکا اور لڑکی، دونوں فوجی مرکز حاضر ہوتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ لینے کے نام پر عموماً بلا کر مسلمان لڑکی کی عزت خراب کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ پیسے دے کر میڈیکل سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ بنوانا لازمی ہے۔ چاہے پیسے دے کر بنوائیں یا لڑکا لڑکی کو آرمی سیکشن لے جا کر۔

س: برمی حکومت کھل کے سامنے آئی ہے؟

ج: وہ کھل کے سامنے نہیں آتی، کبھی کبھار آ بھی جاتی ہے۔ زیادہ تر صوبائی حکومت کارروائیاں کرتی ہے۔

س: اس وقت روہنگیا مسلمانوں کا کسی مسلم ملک نے ساتھ دیا ہے؟

ج: سب سے پہلے ترکی نے ساتھ دیا۔ ۲۰۱۲ء میں ظلم کا سلسلہ جب شروع ہوا، تو ترک وزیراعظم طیب اردگان اور ان کی اہلیہ آئی تھیں۔ اس وقت انھوں نے کچھ تعاون کیا۔ امدادی سامان بھی ساتھ لائے لیکن انھوں نے اپنی فوج نہیں بھیجی۔

س: برمی حکومت اور مسلمانوں کا اصل تنازع کیا ہے؟

ج: بدھسٹوں کا کہنا ہے کہ اگر برما میں رہنا ہے، تو ہماری رسوم، رواج اور نظریات کے مطابق رہو، ورنہ یہاں سے نکل جاؤ۔ ۱۹۶۲ء میں مارشل لا لگ گیا تھا۔ اس وقت سے یہ نظام بن چکا کہ مسلمانوں کو حج پر جانے کی اجازت نہیں۔ یہ گورنمنٹ کی مرکزی پالیسی ہے۔ مسلمان قربانی بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ لوگوں کے باہر جانے سے کرنسی بھی باہر جاتی ہے، اس لیے حج پر پابندی لگا دی۔



مولانا عبدالقدوس (امیر جمعیۃ خالد بن ولید الخیریہ)

برمی حکومت نے ابھی تک اراکان کے مسلمانوں کو بہ حیثیت شہری تسلیم ہی نہیں کیا۔ چناں چہ کئی معاملات پر مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ شہریت کے معاملے کا ہے جو ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی نقل و حرکت پر پابندی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں نقل و حمل والا قانون بننے سے پہلے کئی مسلمان ان علاقوں میں چلے گئے جہاں کشیدگی نہیں تھی۔ جب یہ پابندی لگ گئی، تو مسلمان اب کسی دوسری جگہ نہیں جاسکتے۔

اسی دوران فوج میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ جرنیلوں کا کہنا ہے کہ ہم جمہوریت کی طرف آتے ہیں، دوسرے کہتے ہیں کہ اتنے سال تک ہم نے مارشل لا کیوں لگائے رکھا جو غیر قانونی ہے۔ بہرحال جمہوریت چاہنے والے جرنیل وہ غالب آ گئے۔ لہٰذا انھوں نے بنگلہ دیش، انڈیا اور ملائشیا کے دورے شروع کر دیے کہ ہم جمہوریت بحال کرنا

چاہتے ہیں، ہمارے ساتھ تجارت کرنا شروع کریں۔ اس لیے انھوں نے ۲۰۱۰ء میں الیکشن کرائے۔ آنگ سان سوچی کو رہا کر دیا کہ آپ بھی انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ یہ بھی بدھی لیڈر ہے مگر جمہوریت کے حامی۔

انتخابات ہونے کے بعد مسلمانوں کا صرف ایک مطالبہ پورا ہوا کہ نقل و حرکت پر پابندی ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد مسلمان تبلیغ کے لیے ایک سے دوسری جگہ آنے جانے لگے۔ ایک علاقے میں چند مسلمان تبلیغ کی غرض سے گئے، تو وہاں بستی کے چند بوڑھے مرد و خواتین ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم مسلمان تھے مگر اب نماز روزہ کلمہ سب بھول چکے۔ لہٰذا تبلیغی جماعت والوں نے انھیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور دین سے متعلق بتایا۔ جب چار بوڑھی خواتین اپنے گھر گئیں اور اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو بتایا جن کی شادیاں بدھیوں میں ہو چکی تھی کہ ہم نے پھر اسلام قبول کر لیا، تو نوجوانوں نے مشتعل ہو کر انھیں قتل کر دیا۔

اس کے بعد بستی کے چند بڑے اکٹھے ہوئے اور سوچا کہ اس طرح تو مسلمان پھر بدھیوں کو مسلم بنا لیں گے۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اگلے دن جب مسلمان اس علاقے میں پہنچے، تو مسلح افراد نے ان پر حملہ کر دیا اور انھیں پکڑ پکڑ کے سرتن سے جدا کر دیے۔ اس حملے میں دس مسلمان شہید ہوئے۔ جب مسلمان واقعے کی رپورٹ کرانے تھانے پہنچے، تو وہاں بھی ان پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ یوں مسلمانوں کی شنوائی نہیں نہ ہوئی۔

اگلے دن جمعہ تھا۔ مسلمانوں نے یہ اعلان کیا کہ جہاں جہاں جمعہ ہوتا ہے، مسلمان ہر جگہ مظاہرہ کریں تاکہ اس ظلم کا سدباب ہو سکے۔ اب جہاں جہاں مسلمانوں نے پورے اراکان میں نماز جمعہ کے بعد مظاہرے کیے، ان جھگیوں کو آگ لگا دی گئی۔ بدھیوں نے علاقوں میں باقاعدہ ٹرک پر پٹرول تقسیم کیا۔ مسلمانوں کو مارنے اور ان کے گھر بار جلانے کا سلسلہ پھر نہیں رکا بلکہ تین مہینے تک مسلسل جاری رہا۔ دریا، سمندر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں پھینکا جائے اور وہاں انسانی اعضا نہ ملیں۔ حتیٰ کہ ان علاقوں بعض لوگوں نے مچھلیاں کھانا چھوڑ دیا۔ ان سے مسلمانوں کے گوشت کی بو آتی تھی۔

بہرحال اسی قتل عام سے بچنے کی خاطر مسلمان بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کرنا چاہتے ہیں کہ قریب ترین اور اسلامی ملک وہی ہے۔ درندوں کے منہ سے بچ کر جانے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے جو صحیح سلامت بنگلہ دیش پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء سے اب تک سات لاکھ مہاجرین بدھیوں کے مظالم کی وجہ سے بنگلہ دیش پہنچ چکے۔ وہ ابھی تک وہاں خستہ حال تصور اور خاردار تاروں کے پیچھے زندگی گزار رہے ہیں۔

س: برما میں موجود مسلمانوں تک کیا امدادی سامان پہنچ رہا ہے؟

ج: سامان پہنچ رہا ہے، لیکن بہت کم۔ مثال کے طور پر ایک گاؤں میں مسلمانوں کے سات سو گھرانے واقع ہیں۔ وہاں چاولوں کی سات سو بوریاں دی گئیں۔ اگر اسی گاؤں میں واقع بدھیوں کے دو سو خاندان ہیں، تو ان کو بھی سات سو بوری چاول دیے گئے۔ یہ انصاف تو نہیں ہوا۔

اقوام متحدہ اور غیر ملکی غیر سرکاری تنظیموں نے اراکان میں کیمپ لگائے۔ انھوں نے خورونوش سامان مسلمانوں کے علاقوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی لیکن بدھیوں نے انھیں آگے بڑھنے نہیں دیا۔ بلکہ ان کے دفتر توڑ دیے۔ انھوں نے پھر رپورٹ آگے پہنچائی کہ مسلمانوں کے علاقوں میں جہاں سامان کی ترسیل ہونا چاہیے، وہاں ہمیں پہنچنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اس میں حکومت بھی رکاوٹ بنتی ہے۔

س: مسلمانوں کو شہید کرنے کے بعد بدھی ان کے اعضا کیوں کاٹتے ہیں، اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ اور کیا وہ مسلمانوں بہو بیٹیوں کو اسمگل بھی کرتے ہیں؟

ج: اعضا کاٹنے سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کیوں کاٹتے ہیں۔ شاید ان کی نفرت کا اظہار ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسانی گوشت اسمگل کرتے ہوں کیونکہ کچھ برمی علاقوں میں ایسے ہوٹل موجود ہیں جہاں انسانی گوشت باقاعدہ پکایا جاتا ہے۔

مسلمان لڑکیوں اور خواتین کو تو وہ اسمگل کر رہے ہیں۔ ابھی دو تین مہینے پہلے لڑکیاں اسمگل کرتا گروہ جنگل میں پکڑا گیا جس کو سزا بھی ملی۔

س: آپ کو کیا لگتا ہے، کون سا ملک برمی حکومت کی مدد کر رہا ہے؟

ج: برما میں چین کا اثر و رسوخ سب سے زیادہ ہے۔ تاہم چینی حکومت برما کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ مگر چین اور پاکستان دیرینہ دوست ہیں۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ چینی حکومت کی مدد سے برما میں مسلمانوں کا قتل عام بند کرائے۔

ایک بات اور بھی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اراکان کے مسلم راہنماؤں نے سعی کی تھی کہ ان کا علاقہ مشرقی پاکستان میں شامل ہو جائے۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ مگر برمی حکومت کو ابھی تک یہ بات کھٹکتی ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت پاکستان کی حمایت کی تھی۔ اس لیے بھی وہ برمی مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کرتی ہے۔

س: اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

ج: مسئلے کا حل یہی ہے کہ اراکان میں اقوام متحدہ کی امن فوج تعینات ہو جائے۔ اس سلسلے میں پاکستان اہم پیش رفت کر سکتا ہے کیونکہ اقوام متحدہ کی امن فوج میں سب سے زیادہ پاکستانی فوجی شامل ہیں۔

امن فوج پھر اراکان میں مسلمانوں کو تحفظ دے تاکہ ان کی زندگیوں میں بھی ٹھہراؤ آ سکے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر بنگلہ دیش، پاکستان، ملائشیا، انڈونیشیا کو چاہیے کہ وہ برمی مسلمانوں کو اپنے ممالک میں آباد کر لیں۔

موت کا وقت بتانے والا کیلکولیٹر

طب و صحت کے شعبوں کے محققین نے سائنسی بنیادوں پر موت کے خطرات سے خبردار کرنے والا ایک ایسا کیلکولیٹر تیار کیا ہے جو کسی بھی شخص کو یہ بتا سکتا ہے کہ آیا اگلے پانچ سال کے اندر اندر وہ موت کے منہ میں جا سکتا ہے۔ اس کیلکولیٹر کے ذریعے محققین کو یقین ہے کہ لوگوں میں اپنی صحت کو بہتر بنانے کے حوالے سے زیادہ بہتر آگہی جنم لے گی۔

محققین نے یہ کیلکولیٹر ایک فلاحی ادارے "سینس اباؤٹ سائنس" کے ساتھ مل کر تیار کیا ہے۔ یہ ادارہ لوگوں کو سائنسی اور طبی ثبوت سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ اس کیلکولیٹر کے نتیجے میں لوگوں میں اپنی صحت کے حوالے سے شعور اور آگہی میں اضافہ ہو گا اور مستقبل میں فیملی ڈاکٹروں کو اس کی مدد سے انتہائی زیادہ خطرات سے دوچار مریضوں کو پہچاننے میں مدد مل سکے گی۔

ان محققین نے بچاؤ کے امکانات بتانے والا ایک حسابی ماڈل تیار کیا جس کی مدد سے آبادی، طرز زندگی اور صحت سے متعلق ۶۵۵ مخصوص پیمانوں کی بنیاد پر کسی بھی کیس میں یا پھر مردوں اور خواتین میں الگ الگ مخصوص کیسوں میں موت سے متعلق پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ تاہم گینا نے اس کیلکولیٹر کے حوالے سے محتاط رہنے کا بھی مشورہ دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ پیمائش کسی حد تک غیر یقینی بھی ہے اور اسے ایک پیش گوئی نہیں تصور کیا جانا چاہیے۔ آندریا گینا کا کہنا تھا "زیادہ تر افراد اپنی ورزش میں اضافہ کرتے ہوئے، تمباکو نوشی چھوڑتے ہوئے اور زیادہ صحت بخش غذا کھاتے ہوئے آئندہ پانچ برسوں کے اندر اندر اپنی موت کے خطرات کو کم کر سکتے ہیں۔"

س: آپ دنیا بھر اور پاکستان کے مسلمانوں کو برمی کے بہن بھائیوں کی طرف سے کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: ہمارا یہی پیغام ہے کہ اپنے برمی مسلمان بھائیوں کی دل و جان سے مدد کریں، خواہ مالی ہو یا جہاد کی صورت میں اور اقوام متحدہ کو بھی اس ظلم و بربریت کے خلاف اپنا بھرپور کردار ادا کرنے پر مجبور کیا جائے۔

◆◆◆

کمپیوٹر مشکلات کا آسان حل

نوجوانوں کے لیے خصوصی پیش کش

محمد اقبال قریشی

یو ایس بی

آج کے دور کا مقبول ترین آلہ بن چکا۔ اس کے ذریعے آپ ایک سے دوسرے کمپیوٹر میں باآسانی مواد منتقل کر سکتے ہیں۔ آج بازار میں ۲ جی بی سے لے کر ۶۴ جی بی تک یو ایس بی باآسانی دستیاب ہے۔ اکثر اداروں میں یو ایس بی لگانے والے مقام پر سوراخ بند یا پھر کسی اور ذریعے سے ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔ ہم آج آپ کو ایسا طریقہ بتانے جا رہے ہیں جس کے ذریعے آپ باآسانی ونڈوز رجسٹری کے ذریعے یو ایس بی کا استعمال روک سکتے ہیں۔

یو ایس بی کے بے شمار فوائد کے ساتھ ساتھ ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے کوئی بھی آپ کے کمپیوٹر سے قیمتی ڈیٹا اُڑ ا سکتا ہے۔ عام طور پر اخبارات، جرائد اور تعلیمی اداروں کے کمپیوٹر جہاں بڑی تعداد میں عملے کے ارکان اور طلبہ کا آنا جانا لگا رہتا ہے، وہاں چوری کا یہ عمل کبھی کبھی خاصے بڑے نقصان کا موجب بنتا ہے۔ آج ہم آپ کو ایک ایسا طریقہ بتاتے ہیں جس کے ذریعے کوئی بھی شخص آپ کے کمپیوٹر سے مواد کاپی نہیں کر سکے گا۔

☆..... سٹارٹ میں جا کر Run کی آپشن نکالیے اور Regedit لکھ کر OK دبا دیجیے۔ یہاں مندرجہ ذیل لوکیشن پر جائیں:

HKEY_LOCAL_MACHINE\SYSTEM\CurrentControlSet\Control۔ یہاں دائیں جانب رائٹ کلک کر کے ایک نئی Key بنائیے اور اس کا نام StorageDevicePolicies رکھ دیں۔ اب آپ کے بائیں ہاتھ والی لسٹ میں ایک نئی key کا اضافہ ہو گیا یعنی StorageDevicePolicies۔

اب StorageDevicePolicies پر رائٹ کلک کر کے نئی DWORD ویلیو بنائیے اور اس کا نام رکھیے WriteProtect۔ اس کی ویلیو صفر ہو گی جسے آپ ایک (1) کر دیجیے۔ اب آپ اپنا کمپیوٹر ری اسٹارٹ کر لیں۔ دیکھیے اب





آپ کے کمپیوٹر میں کسی بھی یو ایس بی کے ذریعے ڈیٹا چوری نہیں کیا جا سکے گا۔ چونکہ اس طرح آپ خود بھی اپنے کمپیوٹر سے یو ایس بی کے ذریعے مواد نہیں لے سکیں گے اس لیے اسے صرف ان کمپیوٹرز پر آزمائیے جو سب کے استعمال میں رہتے ہوں۔ یہ ٹوٹکا تعلیمی اداروں اور انٹرنیٹ کلبوں کے کمپیوٹروں کے لیے زیادہ کارآمد ہے۔

اڑیل پروگراموں کا علاج

یہ مسئلہ اکثر حضرات کو درپیش ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کی اصطلاح میں ایسے پروگرام 'اڑیل' کہلاتے ہیں جو چلتے چلتے اچانک کام کرنا بند کر دیں اور انھیں بند کرنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آسکے۔ ہم دو آسان طریقوں سے آپ کو اس کا حل سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

اگر آپ کوئی پروگرام چلا رہے ہوں اور کام کے دوران گھومتا ہوا ننھا سا دائرہ (Bussy Icon) کا نشان آجائے اور خاصی دیر تک دور ہونے کا نام نہ لے، تو سمجھ جائیے کہ آپ کا پالا ایک اور اڑیل پروگرام سے پڑ چکا۔ اب جب تک یہ نشان نظر آتا رہے گا، آپ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ اس خرابی کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں: ایپلیکیشن سافٹ ویئر یا پھر آپریٹنگ سسٹم۔

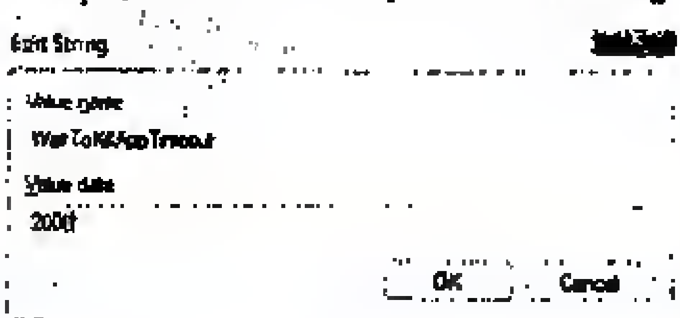
یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پروگرام کس وجہ سے بند ہوا ہے، آپ کرسر (Cursor) کو اسکرین پر سب سے نیچے لائیے اگر کرسر دائرے سے بدل کر تیر کا نشان بن جائے تو سمجھ جائیے کہ اسی سافٹ ویئر کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے اور ونڈوز کا آپریٹنگ سسٹم درست حالت میں کام کر رہا ہے۔ بصورت دیگر خرابی آپریٹنگ سسٹم کی ہے جس کی ایک سے زیادہ وجوہ ہو سکتی ہیں جن میں سے بنیادی وجہ کوئی اہم سسٹم فائل ڈیلیٹ ہو جانا ہے۔ اگر ایسا ہے، تو آپ کو ونڈوز دوبارہ سے انسٹال کرنا ہوگی۔ اگر خرابی ایپلیکیشن سافٹ ویئر کی ہے، تو آپ Alt+Ctrl+Del کی آپشن سے مستفید ہو سکتے ہیں یعنی آپ ایک ساتھ یہ تینوں کیز دبائیے آپ کے سامنے کلوز پروگرام کی ونڈو کھل جائے گی جس میں ان تمام پروگراموں کے نام درج ہوں گے جو اس وقت کام کر رہے ہیں۔ جس پروگرام کے سامنے Responding کے بجائے Non Responding لکھا ہوا ہے سلیکٹ کر کے End Task کی آپشن پر کلک کر دیجیے تھوڑی دیر بعد وہ پروگرام بند ہو جائے گا۔

بعض اوقات یہ مسئلہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ آپ کو اپنا کمپیوٹر دوبارہ اسٹارٹ کرنا پڑتا ہے اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ آج ہم آپ کو ایک ایسی ترکیب بتاتے ہیں جس پر عمل کرنے سے آپ کا کمپیوٹر خودکار انداز میں ان پروگراموں کو بند کر دے گا جو چلنے سے انکاری ہوں۔ اگر آپ کو ونڈوز رجسٹری کے بارے میں ذرا سی بھی معلومات ہیں، تو آپ ہماری اس ترکیب سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

Start پر کلک کیجیے اور Run کی آپشن میں جا کر Regedit لکھیے۔ یہاں مندرجہ ذیل مقام پر جائیے:

Hkey_Current_User\Control panel\Desktop

اب دائیں جانب والے حصے میں باری باری رائٹ کلک کیجیے اور درج ذیل نام اور ان کے سامنے دی گئی ویلیوز بنائیے۔ جب آپ رائٹ کلک کریں گے، تو New کی آپشن سامنے آئے گی۔ آپ New پر کلک کریں گے، تو ایک اور مینو کھلے گا جس میں String Value کی آپشن دوسرے نمبر پر نظر آئے گی۔ اس پر کلک کرنے سے ایک دائیں حصے میں ایک نئی ویلیو کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس ویلیو کا نام آپ درج



ذیل میں سے رکھ کر اس کی ویلیو بھی درج کر دیں۔ اسی طرح باری باری آپ درج ذیل نام اور ان کی ویلیوز درج کر دیں۔

WaitToKillAppTimeout=2000

AutoEndTasks=1

HungAppTimeout=1000

LowLevelHooksTimeout=1000

اب آپ اپنا کمپیوٹر ری اسٹارٹ کر دیجیے تاکہ کی ہوئی تبدیلیوں پر عمل درآمد ممکن ہو سکے۔

سست رفتار کمپیوٹر کا کیا علاج؟

کیا آپ کا کمپیوٹر اچھا بھلا چلتے چلتے اچانک بے حد سست ہو گیا ہے یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹا پروگرام کھولنے میں بھی معمول سے زیادہ دیر لگتا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ آپ کمپیوٹر کی سستی کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ کمپیوٹر استعمال کرنے والے حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے کمپیوٹر ہمیشہ اچھی حالت میں رہیں اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو، تو انھیں شدید دقت ہوتی ہے۔ اس میں کمپیوٹر بنانے والی کمپنی اور کمپیوٹر میں کام کرنے والے سافٹ ویئرز کا اتنا زیادہ قصور نہیں جتنا کہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر کام کرنے والے کا۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں سے بیشتر حضرات کمپیوٹر استعمال تو کرتے ہیں لیکن اس کا خیال رکھنے کی بالکل بھی زحمت نہیں کرتے۔

میں نے اکثر دوستوں کے کمپیوٹر ان حال میں پائے ہیں کہ جب سی پی یو کھولا جاتا ہے تو بڑے بڑے جالے اور گرد کی موٹی تہ ہمارا استقبال کرتی ہے۔ بہت سے نوجوان اپنی موٹر سائیکل تو ہر اتوار دھوتے ہیں لیکن جس کمپیوٹر نے ان کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ آسان بنا دی ہے، اس کی صفائی کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ یاد رکھیے کمپیوٹر کی بہتر کارکردگی کے لیے اس کی بیرونی اور اندرونی صفائی بے حد ضروری ہے۔ آج ہم آپ کو چند ایسے مفید ٹوٹکے بتانے جا رہے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنے کمپیوٹر کی کارکردگی میں کئی گنا اضافہ کر سکیں گے۔ اگر آپ مہینے میں کم از کم دو بار ہمارے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کریں، تو آپ کا کمپیوٹر بہت کم مسائل کا شکار ہو گا۔

کمپیوٹر کی رفتار سست پڑ جانے کی بنیادی وجہ انٹرنیٹ کا استعمال بھی ہے جو آپ کے کمپیوٹر کی سسٹم رجسٹری کو غیر ضروری عارضی فائلوں اور کوکیز وغیرہ سے اس قدر بھر دیتا ہے کہ چند روز میں سسٹم رجسٹری ان فائلوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے اور نتیجتاً آپ کا سسٹم سست رفتار ہو جاتا ہے۔

۱۔ یاد رکھیے آپ کا کمپیوٹر انسانی دماغ کی طرح کام کرتا ہے۔ جیسے انسانی دماغ میں اگر ایک ساتھ بہت سے خیالات اور منصوبے ڈال دیے جائیں، تو وہ الجھنے کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کمپیوٹر میں اگر فائلوں اور پروگراموں کا ہو جائے، تو اس کی کارکردگی بھی متاثر ہوگی۔ کمپیوٹر کو غیر ضروری پروگراموں سے صاف کرتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ بعض اوقات آپ کسی وقتی ضرورت کے تحت اپنے کمپیوٹر میں کوئی سافٹ ویئر یا پھر کوئی اینٹی وائرس انسٹال کرتے ہیں جسے استعمال کرنے کے بعد ازاں آپ کو ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے پروگرام آپ کی کمپیوٹر میموری پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں جس کا براہ راست اثر آپ کے کمپیوٹر کی کارکردگی پر پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ آپ کنٹرول پینل میں جا کر Add & Romove کی آپشن میں جا کر غیر ضروری پروگراموں کو Uninstal کر دیجیے۔ یاد رکھیے کوئی بھی پروگرام ان انسٹال کرنے کے بعد اپنا کمپیوٹر ری اسٹارٹ ضرور کیجیے۔

۲۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے کمپیوٹر میں دو سے زیادہ اینٹی وائرس انسٹال کر لیتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یقیناً یہ ہوتا ہے کہ ان کا کمپیوٹر طرح طرح کے وائرسوں سے محفوظ رہے لیکن یہ قطعی غلط خیال ہے۔ یاد رکھیے جب آپ اپنے کمپیوٹر میں اینٹی وائرس زیادہ تعداد میں انسٹال کرتے ہیں، تو وائرس کے حملے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اپنا کمپیوٹر وائرس کے حملے سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ کوئی

سا بھی اچھا اینٹی وائرس (تازہ ترین ورژن) اور ونڈوز فائروال ہر وقت چالو رکھیے۔ اس وقت سب سے زیادہ مقبول اور کارآمد اینٹی وائرس Eset کا اسمارٹ سیکیورٹی ۸ ورژن ہے جو آپ ان کی ویب سائٹ سے با آسانی ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے، سافٹ ویئر ہمیشہ خرید کر استعمال کیجیے۔ چوری شدہ سافٹ ویئر کی keys یا کریک فائل کسی بھی اچھے torrent سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے لیکن اس فعل کی حوصلہ شکنی اور مذمت کی جانی چاہیے تاکہ سافٹ ویئر بنانے والی کمپنی کو نقصان نہ پہنچے۔

۳۔ بعض حضرات کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی پروگرام کھولے رکھتے ہیں۔ پیشہ ور ڈیزائنروں یا سافٹ ویئر انجینئروں کی تو یہ مجبوری ہوتی ہے لیکن عام حالات میں ایسا کرنے سے آپ کے کمپیوٹر کی کارکردگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے پروگرام چلتے چلتے کریش بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کا سسٹم سست بھی ہو جاتا ہے لہٰذا بلاضرورت ایک ہی وقت میں دو سے زیادہ پروگرام مت کھولیے۔

۴۔ عام طور پر کمپیوٹر میں ایک ہارڈ ڈسک استعمال ہوتی ہے۔ کمپیوٹر میں انسٹالیشن کرتے وقت ہارڈ ڈسک کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر حصہ ڈرائیو کہلاتا ہے۔ عام طور پر سی ڈرائیو میں آپریٹنگ سسٹم اور دیگر پروگرامز کے سافٹ ویئر اور ڈیٹا میں فائلیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جب کبھی کمپیوٹر میں خرابی پیدا ہو تو دوبارہ انسٹالیشن کرنے سے ڈرائیو سی کا ڈیٹا مکمل طور پر ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ماہرین اپنا قیمتی ڈیٹا سی ڈرائیو میں محفوظ کرنے کا مشورہ کبھی نہیں دیتے۔ اس کے باوجود بعض اوقات ایک ہی ہارڈ ڈسک میں سب کچھ کرنے سے کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں ضرور جنم لیتی ہیں اور ڈیٹا ضائع ہونے کا احتمال بہرحال موجود رہتا ہے جس سے بچنے کے لیے ماہرین نے ایک نیا راستہ نکالا ہے۔

وہ یہ کہ آپ اپنے کمپیوٹر میں دو ہارڈ ڈسکیں استعمال کیجیے ایک ہارڈ ڈرائیو میں صرف آپریٹنگ سسٹم انسٹال کیجیے جبکہ دوسری میں دیگر پروگرامز سافٹ ویئر وغیرہ یوں آپ کے کمپیوٹر کی رفتار تیز ہوگی اور مشکلات کا سامنا بھی کم سے کم ہوگا۔

۵۔ ہر دو ہفتوں بعد اپنے کمپیوٹر پر Disk Defragment ضرور چلائیے۔ جو حضرات کمپیوٹر پر بے تحاشا کام کرتے ہوں انھیں اس سہولت سے ہر ہفتے مستفید ہوتے رہنا چاہیے۔ ڈسک ڈیفریگمنٹ کا طریقہ یہ ہے:

Start> Accessries> System Tools> Disk Defragment اس آپشن کو منتخب کرنے سے پہلے آپ Analyze پر کلک کر کے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا آپ کے کمپیوٹر کو ڈیفریگمنٹ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ڈسک ڈیفریگمنٹ والے مقام ہی پر آپ کو ڈسک کلین اپ کی آپشن نظر آئے گی۔ اس آپشن کو کھولیں اور کمپیوٹر کی ری سائیکل بن اور عارضی فائلوں کے فولڈروں کو چیک کر کے یہ فائلیں ڈیلیٹ کر دیجیے۔

۲۔ جب بھی آپ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں، تو اس کی عارضی فائلیں اور کوکیز کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان فائلوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی کارکردگی متاثر ہوتی رہتی ہے۔ ان فائلوں کو ڈیلیٹ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ run میں جا کر %temp% لکھیں اور اینٹر دبا دیں، آپ کے سامنے وہ فولڈر کھل جائے گا جس میں عارضی فائلیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ تمام فائلوں کو سیلیکٹ کر کے شفٹ کے ساتھ ڈیلیٹ کر دیں۔ کچھ فائلیں ڈیلیٹ نہیں ہوں گی، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کمپیوٹر جن فائلوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے وہ چند فائلیں ڈیلیٹ نہیں ہوتی۔

اس مقصد کے لیے کوئی بھی اچھا سا رجسٹری کلینر (Registry Cleaner) بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت سب سے بہترین رجسٹری کلینر وائز (Wise Cleaner 365) ہے۔ آپ اس کا ہوم ورژن Google سے ڈاؤن لوڈ کر کے استعمال کر سکتے ہیں، یہ گھریلو استعمال کے

لیے بالکل مفت ہے۔اس کا مکمل ورژن خرید ابھی جا سکتا ہے۔

وائرس سے چھٹکارے کے لیے چند مفید ٹپس

عام طور پر کمپیوٹر کو وائرس سے پاک کرنے کے لیے فریش ونڈو انسٹال کی جاتی ہے، یہ یقیناً ایک اچھا اور تیر بہدف نسخہ ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض حضرات وائرس کا رونا روتے رہتے ہیں۔اس کے سد باب کے لیے درج ذیل اقدامات بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

کمپیوٹر میں فریش انسٹالیشن کے بعد غلطی سے بھی اپنے سسٹم کی کسی بھی ڈرائیو کو ڈبل کلک سے نہ کھولیں۔کیوں کہ اگر آپ فریش انسٹالیشن کر بھی لیں تو آپ کے بقیہ ڈرائیوز میں وائرس موجود رہتا ہے۔اور جیسے ہی آپ نے ڈبل کلک کیا وائرس دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔اور آپ کی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔سب سے پہلے اپنے سسٹم کے فولڈر آپشن (Folder option) میں درج ذیل تصویر میں دیے گئے آپشن چیک اور ان چیک کریں۔ونڈوز سیون میں بائیں ہاتھ پر سب سے اوپر organize کا ڈراپ مینو کھولنے سے یہ آپشن سامنے آئے گی۔

۲۔اب سب سے پہلے اپنے کمپیوٹر میں show files hidden کو جو کہ by default uncheck ہوتا ہے، اس کو check mark کرلیں۔

۳۔اس کے بعد اس کے نیچے اگر ونڈوز ایکس پی ہے تو دوسرے اور وسٹا یا سیون ہے، تو تیسرے نمبر پر hide operating system drives and filessystem جو کہ بائی ڈیفالٹ uncheck ہوتا ہے اس کا چیک مارک ختم کریں تاکہ آپ کو سسٹم آپریٹنگ ہیڈن فائلیں بھی نظر آئیں۔

وجہ یہ کہ اکثر وائرس آپریٹنگ سسٹم سے ملتے جلتے ناموں کی شکل میں اور چھپا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اچھے سے اچھا اینٹی وائرس بھی اسے پہچاننے میں ناکام رہتا ہے۔اگر آپریٹنگ سسٹم فائلز چیک مارک ہوا ہوا اور سسٹم ہیڈن فائلز نظر آتی ہیں تو کوئی بھی سادہ اینٹی وائرس اس کو پکڑنے میں سستی نہیں کرتا۔بشرطیکہ اینٹی وائرس انفارمیشن اپ ڈیٹ ہو کہ یہ وائرس ہے۔

۴۔اب سب سے پہلے مائی کمپیوٹر میں اگر ونڈوز ایکس پی ہو تو اوپر مینو میں فولڈر کا بٹن ہوگا، اس کو کلک کریں، تو بائیں جانب چھوٹی ونڈو بار ظاہر ہو جائے گا جس میں آپ کے مائی کمپیوٹر میں سبھی ڈرائیوز نظر آجائیں گی۔اب اس مینو بار میں اپنے ڈی ای اور جتنے بھی ہارڈ ڈرائیوز ہیں، ایک دفعہ کلک کریں۔(ونڈوز ایکس پی میں ڈی یا ای ڈرائیو پر رائٹ کلک کر کے بھی ایکسپلورر کلک کرنے سے ڈرائیو آٹو رن پر عمل کیے بغیر کھل جاتا ہے) آپ کی ڈرائیو کھل جائے گی۔اب ڈرائیو سی کے علاوہ کیونکہ اس پر تو فریش انسٹالیشن کے بعد کوئی وائرس نہیں رہتا، باقی تمام ہارڈ ڈرائیوز سے autorun.inf رائٹ کلک کر کے ڈیلیٹ کرلیں۔ اور کوئی بھی نامعلوم فائل جو آپ کو vbs یا کسی بھی نام سے ہو، تو ڈیلیٹ کر دیں۔تاکہ اگر آپ اس ڈرائیو کو غلطی سے ڈبل کلک کریں تو واپائی نہ ہو جائے۔

☆اپنے سسٹم کے view سیٹنگ کو details پر رکھیں اور کسی بھی فولڈر کو ڈبل کلک کرنے سے پہلے اس کے detail میں دیکھیں۔اگر application لکھا نظر آرہا ہے۔تو وہ یقیناً وائرس ہے۔اور اس کی پراپرٹی سائز بھی کے بی میں ہوگا، تو اس کو ڈیلیٹ کر دیں۔کیوں کہ بعض وائرس آپ کے فولڈر کو hidden کر کے اس کے نام کا ڈپلیکیٹ وائرس بناتے ہیں جس کی شکل بھی فولڈرز کے شکل کی ہوتی ہے۔فولڈر کے details میں آپ کو ہمیشہ folder file لکھا نظر آئے گا۔

☆سب سے ضروری کام جو آپ کو اپنی عادت بنانی چاہیے وہ یہ کہ کسی بھی usb ڈیوائس کو بھی ڈبل کلک کر کے نہ کھولیں۔بلکہ اپنے سسٹم کی ہارڈ ڈرائیوز کو بھی ہمیشہ ایکسپلورر کے ذریعے ہی کھولیں تاکہ اس میں کوئی وائرس موجود ہو تو وہ ایکٹیو نہ ہو جائے۔

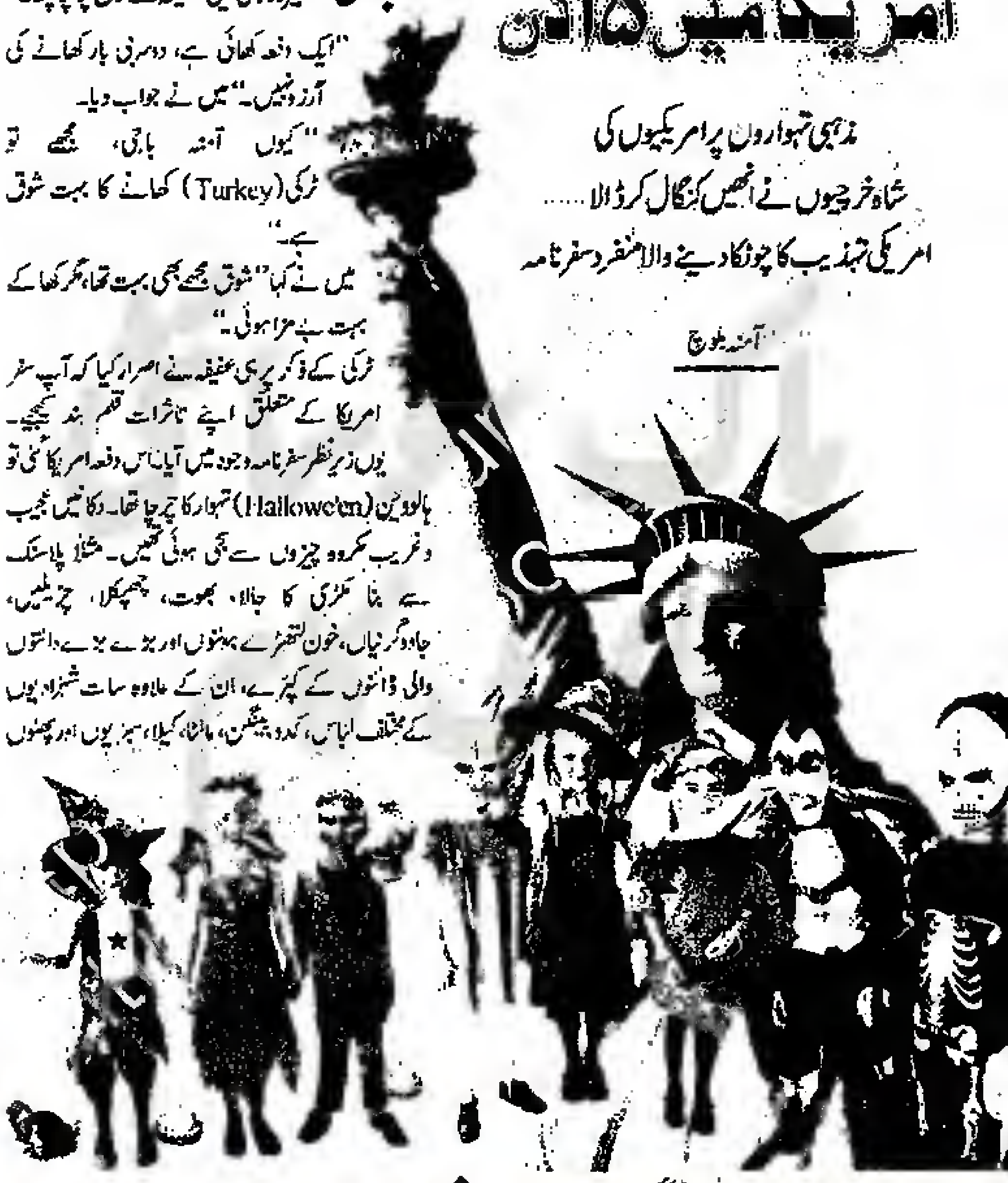
◆◆◆

جہاں مذہب بن گیا تجارت اور رشتے بیوپار

امریکا میں ۱۵ دن

مذہبی تہواروں پر امریکیوں کی
شاہ خرچیوں نے انھیں کنگال کر ڈالا......
امریکی تہذیب کا چونکا دینے والا منفرد سفرنامہ

آمنہ بلوچ



باجی "ٹرکی" کھائی تھی؟" میری بڑی بہن، باجی فیروزہ کی بیٹی، عفیفہ نے فون پر پوچھا۔

"ایک دفعہ کھائی ہے، دوسری بار کھانے کی آرزو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں آمنہ باجی، مجھے تو ٹرکی (Turkey) کھانے کا بہت شوق ہے۔"

میں نے کہا "شوق مجھے بھی بہت تھا، مگر کھا کے بہت بے مزا ہوئی۔"

ٹرکی کے ذکر پر ہی عفیفہ نے اصرار کیا کہ آپ سفر امریکا کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کیجیے۔ یوں زیرِ نظر سفرنامہ وجود میں آیا۔ اس دفعہ امریکا گئی تو ہالووین (Halloween) تہوار کا چرچا تھا۔ دکانیں عجیب و غریب مکروہ چیزوں سے سجی ہوئی تھیں۔ مثلاً پلاسٹک سے بنا ٹرکی کا جالا، بھوت، چمگادڑ، چڑیلیں، جادوگرنیاں، خون لتھڑے بھتنوں اور بڑے بڑے دانتوں والی ڈائنوں کے کپڑے، ان کے علاوہ سات شہزادیوں کے مختلف لباس، کدو پینٹنگ، مالٹا، کیلا، سبزیوں اور پھلوں

کی شکل والے لباس۔ میری بہن ساتھ ہوتی۔ بتاتی رہتی کہ یہ سب دکانداری ہے۔ ہر سال لباس نئے ڈیزائن میں آتے اور سال گزشتہ کے متروک سمجھے جاتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے کچھ لوگوں نے اپنے گھروں کے باہر "چڑیل گھر" بنا لیے۔ گھروں کے سامنے صحن میں جالا تنا ہوا ہے۔ موٹی سی کالی مکڑی جالے میں بیٹھی ہے۔ بڑا سا چھپکلا، ڈائنیں، بھوت، الو، چوہے، جیسے چھوٹے موٹے جانور جو جادو وغیرہ کے عمل میں مطلوب ہوتے ہیں، زمین اور درختوں پر دکھائی دیے۔

امریکی یہ دن شیطان کو خوش کرنے کے لیے مناتے ہیں تاکہ وہ ان پر سارا سال مہربان رہے اور لوگوں پر مصیبتیں نازل نہ کرے۔ یہ رات کی تقریب ہے۔ اسکولوں میں چھٹی نہیں ہوتی۔ بچے مختلف روپ دھار کر اسکول جاتے ہیں۔ کوئی بھتنا بنا ہے تو کوئی جادوگرنی، کوئی چڑیل تو کوئی شہزادی، کوئی بچہ کدو بنا ہے تو کسی نے پینگوئن، کیلے یا مالٹے کا لباس پہنا ہوا ہے۔ گویا "چند احمق جمع شدند اور گویند میلہ....."

شام ہوتے ہی بچے ٹوکریاں پکڑے، چہروں پر مختلف ڈراؤنے ماسک سجائے، کاسٹیوم پہنے میٹھی گولیاں لینے آس پاس کے گھروں میں جاتے ہیں۔ "یہ شیطان کی کینڈی" کہلاتی ہیں۔ اسے خوش کرنے کے لیے ہی تقسیم ہوتی ہیں۔ گویا یہ شیطان کے نام کا صدقہ ہے۔ میری بھانجی بتا رہی تھی کہ مسجد میں مولانا صاحب نے ہالووین کے متعلق بتایا کہ یہ شیطان کا دن ہے۔ اسے نہیں منانا چاہیے اور شیطان کے نام کی کینڈی بھی نہ کھائیے۔

عفیفہ سے معلوم کر کے دل بہت رنجیدہ ہوا کہ امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرتعلیم بعض مسلمان طالب علم بھی یہ جشن مناتے ہیں، صرف مغرب کی نقالی میں۔ میں نے اپنا قلم بھی اس لیے اٹھایا کہ شاید کوئی پاکستانی میرا یہ مضمون پڑھ کر مغربی تہواروں مثلاً ہالووین، تھینکس گیونگ، کرسمس، ایسٹر، مدرز اور فادرز ڈے جیسی خرافات سے دور ہو جائے۔ ان کے متعلق اہل مغرب خود کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ رسمیں کافر اقوام سے لی ہیں اور یہ عیسائی مذہب کا حصہ نہیں۔



"سیاہ جمعہ" پر لوگوں کا ہجوم

حقیقت یہ ہے کہ ان تہواروں کو اب مغربی تاجروں نے دکان داری بنا لیا ہے۔ اسے وہ چمکا رہے ہیں اور ہم بغیر سوچے سمجھے ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ہالووین کی رات ختم ہوتے ہی سیل شروع ہو جاتی ہے۔ اس سیل میں مختلف لباس، ماسک اور کینڈیاں فروخت ہوتی ہیں۔ تاجر چاہتا ہے کہ جتنی جلد ہو، یہ چیزیں ٹھکانے لگ جائیں تاکہ وہ تھینکس گیونگ (Thanks Giving) کی چیزیں سجا سکے۔

اس تہوار کی وجہ موعود یہ ہے کہ امریکیوں کے اجداد نے امریکا پہنچ کر اسی دن پہلے پہل اپنی بوئی فصل کاٹی تھی۔ تھینکس گیونگ تہوار سے وابستہ دکانیں، اسٹور، اور

مال مختلف چیزوں سے بھرے ہوتے ہیں جن میں برتن خصوصاً شامل ہیں۔ بڑی ٹرے، پیالے، پکانے کے برتن، چائے، کافی کے ظروف، زیورات، پرس وغیرہ۔

اسٹوروں میں بڑے بڑے گہرے زرد رنگ کے پیٹھے بھی دیکھے۔ ڈھیر پڑے تھے۔ چھوٹے پیٹھے بھی تھے جیسا کہ چھوٹا خربوزہ ہوتا ہے مگر رنگ سب کا گہرا زرد۔ یہی پیٹھا اور ٹرکی، تھینکس گیونگ تہوار کا اہم جز ہیں۔ پیٹھے سے کیک اور مختلف مٹھائیوں کے علاوہ چائے تک بنتی ہے جس کی ایک پیالی پانچ ڈالر میں دستیاب ہے۔

ٹرکی بڑی مرغی جیسا جانور ہے۔ صرف امریکا میں پایا جاتا ہے۔ یہ تھینکس گیونگ تہوار کا ویسا ہی لازمی جز ہے جیسا عیدالاضحی پر ہمارا بکرا ہوتا ہے۔ یہ امریکا کا اہم تہوار ہے۔ اس موقع پر تین چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اس سے امریکیوں کی کوشش رہتی ہے کہ پورا خاندان جمع ہو جائے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ امریکی مسلمان بھی اسے مناتے ہیں۔ وجہ یہ کہ چھٹیاں ہونے کے باعث سبھی رشتے دار ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ تقریب بطور عشائیہ (ڈنر) منائی جاتی ہے۔ سب اہل خانہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ عموماً سالم ٹرکی پکائی جاتی ہے جسے سب شوق سے کھاتے ہیں۔

میری بہن کی ایک پاکستانی سہیلی نے اس تہوار کے موقع پر جس کا خاوند انگریز مسلمان ہے، ہمیں ٹرکی کھانے کی پرجوش دعوت دی۔ بہن نے کہا کہ چاول وہ بنا کر لے آئیں گی۔ نماز مغرب کے بعد ہم ان کے گھر پہنچے۔ مجھے ٹرکی کھانے کا اشتیاق کشاں کشاں لے گیا تھا۔

ایک سالم ٹرکی بڑی سی ٹرے میں میز پر سجا دی گئی۔ ہر ایک نے اس میں سے مطلوبہ گوشت خود کاٹا تھا۔ میری عادت ہے کہ میں نئی غذا تھوڑی سی لیتی ہوں تاکہ پسند نہ آئے تو گھراتے ہوئے افسوس نہیں ہو۔ میں نے ذرا سا گوشت کھانے کے لیے منہ میں ڈالا، بالکل پھیکا اور بے مزہ، نہ نمک نہ مرچ، نہ تیل بس ابلی ہوئی غذا تھی! منہ میں ڈالا ہوا نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔ اہل خانہ کی نظر بچا کر بقیہ گوشت سنک میں گرا دیا۔

گھر کے پکے چاول کھا کر پیٹ بھرا۔ پھر میز پر ایک اور چیز نے متوجہ کیا۔ دیکھتے ہوئے محسوس ہوا جیسے ابلی ہوئی سویاں ہیں۔ (جیسے آج کل نوڈلز ابال کر کھائے جاتے ہیں، اسی طرح ہم سرائیکی سویاں ابال ان میں چینی اور گھی ڈال کر کھاتے ہیں) میں نے وہ بھی ذرا سی لیں۔ منہ میں ڈالیں تو نگلنا مشکل ہو گیا۔ ابلی ہوئی اور پھیکی تھیں، بالکل بدمزہ۔ اہل خانہ سے چھپا کر انھیں بھی پھینک دیا۔ اس کے بعد کچھ ڈیزرٹ تھے از قسم کیک اور آئس کریم وغیرہ۔ چلیے جی تھینکس گیونگ عشائیہ اختتام کو پہنچا۔

سیاہ جھے کی کہانی

بعدازاں خاتون خانہ سے ٹرکی پکانے کی ترکیب پوچھی۔ انھوں نے بتایا، پوری ٹرکی کو پہلے اوپر سے زیتون کا تیل لگائیے۔ پھر اوپر ہی تھوڑا سا نمک مل دیں۔ لیموں بھی لگا دیجیے پھر پوری ٹرکی اوون میں رکھیے۔ لیجیے ٹرکی تیار! اب وہ ذرا سا تیل زیتون اور نمک اتنے بڑے پرندے کا کیا بگاڑتا؟ پھر بڑے شوق سے سویاں بنانے کی ترکیب پوچھی۔ اس نے جھٹ ٹوکری سے پورا پیٹھا نکال کر دکھا دیا۔ بنانے کا طریقہ یہ تھا: اس کو اوون میں پکایا۔ پھر چھری اس کے اندر پھیر پھیر کر باہر نکال لیا۔ قدرتی طور پر اس کی شکل سویوں جیسی ہو جاتی جس پر ہم بھی دھوکہ کھا گئے۔

تھینکس گیونگ کا کھانا جونہی ختم ہو، ایک تجارتی تہوار ''سیاہ جمعہ'' (Black Friday) شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کا آغاز رات ۱۲ بجے ہوتا تھا۔ لیکن پیسے کے پجاریوں کو پیسا کمانے کی اتنی جلدی ہے کہ انھوں نے چار گھنٹے بڑھا دیے۔ اس پر بہت سے لوگوں نے احتجاج کیا۔ یہ تحریک چلائی گئی کہ لوگ اس میں شرکت نہ کریں۔ وجہ یہ تھی کہ خاندان جو سال میں صرف ایک بار اکٹھا ہوتا ہے، وہ مل کر کھانا نہیں کھا پاتا اور بلیک فرائیڈے میں شرکت کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

دراصل دکانداروں کو جلدی ہوتی ہے کہ تھینکس گیونگ کا سامان نکالا جائے اور وہ اپنے اسٹور کرسمس کی اشیا سے بھر سکیں۔ تھینکس گیونگ سے وابستہ چیزوں میں بھی دنیا جہان کا سامان شامل ہے مثلاً کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس، برتن، ہر قسم کے فون، کمپیوٹر، کھلونے غرض دنیا کی ہر شے۔ اب یہ چیزیں نکالنی ہوتی ہیں۔ دکان دار ان اشیا پر قیمت سے دوگنا چوگنا وصول کر چکے لیکن کچھ سامان باقی بچ گیا۔ یہی ''سیاہ جمعہ'' کی رات سستے داموں فروخت ہوگا۔ یہ تقریب ہمیشہ ماہ نومبر میں جمعہ کی رات کو ہی آتی ہے۔

ایک اسٹور میں دکان دار کہہ رہا تھا ''میں اتنی سستی چیزیں بیچ رہا ہوں کہ میرا دیوالیہ نکل گیا ہے۔ میرے لیے اندھیر ہی اندھیر ہے۔'' حالانکہ یہ لوگ پہلے آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام تک وصول کر چکے ہوتے ہیں۔

اس رات اسٹوروں کے باہر لمبی قطاریں لگتی ہیں۔ سردی کے باوجود لوگ اسٹور کے باہر رہ کر اپنے نمبر کا انتظار کرتے ہیں۔ ساری رات وہاں گزار اور دکاندار کا دیوالیہ نکال کر صبح گھر لوٹتے ہیں۔

اس رات سارا خاندان جمع ہوتا ہے۔ لہٰذا تنہا رہنے والے امریکی خصوصاً بوڑھے بہت ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میرا بھائی مکان کرائے پر دینے والی ایک امریکی کمپنی میں ملازم ہے۔ اس نے بتایا، گزشتہ سال تھینکس گیونگ کے کچھ دن بعد اسے ایک فون آیا کہ فلاں ادارے کے مکان میں جو بوڑھی عورت رہتی ہے، اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ فون کرتے ہیں تو وہ نہیں اٹھاتی، تم اس کا پتا کرو۔



امریکا کی ''ٹرکی''

یاد رہے، مغرب میں مختلف سرکاری و نجی ادارے گاہے بگاہے تنہا لوگوں کو فون کر کے ان کی زندگی کی تصدیق کرتے رہتے ہیں۔ بھائی نے کہا ''تم اپنا کارندہ بھیجو، میں چابی دے دوں گا۔'' انھوں نے ایک خاتون بھیج دی۔ اب بھائی کو اس کے ساتھ جانا تھا۔ بھائی کہتا ہے ''دروازے پر جا کر میں نے کہا، اب اندر خود جاؤ، میں نہیں جا سکتا۔''

وہ خاتون جب اندر گئی تو دیکھا کہ بوڑھی کا کمزور سا وجود پھول کر کپّا ہو چکا۔ ہاتھ میں فون تھا۔ عورت زمین پر اوندھی گری ہوئی تھی۔ بھائی پہلے بھی عورت کو دیکھ چکا تھا۔

وہ بہت کمزور سی تھی۔ بھائی نے بتایا "تھینکس گیونگ کے دنوں میں کئی مرد و زن تنہائی سے جنم لینے والے ڈپریشن کی وجہ سے موت کا شکار ہوتے ہیں۔ پتا نہیں وہ غریب کس کو فون کر رہی تھی۔ شاید اس کا فون کوئی نہیں اٹھاتا ہوگا۔ چناں چہ وہ اسی غم میں جان دے بیٹھی۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

فضول خرچی کا نتیجہ

جب بلیک فرائیڈے اختتام کو پہنچے تو کرسمس کی تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ کرسمس کے ڈھیروں سامان سجاوٹ اور اصلی و نقلی کرسمس ٹریز (مصنوعی درخت) سے اسٹور اور مال بھر جاتے ہیں۔ مصنوعی درخت اسٹور کے اندر اور اصلی باہر ہوتے ہیں۔ لوگ کرسمس ٹری خرید کر گھر میں رکھتے ہیں۔ سارا سال گھر والوں کو جو تحائف ملیں یا وہ ایک دوسرے کو دیں، انھیں کرسمس ٹری پر سجایا جاتا ہے۔



کرسمس ٹری اسٹوروں کے اندر بھی مختلف چیزوں سے سجائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہرن، قمقمے، گولیاں، ٹافیاں اور کھانا کھانے اور بنانے کے برتن! یہ تھینکس گیونگ کے برتنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اب لباس، جوتے یہاں تک کہ چائے اور کافی کے برتن بھی مختلف ڈیزائن کے ہوں گے۔ میں نے حیرانی سے سوچا، کیا اہل امریکا کے دماغ پر پردے پڑ گئے ہیں کہ کل کا سامان آج بے کار ہو گیا؟

اسی فضول خرچی کا نتیجہ ہے کہ امریکیوں کی اکثریت کرائے کے گھروں میں رہتی ہے۔ وہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں کہ یہ غیر ملک سے آنے کے باوجود کچھ عرصے میں اپنے مکان بنا لیتے ہیں۔ میرے خیال میں مغربی معاشرہ فطرتاً فضول خرچ ہے۔ شراب نوشی اور دوسری غلط عادتوں کی وجہ سے اکثر امریکی مقروض رہتے ہیں۔ بھائی نے ایک جوڑے کا بتایا کہ انھوں نے کرایہ مکان مقررہ مدت تک ادا نہ کیا۔ تب بھائی نے انھیں نے کہا، اب مکان چھوڑ دیں کیونکہ کمپنی کا یہی اصول ہے۔ وہ سخت گھبرائے اور منتیں کرنے لگے۔

بھائی نے انھیں کہا "دیکھو تمھارے پاس نئی کار ہے۔ (امریکی ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ کار نہایت قیمتی ہو) اسے بیچ کر کوئی مناسب قیمت کی کار خرید لو۔ اور جو رقم بچ جائے، اس سے کمپنی کے واجبات ادا کرو اور یہاں رہتے رہو۔" انھوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور بعد ازاں بھائی سے کہنے لگے "تم کتنے اچھے ہو کہ ہمیں یہ مناسب مشورہ دیا۔ حالانکہ پہلے تم ہمیں نکال رہے تھے۔"

بھائی نے کہا "وہ قانون تھا اور یہ انسانیت ہے۔"

امریکا میں کرائے داری کے قوانین بہت سخت ہیں۔ مثال کے طور پر اگر مقررہ تاریخ سے ایک دن بعد بھی کرایہ ادا کیا

جانے تو پچاس ڈالر فالتو ساتھ ہونے چاہئیں۔

بات ہو رہی تھی کرسمس کی! میں نے دیکھا کہ گھر باہر سے سجے رہے ہیں۔ راتوں کو قمقمے روشن کیے جاتے۔ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ کا مجسمہ گھر میں لگتا۔ ایک طرف حضرت مریم نیلے اسکارف میں کھڑی ہیں اور دوسری طرف نعوذ باللہ شاید یوسف نجار ہوگا جو گلابی رنگ کی چادر اوڑھے کھڑا ہے۔ کرسمس کا اہم جز سانتا کلاز ہے۔ اسٹوروں میں سانتا کلاز کے لاتعداد بت، سجی ہوئی گھنٹیاں اور چمکتے ہوئے ہرن دیکھے۔ کرسمس سے پہلے ماں باپ بچوں سے کہتے ہیں "اچھے بن جاؤ اور ہمیں تنگ نہ کرو تو سانتا کلاز تمھیں تمھاری پسند کا تحفہ دے گا۔"

سانتا کلاز کے متعلق مشہور ہے کہ کرسمس کی رات وہ ہرنوں والی بگھی پر تحفے سجائے آتش دان کے راستے گھر میں داخل ہوتا اور بچوں کو ان کی پسند کے تحفے دیتا ہے۔ پھر رات کو ہی آتش دان کے پاس گاجریں گرائی جاتی ہیں تاکہ ہرن انھیں کھا سکیں۔ سانتا کلاز بھی متنازع شخصیت ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ ان کا سینٹ (بزرگ) ہے۔ ترکی کے لوگ کہتے ہیں، کہ وہ ترک تھا۔ اسے بچوں سے بہت محبت تھی اور وہ بچوں کو تحفے دیا کرتا۔

معاشرتی دباؤ کا شکنجہ

اس کے بعد "ویلنٹائن ڈے" سے واسطہ پڑا جس کے متعلق پاکستانی نئی نسل مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ پھر ایسٹر کا نزول ہوا۔ یہ بھی عجیب تہوار ہے۔ اس کو گڈ فرائی ڈے بھی کہتے ہیں۔ اس موقع پر سارا خاندان اکٹھے کھانا کھاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اپنا آخری کھانا حواریوں کے ساتھ کھایا تھا۔ اس کھانے کا اہم جز انڈے ہوتے ہیں اور بھیڑ، بکریاں اور چھوٹا بچہ اٹھائے ہوئے عورت!

پہلے انڈے اصلی ہوتے تھے۔ لوگ ان پر مختلف رنگ کر کے پودوں میں چھپا دیتے۔ صبح بچے پودوں سے ڈھونڈتے۔ جب تجارت نے ترقی کر لی تو ہر جسامت کا مصنوعی انڈا دستیاب ہو گیا۔ وہ کھل بھی سکتا ہے۔ اسے کھولنے پر کوئی تحفہ نکل آتا ہے۔

ایسٹر کے موقع پر بھی ہر چیز نئی خریدی جاتی ہے..... کپڑے، جوتے، پرس، زیور اور کھلونے تک۔ مدرز ڈے، فادرز ڈے اور سالگرہ، ان سب تہواروں پر بھی اتنی فضول خرچی ہوتی ہے کہ باشعور امریکی عاجز آ چکے۔ گالیاں دیتے ہیں کہ روایتی اخراجات نے ان کی کمر توڑ دی ہے۔ مگر وہ معاشرتی دباؤ کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، مجبوراً انھیں اپنی مذہبی روایات پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ ان کی طرف مارے شوق کے وہ ساری نحوستیں سمیٹنے لپکے جا رہے ہیں جو ان کا مقدر بن چکیں۔

مدرز ڈے کی حقیقت بھی پڑھ لیجیے۔ دفتر میں میری بہن کی ایک ساتھی نے کہا "کل مدرز ڈے ہے۔ میری ماں کو یہ کارڈ دے دینا۔ تمھارے گھر کے ساتھ وہ "اولڈ ہاؤس" میں رہتی ہے۔"

بہن نے کہا "میں دے دوں گی مگر بہتر ہے، تم اس سے مل لو۔ اولڈ ہاؤس تمھارے گھر کے بھی قریب ہے۔"

کہنے لگی "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پھر اس نے کون سا مجھے وقت دیا تھا؟"

☆☆☆

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں عقل دے تاکہ ہم غیر مسلموں، مشرکوں اور کافروں کے رسوم و رواج کرنے سے بچ سکیں:

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات



غمِ دنیا بھلا کے مسکرائیے

ممتاز مزاحیہ شاعر، سید ضمیر جعفری

کا دل میں اُتر جانے والا شوخ کلام

"میں سمجھتا تھا کہ ضمیر صاحب پبلک ریلیشنگ کے آدمی ہیں۔ ہر شخص کی تعریف کرنا اور اسے گرم جوشی سے ملنا ان کی عادت ہے۔ لیکن بھارت میں ان کے ساتھ پندرہ دن گزارے، تو میں شاعروں اور ادیبوں کی غیبت سننے کو ترس گیا۔ جس کی غیبت کرتا، ضمیر صاحب اس کی شخصیت کا کوئی روشن پہلو بیان کرنے لگتے۔ تب میں نے جانا کہ یہ دنیادار دراصل ایسا صوفی ہے جو انسانوں سے محبت کے علاوہ کوئی اور رشتہ استوار کر ہی نہیں سکتا۔"

ممتاز ادیب و کالم نگار، عطا الحق قاسمی کے یہ الفاظ سید ضمیر جعفری کی شخصیت بخوبی اجاگر کرتے ہیں: سید صاحب عمدہ مزاحیہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو دینہ کے قریب ایک دیہہ، چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء کو وفات پائی۔ نثر و شاعری میں آپ کی ۷۸ کتب شائع ہوئیں۔ آپ نے خصوصاً مزاحیہ شاعری میں نیا رجحان متعارف کرایا اور اسے اردو ادب میں اہم مقام عطا کیا۔ ضمیر جعفری کی مزاحیہ نظموں، غزلوں کا انتخاب پیش خدمت ہے۔

گرد نے ملتان تک اس طرح گروانا مجھے
میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے

فلسفے کا ورک بخشا ہے تو مولا سے نکل
اپنے گھر والوں پہ کچھ آسان فرمانا مجھے

اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

اسی میں ملت بیضا سما جا، گھس جا، جم جا
تیری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجہ

نہ گنجائش کو دیکھ اس میں، نہ شو مردم شماری کر
لنگوٹی کس، خدا کا نام لے، گھس جا سواری کر

عبث گننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفوس اس میں
کہ نکلے گا بہر عنوان تیرا بھی جلوس اس میں

وہ کھڑکی سے کسی نے "مورچہ بندوں" کو للکارا
پھر اپنے سر کا گٹھڑ دوسروں کے سر پہ دے مارا

کسی نے دوسری کھڑکی سے جب دیکھا یہ نظارا
زمیں پر آ رہا دھم سے کوئی تاج سردارا

اگر یہ ریلوے کا سلسلہ ایران جا پہنچے
تو سکھر پر اترتا شخص اصفہان جا پہنچے

یہ سارے کھیت کے گنے کٹا لایا ہے ڈبے میں
وہ گھر کی چارپائی تک اٹھا لایا ہے ڈبے میں

کسی پچپاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے
کسی روزن سے اک کالا سلیپر منہ کو آتا ہے

کھڑے تھے سج سنوار آتشدان تو دیکھو
یہ قوم بے سرو سامان کا سامان تو دیکھو

وہ اک رتھ میں پورا ڈاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں

خُراکی سے گھڑا روٹی سے دسترخوان لڑتا ہے
مُسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے

جو نعمت چاہ ہے جس بھاؤ بھی منگوائی جاتی ہے
نہ کافر چھیلی جاتی ہے نہ ظالم کھائی جاتی ہے

......روزے سے ہوں

مجھ سے مت کر یار کچھ گفتار، میں روزے سے ہوں
ہو نہ جائے تجھ سے بھی تکرار، میں روزے سے ہوں

ہر کسی سے کرب کا اظہار، میں روزے سے ہوں
دو کسی اخبار کو یہ تار، "میں روزے سے ہوں"

میں نے ہر "فائل" کی ڈھکی پر یہ مصرع لکھ دیا
کام ہو سکتا نہیں سرکار، میں روزے سے ہوں

اے مری بیوی مرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے مرے بچو! ذرا ہوشیار! میں روزے سے ہوں

شام کو بہرِ زیارت آ تو سکتا ہوں... مگر!
نوٹ کرلیں، دوست، رشتہ دار، میں روزے سے ہوں

تو یہ کہتا ہے کہ لحن تر کوئی تازہ غزل!
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار، میں روزے سے ہوں

کھڑاڈنر

"مفتے دعوت" پہ بلوایا گیا ہوں
پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں

نہ آئی پر نہ آئی میری باری
پلاؤ تک بہت آیا گیا ہوں

کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو
کئی میلوں میں دوڑایا گیا ہوں

ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لیے لایا گیا ہوں

بجلی کی دکاں

ہماری زندگی میں بھی ذرا سی روشنی کر دے
تری آنکھوں میں بجلی کی دکاں معلوم ہوتی ہے

سیاست میں وفاداری میرے اللہ کیا شے ہے؟
یہاں محسوس ہوتی ہے، وہاں معلوم ہوتی ہے

راجا اور راؤ

کوئی راجا نہ کوئی راؤ ہے
اصل شے مرغ کا پلاؤ ہے

دل ناداں سے کیوں الجھتے ہو
زندگی چار دن کا چاؤ ہے

چل رہی ہے مشین مغرب میں
اور مشرق میں چل چلاؤ ہے

آفریں ہے ضمیر صاحب پر
لب پہ نغمہ ہے، دل میں گھاؤ ہے

پاکستان ریلویز

ہیڈکوارٹرز آفس، لاہور

اظہارِ دلچسپی

برائے

تعیناتی مشیران

فزیبلٹی سٹڈی برائے بحالی / ترقی شاہدرہ--نارووال سیالکوٹ-- وزیرآباد اور نارووال-- چک امرو سیکشن

- [illegible]
- [illegible] RFP [illegible] www.pakrail.com یا PPRA کی ویب سائٹ www.ppra.org.pk سے [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] censc@pakrail.com [illegible]
- [illegible] 31-08-2015 [illegible] 2:00 [illegible] 2:30 [illegible]

بشارت وحید

چیف انجینئر (سروے اینڈ کنسٹرکشن)

پاکستان ریلویز ہیڈکوارٹرز، ایجرٹن روڈ، لاہور

فون: 99201625 (042)، فیکس: 99201760 (042)

PID (L) 225

Email: censc@pakrail.com, Web: www.Pakrail.com

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۳۲۵۔جی ٹمبری جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ جولائی میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔(الف) ہیروشیما پر بم گرایا گیا — (ب) تین دن بعد ناگاساکی پر

قصہ کوئز ۲۔(الف) مکی ماؤس — (ب) والٹ ڈزنی

قصہ کوئز ۳۔(الف) تاشقند — (ب) بیت المقدس

درست جوابات دینے والوں کے نام

ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، حیان مرزا (حیدرآباد)، طہ شنین (حیدرآباد)، محمد احمد (کراچی)، نائمہ تکریم (کراچی)، ہادی حسین (حیدرآباد)، راجا محمد یونس ستی (اسلام آباد)، محمد سعید خانزادہ (کشمیر)، محبوب اقبال (کبیروالا)، واشا صدیقی (ترنڈہ محمد پناہ)، زین العابدین (کوٹ سلطان)، محمد احمد (ملتان)، جاوید احمد (احمد پور شرقیہ)، ماریہ ملک (لاہور)، ثنا صغیر (لاہور)، اسامہ احمد (چکوال)، مریم فاطمہ (ساہیوال)، ثنا شفیق (چیچہ وطنی)، وقیہ بیگ (مظفر گڑھ)، مدنی ضیا (سیالکوٹ)، طوبیٰ احمد (پشاور)، ذیبی (میرپور خاص)، اروبہ سید عباس (بہاولنگر)، ساجد علی (اسلام آباد)، ثاقب شہباز (راولپنڈی)، عشرت جبیں (میرپور آزاد کشمیر)، انعم خان (کوٹ ادو)، آمنہ رمضان (خانیوال)، تنزیلہ شبیر (قصور)، ایمان شبیر (قصور)

دلچسپ معلومات اور تجزیے کا خزانہ
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

انچارج کوئز
غلام سجاد



پیش ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

آپ کو ۶ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- ثنا صغیر (لاہور)
- ثاقب شہباز (میرپور آزاد کشمیر)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتہ اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔
اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔(ایڈیٹر)

قصہ کوئز/۱

دنیا کے نقشے پر غور سے دیکھیں تو مشرق وسطیٰ میں مصر اور اردن کے درمیان خشکی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا ہے جس نے بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کے درمیان ایک رکاوٹ سی کھڑی کر رکھی تھی۔ چھ سو برس قبل مسیح مصر یوں نے ایک نہر کی کھدائی کا کام شروع کیا تاکہ مغرب کو مشرق سے ملانے کے لیے مختصر ترین بحری راستہ بنایا جا سکے۔ مصر پر ایران کا قبضہ ہوا تو ایرانی بادشاہ دارا نے بھی اس کام کو جاری رکھا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر کام ہوتے رہے مگر کوئی خواب بھی تعبیر نہ پا سکا۔ سولہویں صدی میں وینس اور نپولین نے بھی اس پر کام کیا۔ آخر کار انیسویں صدی میں یہ منصوبہ حقیقت کا روپ دھار گیا اور یہ نہر مکمل ہوئی۔

(الف) بتائیے آپ اور ہم اس نہر کو کس نام سے جانتے ہیں؟

(ب) اس نہر کا آخری اور عملی منصوبہ کس ملک کے ماہرین نے پیش کیا تھا؟

قصہ کوئز/۲

رات کو ہونے والی شدید طوفانی بارش نے بجلی فون کے تار توڑ دیے۔ بجلی میں جو بجا کھمبے سے جڑے تھے۔ صبح سویرے ایک نوجوان سب چیزوں کے عالم میں گھوڑا گاڑی پر وہاں سے گزرا تو ایک ٹوٹا ہوا تار اس کی گھوڑی سے ٹکرایا۔ وہ گھوڑا سے نیچے آ رہا۔ اسے شدید چوٹیں آئیں۔ نوجوان بمشکل تمام اٹھا اور اپنی چوٹیں سہلاتا ہوا سیدھا ٹیلی فون کے دفتر جا پہنچا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ٹیلی فون کمپنی کی لاپروائی سے یہ حادثہ رونما ہوا ہے لہٰذا اسے ہرجانہ ادا کیا جائے۔ کمپنی کا موقف یہ تھا کہ اس کا ٹیلی فون کا نظام بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے اور یہ کہ ان کے نیٹ ورک کا کوئی بھی تار نہیں ٹوٹا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ سب جو تار گرا تھا ایک پادری کے بیٹے کا ہے۔ اس نوعمر لڑکے نے قصبے کے بڑے حصے میں اپنا ٹیلی فون کا نظام قائم کر رکھا ہے جس کے ممبران شمار کا رہنے والا یہ چھوٹا سا بچہ اس حادثے پر اپنے پادری باپ سے خوب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد پتو اور منصوبے بنانے میں لگ گیا۔ چھوٹی عمر میں اس نے بہت سی ایجادات کر لی تھیں۔ کبھی لالٹین سے کیمرہ بنا لیا کبھی سورج کی روشنی سے گھنٹی بجائی اور کبھی ایسا کیمرہ تیار کر لیا کہ جس سے سوتے ہوئے بھی تصویر کھینچی جا سکتی تھی۔ جوتوں کی پالش تیار کرنے سے لے کر شہد پہنچنے تک اس نے بہت سے کام کیے مگر اس کی زندگی کا اصل کارنامہ کچھ اور ہی تھا۔ یہ بچہ بڑا ہوا تو گلاسکو کالج اور یونیورسٹی کالج لندن گیا۔ برقیات کی تعلیم حاصل کی اور اسی میں درجہ کمال تک پہنچا۔ ۲/اکتوبر ۱۹۲۵ء اس کی زندگی کا خوشگوار ترین دن تھا۔ جب اس نے ایک مشین کے سامنے ایک مصنوعی چہرہ رکھا اور پھر اس چہرے کی تصویر کو بھیجنے اور منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعے کے ساتھ ہی انسان نے ابلاغ کی دنیا میں غیر معمولی جست لگائی۔

(الف) بتائیے ۲/اکتوبر ۱۹۲۵ء کو کون سی چیز ایجاد ہوئی؟

(ب) موجد کا اصل نام کیا تھا اور یہ کہ اس کا تعلق کس ملک سے تھا؟

قصہ کوئز/۳

چرواہا اپنی بھیڑیں چرانے کی غرض سے جنگل میں لیے ہوئے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک ایسے درخت پر پڑی جو گزشتہ رات شدید بارش کے باعث جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ چرواہے نے درخت کے قریب جا کر بغور جائزہ لیا تو اسے نیچے ایک سیاہ رنگ کا مادہ سا نکلتا دکھائی دیا۔ اس نے اسے ہاتھ لگایا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نشان لگانے کے لیے یہ مادہ ویسے سے کہیں بہتر ہے۔ لہٰذا وہ اس مادے سے بھیڑوں پر نشان لگانے لگا۔ بعد میں اس مادے کو گریفائیٹ کا نام دیا گیا۔ گریفائیٹ دراصل اتفاقی دریافت ہے جو چرواہے کے حصے میں آئی۔ بعد میں گریفائیٹ کی بدولت علم اور آرٹ کی دنیا میں بہت مفید کام ہوئے اور آج تک ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ گریفائیٹ سے کون سی مفید چیز بنتی ہے؟

(ب) یہ اتفاقی واقعہ کس ملک میں پیش آیا؟

◆◆◆



انگریز کا سلطان ٹیپو کو خراجِ عقیدت

صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی غیروں پر شیرِ میسور کی دھاک بیٹھی ہے

اعجاز شیخ

۴ مئی ۱۷۹۹ء تاریخ میں وہ سیاہ دن ہے جس نے برصغیر کو دو صدیوں سے زائد عرصہ تک انگریزوں کی غلامی میں دھکیل دیا۔ اس بات پر مؤرخین متفق ہیں کہ اگر سلطان ٹیپو کو شہید نہ کیا جاتا، تو ہندوستان کی تاریخ آج مختلف ہوتی۔ اسے ہم بدبختی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کو اگر کہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا، تو اس میں بے ضمیر غدارانِ وطن نے اہم کردار ادا کیا۔ راقم کو کچھ عرصہ قبل انگلینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت سلطان ٹیپو شہید کے زیرِ استعمال اشیا دیکھی جائیں۔ میں وہاں مقیم اپنے بیٹے کے ہمراہ سنٹرل لندن میں واقع برٹش میوزیم پہنچا۔ دروازے پر کھڑے گارڈ سے جب میں نے پوچھا کہ سلطان ٹیپو شہید کے متعلق اشیا کیا ادھر ہی رکھی ہیں؟ گارڈ کہنے لگا ''یو مین گریٹ سولجر؟'' یعنی آپ اس عظیم سپاہی کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟

انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن سلطان ٹیپو کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ شہید کی شجاعت، فراست اور دلیری کی دھاک آج بھی غیروں کے دلوں پر بیٹھی ہے۔ نہیں یاد تو ہم مسلمانوں کو! برٹش میوزیم میں سلطان ٹیپو شہید اور اس کے والد حیدر علی کی تلواریں محفوظ ہیں جن کے دستے قیمتی یاقوت، زمرد اور ہیروں سے مرصع ہیں۔ ان کی چمک میں صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا۔ ادھر ہم ہیں کہ اپنوں کی میراث کو سنبھالنا تو درکنار اسے بچا بھی نہ سکے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کا باعث جہاں میر صادق بے وفا بنا، وہاں پورنیا، میاں غلام علی، بدرالزمان جیسے ضمیر فروشوں نے بھی اپنے ذاتی مفادات کی خاطر برصغیر کو اندھیروں میں دھکیل دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی انگریزوں کو ان وطن فروشوں سے نفرت ہے۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء بوقت دوپہر جب سلطان ٹیپو داد شجاعت دیتے ہوئے اپنے رب کے ہاں سرخرو ہوئے، تو تاریخ بتاتی ہے۔ بادلوں کی مہیب گرج اور بجلی کی خوف ناک

کڑک نے زمین کو ہلا دیا۔ خصوصاً سلطان کے دیوان خانے، محل سرا اور مسجد اعلیٰ کے ساتھ بہتے دریائے ویری میں اس قدر طغیانی آگئی کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب کچھ بہا کر لے جائے گی۔ ایسی طغیانی نہ کسی نے پہلے دیکھی تھی نہ سنی۔

جب سلطان شہید ہو گئے، تو شہر میں لوٹ مار، قتل و غارت کا ایسا بازار گرم ہوا جسے دیکھ کر آسمان بھی رو دیا۔ محمود خاں بنگلوری اپنی کتاب "تاریخ سلطنت خداداد میسور" میں لکھتے ہیں کہ سلطان ٹیپو کے خلاف جنگ میں شریک کرنل ونزلی نے اپنے بھائی لارڈ ونزلی کو جو واقعات لکھ کر بھیجے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد شاید ہی کوئی ایسا مکان ہو گا جو لوٹ مار سے بچ گیا۔ ہمارے کیمپ کے بازار میں لوٹی ہوئی اشیا اتنے سستے داموں سپاہی فروخت کر رہے تھے کہ بیش قیمتی موتی شراب کے ایک پیالے کے عوض دے دیے گئے۔ ایک فوجی ڈاکٹر نے ایک سپاہی سے دو بازو بند خریدے جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، ان دونوں میں سے ایک قدرے کم قیمت کا تھا، اسے بعد ازاں حیدر آباد کے ایک جوہری نے تیس ہزار پاؤنڈ میں خریدا (اندازہ لگائیے کہ آج سے دو سو سولہ سال پہلے اس رقم سے کیا خریدا جا سکتا تھا)

دوسرے بازو بند کے متعلق جوہری نے بتایا کہ وہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی اسے خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ یہ لوٹ مار میں شریک صرف ایک عام سپاہی کا تذکرہ ہے۔ دوسرے بڑے افسروں نے کیا کچھ لوٹا، اس کی تفصیلات رقم کرنے کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ سلطان کی ایک بیش بہا تلوار جنرل برڈ کو انعام میں دی گئی (راقم کا گمان ہے کہ یہی تلوار میں نے برٹش میوزیم میں دیکھی) لارڈ ونزلی کو حصے کے طور پر ایک ہیروں کا جھومر بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ سلطان کی پگڑی دی گئی جس میں بیش قیمتی موتی جڑے تھے۔ جنرل ہارس کے حصے میں ۱۴۴۹۰۲ سونے کی اشرفیاں آئیں جس کی موجودہ قیمت کروڑوں روپے میں جا پہنچتی ہے۔

یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مملکت خداداد سے غداری کرنے والوں کا کیا انجام ہوا، وہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے باعث درس ہے کہ بہت سے غداران مملکت خداداد کسی نہ کسی وجہ سے اتفاقاً مارے گئے یا ناگہانی آفتوں کا شکار ہوئے اور اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

جہاں سلطان ٹیپو کے بہت سے جانثاروں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر شہادت کا رتبہ پایا وہاں حسین علی بن قطب الدین کا تذکرہ کرنا مناسب ہو گا۔ یہ بہادر انسان آخری سانس تک اپنے مورچے پر ڈٹا رہا۔ بالآخر ایک توپ کا گولہ سینے میں لگا اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ اس کی نعش جب سلطان ٹیپو شہید کے سامنے لائی گئی تو سلطان اُسے دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ اس کا نکاح ایک شب پہلے یعنی ۳ مئی ۱۷۹۹ء کو ہوا تھا۔

کتاب "رفعت خوان حیدر" کا مصنف لکھتا ہے، جب اس نوجوان دلہا کی نعش حرم لائی گئی، تو اس کی ایک شب کی دلہن کی آہ و زاری دیکھنے والوں کا کلیجا پھٹ رہا تھا۔ اس سوگوار دلہن نے تمام عمر نوحہ گری کرتے گزار دی۔ اس کی زبان سے خاوند کی شہادت ۴ مئی ۱۷۹۹ء کے واقعات آخری دم تک لوگ سنتے رہے۔ ملت اسلامیہ کے غدار میر صادق کو شہادت کے دوسرے دن ایک سپاہی احمد خاں نامی نے انتقامی طور پر جہنم واصل کیا۔ جہاں میر صادق قتل ہوا وہیں اس کی نعش بغیر غسل و کفن دفنا دی گئی۔ سلطان ٹیپو شہید کے مشرقی دروازے کے قریب آج بھی لوگ اس غدار کو ملامت کرنے کے لیے جوتیاں مارتے اور پیشاب سے بھری بوتلیں انڈیل کر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ سراج الدولہ سے غداری کرنے والا بھی میر جعفر تھا۔ علامہ اقبال نے اس کے متعلق کس قدر سچ کہا۔

جعفر از بنگال میر از دکن

◆◆◆



کتابوں کی کہکشاں

نام کتاب: حرا، ہجرت اور خدمت۔ مصنف: ڈاکٹر آصف محمود جاہ۔ ناشر: علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰۔ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۲۳۳۶۔ قیمت: ۱۰۰۰ روپے۔

ایک خوبصورت قول ہے: ”آپ ہر کسی کی مدد نہیں کر سکتے، لیکن مصیبت زدہ کی امداد سے اس کی زندگی ضرور بدل سکتے ہیں۔“ وطنِ عزیز کے ممتاز سماجی راہنما، ڈاکٹر آصف محمود جاہ اس قول پر صدقِ دل سے یقین رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے، آواران میں کوئی قدرتی آفت آئے، ہمارے بلوچ بھائی زلزلے کا نشانہ بنیں یا خیبر پختونخوا میں سیلاب حملہ کرے، ڈاکٹر صاحب ان لوگوں کی صف اوّل میں ہوتے ہیں جو مصیبت میں پھنسے ہم



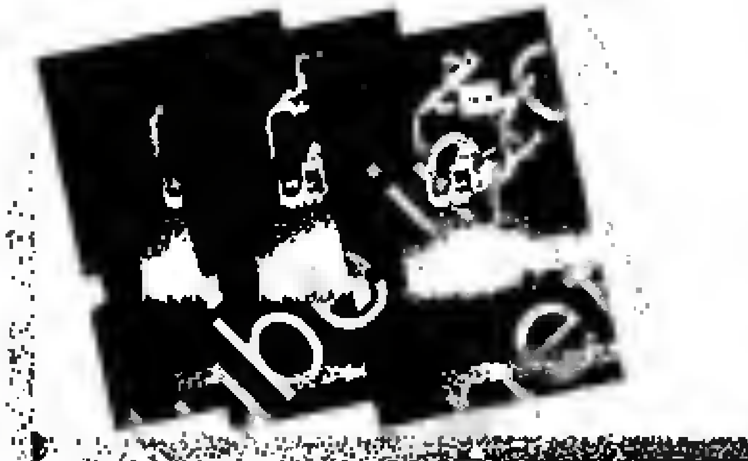
وطنوں کے لیے دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پچھلے کئی برسوں سے پورے پاکستان میں سماجی فلاح و بہبود کی سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی قائم کردہ فلاحی تنظیم، کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کے زیرِ اہتمام غریبوں اور متاثرین کے لیے متفرق منصوبے چل رہے ہیں۔ کہیں انھیں سستے داموں یا مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے، تو کہیں غربا کو مکان بنا کر دیے جاتے ہیں۔ گویا ڈاکٹر آصف ہزاروں دعائیں سمیٹ کر جنت الفردوس میں عالی شان محل تعمیر کر چکے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے وہ منفرد جذبات، تاثرات اور واقعات بیان کیے ہیں جن سے خدمتِ انسانیت کرتے ہوئے انھیں مختلف علاقوں میں واسطہ پڑا۔ کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شمالی وزیرستان میں انجام پائی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے میں عالمی تنازعات کا ذکر ہے۔ تیسرے میں ہجرتوں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ چوتھے میں پنجاب اور تھر میں امدادی کاموں کی تفصیل ہے اور پانچویں حصے میں کالم نگاروں کے منتخب کالم شامل ہیں۔

غرض یہ کتاب جذبہ خدمت سے سرشار ان مخیر اور ہمدرد پاکستانیوں کی عظیم داستانیں عیاں کرتی ہے جو ایثار و ہمدردی سے دکھی ہم وطنوں کی مدد کر رہے ہیں۔ کتاب کی پیشکش اور کاغذ عمدہ ہے۔

نام کتاب: سو عظیم مسلم خواتین۔ مرتبہ: میر بابر مشتاق۔ ناشر: عثمان پبلی کیشنز، بی ۱۷، فیض آباد، ماڈل کالونی، کراچی۔ فون: ۰۳۳۶۷۲۲۰۱۰۱، قیمت: ۴۹۰ روپے۔



یہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ مغربی معاشروں میں یہ غلغلہ بلند ہوا کہ مردوں نے خواتین کو محکوم بنا رکھا ہے۔ چناں چہ مغرب میں "تحریک آزادی نسواں" چل پڑی۔ اس تحریک کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں عورت کے مادر پدر آزاد ہونے سے فحاشی نے فروغ پایا اور خاندان اور ازدواجی زندگی کا تار و پود بکھر گیا۔

مغربی تحریک آزادی نسواں کے جراثیم اسلامی معاشروں تک بھی پہنچے۔ انھوں نے طبقہ امرا کو تو متاثر کیا، مگر متوسط و نچلے طبقے اس بلا سے محفوظ رہے۔ وجہ یہ ہے کہ دین اسلام میں یہ جھگڑا ہی موجود نہیں کہ مرد برتر یا عورت؟ اسلام نے مرد اور عورت، دونوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیے اور اعلان کر دیا کہ ہر مسلمان (مرد یا عورت) اپنے کیے کا خود ذمے دار ہے۔

تاہم مغربی تحریک آزادی نسواں سے متاثر پاکستانی وقتاً فوقتاً اسلامی حقوق و فرائض کو "پابندیاں" اور "زنجیریں" قرار دے کر مسلم خواتین کو "رہا" کرانے کی سعی کرتے ہیں۔ مصنف نے انھی گمراہ پاکستانیوں کو عقل سلیم سے نوازنے کے لیے زیر تبصرہ کتاب تصنیف فرمائی ہے۔

اس منفرد کتاب میں تاریخ اسلام کی ان سو عظیم مسلم خواتین کا تذکرہ موجود ہے جنھوں نے اپنی فکر و عمل سے نسوانی حقوق کے فرائض اجاگر کیے اور انسانی معاشروں میں عورت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ان خواتین میں قابل تعظیم امہات انبیا، امہات المومنین شامل ہیں، تو بنات رسولؐ اور صحابیات بھی جن کا عمل و کلام آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ جلیل القدر تابعیات، بزرگ خواتین، حکمران اور عظیم مائیں، مجاہدات کا تذکرہ بھی کتاب کی زینت و خوبی میں اضافہ کرتا ہے۔

ان پاک باز خواتین کی خوبیوں سے مالامال زندگیاں آج کی مسلم عورتوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ہر پاکستانی عورت کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مرتب نے یہ کتاب تصنیف کر کے زبردست خدمت انجام دی ہے۔ پیش کش معیاری اور عمدہ ہے۔

٭٭

نام کتاب: انسائیکلوپیڈیا مکتوبات رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ مؤلف: علامہ عبدالستار عاصم۔ ناشر: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، یثرب کالونی، بینک اسٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ۔ قیمت: ۲۰۰۰ روپے۔



یہ مارچ ۶۲۸ء کی بات ہے جب قریش مکہ اور نبی کریمؐ کے مابین دس سالہ معاہدہ امن (حدیبیہ) انجام پایا۔ یہ معاہدہ بابرکت ثابت ہوا کیونکہ نہ صرف مسلمان امن و امان سے رہنے لگے بلکہ اشاعت اسلام بھی ممکن ہوئی۔ جلد ہی رسول اللہؐ نے

پڑوسی ممالک کے حکمرانوں اور عرب سرداروں کو خطوط بھجوائے اور انھیں دعوت اسلام دی۔ زیر تبصرہ کتاب میں یہی مقدس خطوط جمع کیے گئے ہیں۔

نبی کریمؐ کے یہ خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے مسلمانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ دین کی خاطر کیا طریق کار اپنایا جائے۔ ان خطوط میں احساس تفاخر یا دھونس نظر نہیں آتی بلکہ رحمت اللعالمینؐ نے محبت، نرمی اور شفقت کا رویہ اپنایا۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

وجہ یہ کہ مغربی مورخین اکثر ہمارے دین پر الزام لگاتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ مگر نبی کریمؐ کے خطوط آشکار کرتے ہیں کہ آپؐ نے نہایت پرامن انداز میں غیر مسلم حکمران کو دعوت اسلام دی اور انھیں صراط مستقیم کا راستہ دکھایا۔

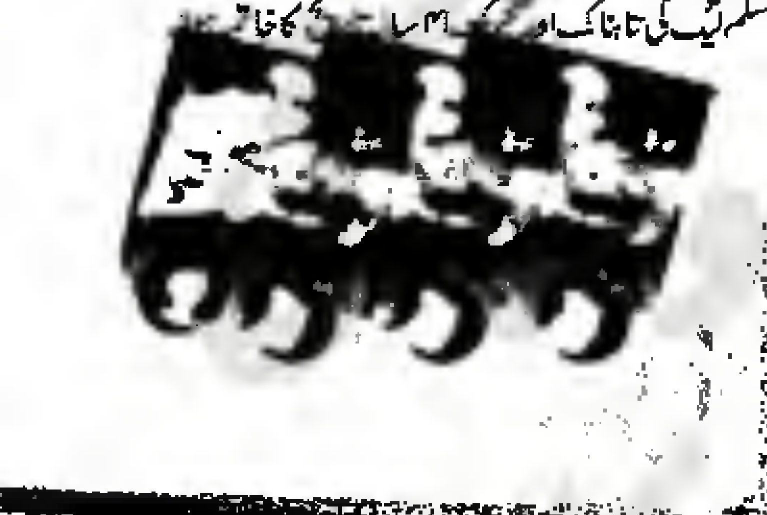
کتاب میں اس زمانے کے عالمی حالات، قدیم مکتوبات کے انداز، معاہدات رسول اللہؐ اور فخر کائناتؐ کے سفرا کا بھی جامع تذکرہ موجود ہے۔ لہٰذا یہ بجا طور پر انسائیکلوپیڈیا مکتوبات رحمت للعالمینؐ کہلائی جا سکتی ہے۔ مؤلف نے اسے مرتب کرنے میں جانفشانی و دیانت سے کام لیا ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ تاریخ اسلام کا ایک اہم گوشہ اجاگر کرنے والی اس قیمتی کتاب کو اپنی لائبریری کا حصہ ضرور بنائیے۔ تاہم قیمت کچھ کم رکھی جاتی تو مناسب تھا۔

☆☆

نام کتاب: تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔
مرتب: آزاد بن حیدر۔ ناشر: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، فون نمبر: ۳۲۲۱۲۹۷۲۲۔ کراچی۔ قیمت: ۱۵۰۰ روپے۔

یہ ۱۸۸۶ء کا واقعہ ہے جب سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سماجی تنظیم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد مسلمانان ہند کو جدید تعلیم کی خوبیاں سے روشناس کرانا تھا۔ رفتہ رفتہ قائدین تنظیم کو محسوس ہوا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ایک سیاسی جماعت بھی تشکیل دینی چاہیے۔ چناں چہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ یہی وہ مبارک جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم سے مسلمانان ہند نے ایک آزاد مملکت، پاکستان کا تحفہ حاصل کیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری اجلاس ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ قائداعظم کی زیر صدارت ہونے والا آخری اجلاس تھا۔ اس میں جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا: پاکستان مسلم لیگ اور بھارت کی مسلم لیگ۔ یوں آل انڈیا مسلم لیگ کی تابناک اور تحریک [illegible] ۴۱ سالہ تاریخ کا خاتمہ



پچھلے اڑسٹھ برسوں میں مختلف مؤرخین اور دانشور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں، جلسے جلوسوں اور دیگر سرگرمیوں کی تفصیل اپنی کتب میں تحریر کر چکے۔ مگر یہ معلومات سیکڑوں کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ اب تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن، جناب آزاد بن حیدر نے یہ معلومات زیر تبصرہ قیمتی کتاب میں مجتمع کر کے اہم قومی خدمت انجام دی ہے۔

جناب آزاد بن حیدر ۱۹۳۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی سے تحریک آزادی پاکستان میں حصہ لیا۔ تعلیم مکمل کر کے کراچی منتقل ہو گئے اور وہاں سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اب شہر قائد میں ایک بزرگ راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے زیر تبصرہ کتاب چھے برس کی محنت شاقہ کے بعد

مرتب کی ہے۔ بیان کے جذبہ حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ ساڑھے گیارہ سو صفحات پر مشتمل ضخیم تاریخی دستاویز ہے۔ آخر میں ایک اشاریہ اس کی شان بڑھاتا ہے۔ تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والے اس منفرد کتاب کا لازماً مطالعہ کریں۔ اس کی پیش کش عمدہ ہے اور قیمت بہت مناسب!

☆☆

کتاب: اسلامی تصوف۔ مصنف: سید احمد عروج قادری۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ڈی۔ ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰۔ قیمت: درج نہیں۔



اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر اور شر کا مجموعہ بنایا ہے۔ بعض انسان خیر کی راہ پر چلتے اور کچھ شر کے غلام بن جاتے ہیں۔ انسان کو درست راستہ دکھانے میں تصوف بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بعض مسلمان تصوف کو نہیں مانتے مگر تاریخ اسلام میں اس کی اہمیت ثابت ہے۔ اسی امر کو مصنف نے زیر تبصرہ کتاب میں بخوبی اجاگر کیا ہے۔ سید عروج احمد قادری (۱۹۱۳ء۔۱۹۸۶ء) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ کے مدرسہ الہدیٰ سے دینی علوم حاصل کیے۔ ۱۹۴۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے آپ کو اپنے ماہنامہ رسالے "زندگی" کا مدیر مقرر کیا۔ اسی رسالے میں سید عروج احمد نے اسلامی تصوف پر جو مضامین قلمبند کیے، وہ زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں ڈھل گئے۔

مرحوم کی تحقیق کے مطابق تصوف کی تین اقسام ہیں: ملحدانہ، فلسفیانہ اور اسلامی۔ اسلامی تصوف وہ ہے جسے اختیار کرنے والے شریعت پر عمل کریں۔ جبکہ ملحدانہ تصوف کے قائل منافق مسلمان ہیں۔ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج پر یقین نہیں رکھتے اور مادر پدر آزادی اختیار کر لیتے ہیں۔

اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں اختلافات جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۲۹۴ صفحات کی یہ کتاب جامع معلومات پیش کرتی ہے۔ پیش کش اور کاغذ عمدہ ہے۔

☆☆

نام کتاب: آہ بے تاثیر ہے ..... مصنف: عبداللہ طارق سہیل۔ ناشر: ایڈن بک ہاؤس، لاہور۔ ملنے کا پتا: کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔



[illegible] مارچ ۲۰۰۷ء تا دسمبر ۲۰۱۱ء کے درمیان روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوئے۔ ان کالموں کے خالق، جناب عبداللہ طارق سہیل ایک نظریاتی دانشور ہیں اور سنجیدہ، باشعور اور علمی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اخبار سے فنی ادارت پر کامل دسترس رکھنے کی وجہ سے بھی آپ میڈیا کے حلقوں میں معروف ہیں۔

یہ کالم پاکستانی تاریخ کے پرآشوب دور میں لکھے گئے۔ مشرف دور حکومت اور پھر پیپلز پارٹی کے اقتدار میں خوبیوں نے

کم ہونے یا چند خامیوں کا انبار لگ گیا۔ افسوس کہ حکمران زیادہ تر خرابیوں پر قابو نہ پا سکے اور اپنے دامن پر بدنما دھبے لیے ایوانِ حکومت سے رخصت ہوئے۔

اِن پانچ سالہ دور میں جناب عبداللہ طارق سہیل نے اپنے کالموں میں بڑے منفرد انداز میں سرکاری کوتاہیوں کو نشانہ بنایا۔ کبھی طنز کے تیر برسائے، تو کبھی مزاحیہ انداز میں چٹکیاں بھریں۔ اس طریقے سے وہ بے ضمیروں کے لتے لیتے چلے گئے۔ کالموں میں گناہ گاروں کے نام نہیں ہوتے بلکہ طرزِ تحریر سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پردہ اخفا میں کون ذات شریف پوشیدہ ہیں۔

یہ کام صرف سیاسی موضوعات پر نہیں بلکہ ہمارے ممدوح نے سائنس و ٹیکنالوجی، ادب، عمرانیات، تعلیم و تربیت، تاریخ اور معاشیات پر بھی خامہ فرسائی کی اور قارئین کو مفید معلومات کا تحفہ دیا۔ کالموں کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

"یہ کس نے کہا، امریکا پاکستان کو ختم کرنا چاہتا ہے؟ پاکستان نہایت کارآمد غلام ہے۔ غلام کو جوتے رسید کیے جاتے ہیں، جیب میں خنجر رکھا جاتا ہے، وہ مرغا بھی بنتا ہے لیکن اسے جان سے نہیں مارا جاتا۔ امریکا پاکستان کو کبھی ختم نہیں کرے گا۔"

٭٭٭

"ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ بھارت ایک کمزور پڑتا وفاق ہے جس میں جا بجا قالت اٹھتی ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ بھارت میں ہندو قوم پرستی دن بدن مضبوط ہو رہی ہے۔ "ہندوتوا" صرف سنگھ پریوار کا اجارہ نہیں، اس میں سیکولر کانگریس بھی حصہ ہو چکی۔"

کتاب خوبصورت انداز میں طبع ہوئی ہے۔ شستہ و لطیف طنز و مزاح کے شائق قارئین اسے مرغوب پائیں گے۔

٭٭٭

نام کتاب: حیاتِ قائداعظم. تالیف: پروفیسر سعید راشد علیگ. ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ، جہلم. فون: ۰۳۲۳۔۵۲۲۹۳۱۔ قیمت: ۳۹۰ روپے۔

ایک بار کسی صحافی نے گاندھی جی سے پوچھا کہ پاکستان بننے کے کیا امکانات ہیں؟ وہ کہنے لگے "اگر مسلمانوں سے جناح چھن جائے، تو وہ کبھی پاکستان نہیں بنا سکتے۔" سب سے بڑے حریف کی یہ گواہی قائداعظم محمد علی جناح کی عظیم شخصیت کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ یہ بات سولہ آنے سچی ہے کہ خدانخواستہ مسلمانانِ ہند کو قائداعظم کی دلیرانہ اور دیانت دار قیادت میسر نہ آتی تو قیامِ پاکستان نہایت کٹھن مرحلہ بن جاتا۔

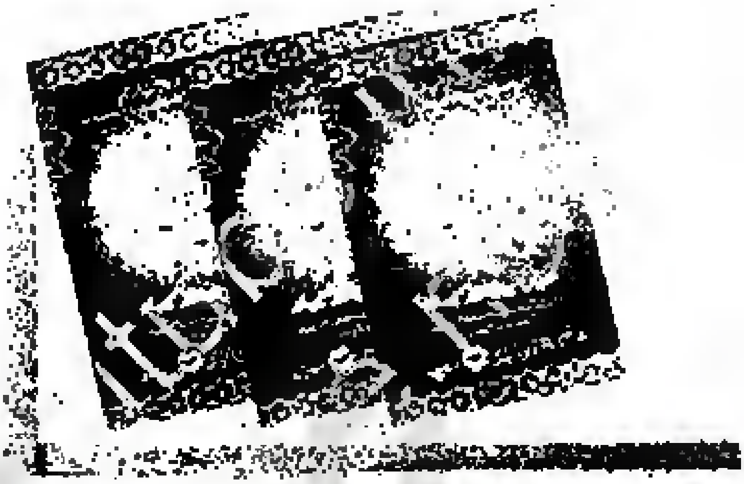
جناب پروفیسر سعید راشد علیگ ملٹری کالج جہلم سے وابستہ رہے ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے آپ نے قائداعظم کی شخصیت میں جن خوبیوں کا مطالعہ کیا، وہ زیرِ تبصرہ کتاب میں



جمع ہو گئیں۔ یہ تحقیقی شہ پارہ واضح کرتا ہے کہ بانی پاکستان نے کیونکر انگریزوں، ہندوؤں اور مخالف مسلم لیڈروں سے زبردست جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئے۔ اس لڑائی میں اخلاقی خوبیاں ہی ان کا بہترین اور طاقتور ہتھیار تھیں۔

کتاب میں سے بعض واقعات ایک مضمون کی صورت "آزادی نمبر" کا حصہ بن چکے۔ وہ قائداعظم کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر کماحقہ روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ کتاب ناشر نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں شائع کی ہے۔ نایاب تصاویر کی شمولیت نے اس کی افادیت دوچند کر دی ہے۔ اس قیمتی تحفے کو اپنے کتب خانے کا حصہ ضرور بنائیے۔

نام کتاب: مختصر ترین خلاصہ قرآن
مولف: میجر (ر) سید ذوالفقار حسین شاہ
ناشر: تعلیم القرآن اکیڈمی، مکان نمبر ۳۲۰، گلی نمبر ۳۴، سیکٹر ۱/۹ جی، اسلام آباد
ہدیہ: ۱۰۰ روپے



قرآن پاک کو تمام الہامی کتابوں میں یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ کئی صدیاں گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ حال ہی میں برمنگھم یونیورسٹی میں دریافت شدہ قرآن پاک کے ۱۴۰۰ سو سالہ قدیم نسخے نے اس امر کی تصدیق کر دی۔ اس قدیم ترین نسخے میں موجود تمام آیات قرآن پاک کی موجودہ آیتوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔

قرآن پاک حکمت و دانش کی باتوں سے مالا مال ہے۔ اسی لیے مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اس مقدس کتاب سے راہنمائی پاتے اور اپنی زندگیاں سنوار لیتے ہیں۔ قرآن پاک کو بآسانی سمجھنے اور سمجھانے کے لیے میجر (ر) سید ذوالفقار حسین شاہ نے زیر تبصرہ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ اپنی طرز کی منفرد کاوش ہے۔

میجر صاحب فوج ہی میں تھے، تو لکھنے لکھانے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد میں تعلیم القرآن اکیڈمی کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ قرآن پاک کی نشر و اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ اب اسی ادارے نے "خلاصہ قرآن" شائع کیا ہے جو ایک منفرد علمی کاوش ہے اور بہت ثواب کا کام بھی! اس کتاب سے خصوصاً طلبہ و طالبات اور گھریلو خواتین کما حقہ انداز میں مستفید ہو سکتی ہیں۔ ایک خوبی یہ کہ کتاب فرقہ واریت کا کوئی رنگ نہیں رکھتی۔ یہ کتاب غیر مسلم حضرات ادارے سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ پیش کش اور طباعت عمدہ ہے۔

◆◆◆

بلاعنوان

ڈاکٹر نقاد اختر نے تجزیاتی رپورٹ میز پر رکھی۔ آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے ہماری جانب سے غور سے دیکھا۔ ہم ہمہ تن گوش پورے دھیان سے ڈاکٹر جی کی جانب متوجہ تھے۔

"مبارک ہو بزمی صاحب" رپورٹ پازیٹو ہے۔

خوشی کی قلقاریاں ہمارے لبوں سے پھوٹنے کو مچل رہی تھیں۔ یہی تو ہم سننا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے انکسارانہ رویہ اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ آپ کے خون میں لکھنے کے جراثیم موجود تو ہیں مگر...." ڈاکٹر نقاد اختر نے مگر کے بعد ہنکارا بھرا۔

"مگر کیا ڈاکٹر صاحب؟" صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔

"مگر یہ کہ یہی جراثیم بے حد کمزور ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں فکری نشوونما نہیں ملی۔ ویسے بھی اب کافی دیر ہو چکی۔" ڈاکٹر نقاد نے ہمارے کھچڑی بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نقاد اختر کے الفاظ تھے یا شرارے۔ مزید کچھ سننے کی تاب ہم میں نہ تھی۔

"خدارا کچھ کیجیے ڈاکٹر صاحب۔ ہمارا خواب بکھرنے سے بچا لیجیے۔ ہم تو دنیا کے صف اوّل کے قلمکاروں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے تھے مگر یہ کیا ہو گیا ہائے قسمت!" ہم نے التجا کی۔

"آپ کو کم معیار پر سمجھوتا کرنا ہوگا بزمی صاحب۔ بہرحال مایوسی کفر ہے۔ نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ باقاعدگی سے استعمال کریں۔ ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔ چار عدد اخباری کالم ناشتے سے پہلے، دوپہر کھانے کے بعد کوئی بھی تاریخی یا رومانی ناول کے آپ موڈ پر منحصر ہے۔ رات سونے سے پہلے ایک عدد جاسوسی ناول، تینوں اوقات کے درمیان ادبی لطائف استعمال کیجیے۔ اگلے نسخے میں شاعری کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے اور ہاں تنقیدی خطوط کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔" ہم نے مقدس اوراق کی طرح نسخہ آنکھوں سے لگایا، ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور کلینک برائے بہبود ادبا سے باہر نکل آئے۔ (عشرت جہاں)

چمنِ خیال



قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

طب وصحت نمبر

شمارہ جولائی کے طب وصحت نمبر ''اپنڈکس'' پر مضمون پڑھا۔ میری رائے میں یہ مبنی بر حقیقت تھا۔ اس مرض میں بہترین نتائج کے لیے فوری آپریشن کرنا بہترین حکمت عملی ہے۔ جو علاج آپ نے تجویز کیے، وہ گراں قدر ہیں۔

(کرنل (ڈاکٹر) اکرام اللہ خان، میانوالی)

☆☆

''طب وصحت نمبر'' نظروں سے گزرا۔ اسے ''بیماریوں کا انسائیکلوپیڈیا'' کہنا چاہیے۔ میں اس کی لوہے سے جلد بندی کراؤں گا تاکہ یہ عرصہ دراز تک ہمارے کام آتا رہے۔

(جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

☆☆

''طب وصحت نمبر'' میں صرف بیماریوں پہ مواد دیا گیا ہے۔ اس میں عمومی صحت سے متعلق طبی تحریریں بھی آجاتیں، تو زیادہ اچھا رہتا۔

(عالیہ فاطمہ، لاہور)

☆☆

میں طب وصحت نمبر کے ذریعے کئی ایسے طبی حقائق سے واقف ہوا، جو میرے علم میں نہیں تھے۔ مثلاً یہ کہ انسان آرام کیے بغیر مسلسل کام کرے، تو آخرکار وہ ہرنیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس مرض میں آرام کرنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ بگڑ جاتا ہے۔

(محمد نظیر، پنڈدادن خان)

☆☆

''طب وصحت نمبر'' کے بارے میں ملے جلے تبصرے موصول ہوئے۔ بعض بزرگوں نے سراہا، تو تنقید بھی فرمائی۔

مثال کے طور پر ممتاز صحافی و قلم کار، جناب مجیب الرحمٰن شامی نے فرمایا کہ نمبر میں ایلوپیتھک ادویہ کا ذکر موجود نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ اب ہر مرض کی علامتوں سے مخصوص ایک دو نہیں کئی ادویہ ایجاد ہو چکیں۔ یہ چلن اچھا ہے یا برا، اس سے قطع نظر مریض کا ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔ وہ طبی معائنے سے علامات کی تشخیص کر کے ادویہ دیتا ہے۔ لہٰذا طب و صحت نمبر میں تشخیص کے بغیر کسی بھی بیماری کی ایلوپیتھک ادویہ تجویز کرنا شاید مناسب نہ ہوتا۔

"طب و صحت نمبر" دراصل یہ حقیقت سامنے رکھ کر تیار کیا گیا کہ پاکستان میں لاکھوں لوگ مالی، معاشرتی یا مذہبی وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر کے پاس جا نہیں پاتے یا جانے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر کوئی بدنصیب کسی موذی بیماری کا شکار ہو جائے، تو علاج کی جانکاری نہ ہونے کے سبب جلد یا بدیر اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

"طب و صحت نمبر" کی بدولت اب لاکھوں پاکستانی عام پائی جانے والی بیماریوں کی بنیادی معلومات سے ضرور آگاہ ہو رہے ہیں۔ ان معلومات کی مدد سے وہ اب بیماری کی بابت جان کر بروقت اپنا بچاؤ کر سکیں گے۔ یہی نہیں، امراض سے نمٹنے کی خاطر انھیں گھریلو تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ مگر یہ تدابیر علاج نہیں جیسا کہ ہمارے محترم کرنل ڈاکٹر اکرام اللہ خان کو غلط فہمی ہوئی۔

ہم نے تو تقریباً ہر مضمون میں عرض کیا ہے کہ علاج کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔ البتہ بشری تقاضے کے باعث ہم سے چوک بھی ہو گئی۔ مثلاً آنکھوں کی بیماریوں والی تحریروں میں ایسے ٹوٹکے بیان ہو گئے جن میں دوا آنکھوں میں ڈالی جاتی ہے۔ قارئین سے التماس ہے، مستند ڈاکٹر یا حکیم سے ہمیں مشورہ کرنے کے بعد ہی حساس نوعیت کے گھریلو ٹوٹکے استعمال کیجیے۔

حقیقت یہ ہے کہ طب و صحت اتنا وسیع و بلیغ موضوع ہے کہ اردو ڈائجسٹ کے محدود صفحات اس کی وسعت کے متحمل نہ ہو پاتے۔ اسی لیے سعی ہوئی کہ قارئین تک تمام عام بیماریوں سے متعلق موٹی موٹی باتیں ضرور پہنچ جائیں تاکہ وہ اپنی اور اپنے پیاروں کی بیش قیمت زندگیاں خطرے میں ڈالنے سے بچا سکیں۔

مزید برآں طب و صحت میں آئے دن نت نئی تحقیق سامنے آتی رہتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں فن لینڈ کے ماہرین طب نے ایسی اینٹی بائیوٹک ادویہ دریافت کی ہیں جن کے ذریعے اپنڈکس کا علاج کرنا ممکن ہو چکا۔ گویا اب بہت سے مریض آپریشن کرانے کی زحمت سے بچ سکیں گے۔ امید ہے، یہ جدید تحقیق جناب کرنل ڈاکٹر اکرام اللہ خان کی نظر سے بھی گزری ہو گی۔

قارئین کی صحت و تندرستی اور بھلا چاہنا ہمیشہ سے اردو ڈائجسٹ کا مطمح نظر رہا ہے۔ ہماری سعی ہوتی ہے کہ ٹھوس و مستند معلومات پر مبنی طبی تحریریں طبع کی جائیں۔ "طب و صحت نمبر" شائع کرنے کے بعد ہمارے اس عزم کو مہمیز ملی ہے۔

(ادارہ اردو ڈائجسٹ)

کالا باغ ڈیم

یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ کالا باغ ڈیم جیسے عظیم منصوبے کو سیاسی طور پر متنازع بنا دیا گیا۔ ایک طرف بھارت نئے ڈیم بنا رہا ہے، دوسری طرف ہم سیاسی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حکومت اور حزب اختلاف کچھ تو ہوش کرے اور ڈیم بنا کر پاکستان کا مستقبل محفوظ کرے۔

(رابعہ صلاح الدین، واہ کینٹ)

معاشرے کی اصلاح

ہمارا معاشرہ بہت بگڑ چکا۔ اسی لیے اخلاقی موضوعات پر زیادہ تحریریں شائع کیجیے۔ شکاریات کی کہانیاں بھی دیجیے۔ کاروانِ علم فاؤنڈیشن کی امداد کے لیے رقم جلد روانہ کروں گا۔

(عبدالصمد عبدل، کراچی) ◆◆◆

ایک معلوماتی سلسلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ جولائی میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) مدائن صالح (ب) ناقۃ اللہ، سورۃ الشمس

اسلامی کوئز ۲۔ (الف) مسجد شجرہ (ب) سورۃ التوبہ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ محبوب اقبال (نیہ والا) 2۔ محمد سلیم (پشاور) 3۔ عائشہ رمضان (عارف والا) 4۔ اخجر عباس (مظفر گڑھ)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

طٰہٰ تبسین (حیدرآباد)، منور سعید خانزادہ (سکرنڈ)، ابن تبسین (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، حافظ سعداللہ (ہری پور)، زرین احمد (حیدرآباد)، اشرف علی (سیالکوٹ)، طوبیٰ احمد (پشاور)، نورین اکرم (جہلم)، تحریم رمضان (عارف والا)، عائشہ رمضان (عارف والا)، نورینہ نظیر (دیپالپور)، حسنین بشیر (پشاور)، احسن کمال (واہ کینٹ)، اطیب جان (واہ کینٹ)، ایمن فاروقی (واہ کینٹ)، ازغفر وقاص (راولپنڈی)، اصدق امین (واہ کینٹ)، فاطمہ سعد (واہ کینٹ)، محمد شفیق (خانیوال)، فراز سلیم (شیخوپورہ)، نذیر بینظیر (بورے والا)، عبدالواحد (بورے والا)، خشال فاطمہ (بورے والا)، رمشا اسلم (دیپالپور)، عبیدالاحد (دیپالپور)، عرفان حیدر (مظفر گڑھ)، خضر عباس (مظفر گڑھ)، اخجر عباس (مظفر گڑھ)، نازیہ (ملتان)، شازیہ (ملتان)، اوجبین (علی پور)، محبوب اقبال (نیہ والا)، محمد سلیم (پشاور)

اسلامی کوئز ۱

قبا میں جمعہ کا دن تھا۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو جمع ہونے کا حکم دیا اور کوچ کا ارادہ فرمایا۔ جب یہ قافلہ بنی سالم بن عوف کے محلہ میں پہنچا تو نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ قافلہ رک گیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو ایک وادی میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ امام الانبیاء کی امامت میں جمعہ کی نماز وادی کی اسی مسجد میں ادا کی گئی۔

(الف) اس وادی کا نام بتایئے جس میں صحابہ کرامؓ کو جمع ہونے کا حکم تھا۔

(ب) اس مسجد کو کیا کہتے ہیں جس میں نماز ادا کی گئی؟

اسلامی کوئز ۲

مسجد نبوی کے شمال مغرب میں ۵۲۰ میٹر کے فاصلے پر یہ مسجد واقع ہے۔ نویں صدی ہجری میں یہ مسجد اس میدان میں بنائی گئی جہاں آنحضور ﷺ کے زمانے میں گھڑسواری کی تربیت ہوتی تھی۔ اس مسجد کی موجودہ عمارت چند عرصہ قبل خادم حرمین شریفین نے تعمیر کی۔

(الف) اس مسجد کا کیا نام ہے؟

(ب) کس خادم حرمین شریفین نے اس کی موجودہ تعمیر کرائی؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا۔

(مدیر اُردو ڈائجسٹ لاہور)

